اردو تفسیری ادب میں اخلاقی احکام

(بیان القرآن، معارف القرآن، تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کا اختصاصی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ

مقالہ نگار:

ارشد عزیز

متعلم ایم فل علوم اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:PIS07151007

سیشن : 2015-2017

نگران مقالہ:

ڈاکٹر حافظ محمد حسین

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ

یونیورسٹی آف لاہور

سرگودھا کیمپس

شعبہ علوم اسلامیہ یونیورسٹی آف لاہور

(سرگودھا کیمپس)

FINAL APPROVAL

This thesis titled

اردو تفسیری ادب میں اخلاقی احکام

(بیان القرآن، معارف القرآن، تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کا اختصاصی مطالعہ)

Written by

ARSHAD AZIZ

Student of MPhil Islamic studies

Registration No:PIS07151007

Session:2015-2017

has been approved for the University Of Lahore (Sargodha Campus)

External Examinar ______________________________

Supervisor /HOD ______________________________

Dr.Hafiz Muhammad Hussain

Assistant Professor/Head of Islamic studies Department

University of Lahore (Sargodha Campus)

Declaration

I Arshad Aziz ,registration number:PIS07151007 hereby declared that I have produced the work presented in this thesis "Urdu tafseriadab min akhlaqi ahkam " during the sheduled period of study .I also declared that I have not taken any material from any source except referred to whenever due that amount of plagiarism is within acceptable range.If a violation of HEC rules on research has occurred in this thesis ,Ishall be liabale to punishable action under plagiarism of rules of HEC.

.

Date _________________________ Signature of Candidate

Arshad Aziz

PIS07151007

Certificate

It is certified that Arshad Aziz (PIS07151007)has carried out all the work related to this thesis title (Urdu tafseri adab min akhlaqi ahkam)under my supervision at department of Islamic studies,University of lahore (Sargodha Campus)and the work fulfill this requirement for the award of Mphil degree.

Date ______________________

____

Dr.Hafiz Muhammad Hussain

Assistant Professor/Head of Islamic studies Department

University of Lahore (Sargodha Campus)

اظہا ر تشکر

ا۔سب سے پہلے میں اپنے رب کریم اللہ تبارک وتعالی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنے دین کا کچھ علم عطا کیا اور اپنی بارگاہ میں تحقیقی مقالہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

۲۔میں اپنے استاد محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب (سابق چیئر مین شعبہ علوم اسلامیہ،سابق ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی) کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں میری مدد کی اور مختلف موضوعات پر رہنمائی فرمائی۔

۳۔میں اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر مفتی محمد حسین صاحب اور استاد محترم جناب رانا محمد ادریس صاحب کا موضوع کے انتخاب ،خاکہ تحقیق کی اصلاح اور تحدید اور تحقیقی کام کی نگرانی اور اصلاح پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

انتساب

میں اپنی اس تحقیقی کاوش کو

اخلاق کے عظیم درجہ پر فائز اپنے پیارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے نام منسوب کرتا ہوں جن کے اعلی اخلاق کی گواہی اللہ کی کتاب نے دی ہے

اور

اپنے والد گرامی پروفیسر ڈاکٹر مولانا غلام حیدر رحمت اللہ علیہ کے نام منسوب کرتا ہوں جنہوں نے مجھے علوم اسلامیہ اور اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تعلیم دی۔

تمہید

اللہ تعالی نے انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا اور ان کی ہدایت کا انتظام الہامی کتابوں کو نازل کر کے اور اپنے انبیاء کو بھیج کر کیا ۔اللہ تعالی خود اعلی اخلاق اوصاف کے مالک ہیں ۔اللہ تعالی کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء اخلاق لحاظ سے مثالی انسان تھے ۔تمام انبیاء نے حسن اخلاق کی تعلیم دی ۔اخلاقیات کا دیگر علوم کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے ۔فلاسفہ یونان اور دیگر غیر الہامی مذاہب کی بنیاد رکھنے والوں نے اخلاق کا تصور پیش کیا ہے ۔لیکن ان کا پیش کیا گیا تصور اخلاق نامکمل ہے ۔اسلام نے ان کے برعکس اخلاق کا جامع اور مکمل تصور پیش کیا ہے ۔

قرآن مجید نے انسانوں کو اچھے اخلاق اختیار کرنے اور برے اخلاق سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے اور امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو اخلاق کے بلند درجہ پر فائز قرار دے کر ان کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے ۔قرآن مجید کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ اخلاق کی تعلیم پر مشتمل ہے ۔اللہ تعالی نے انسانوں کو عدل ،احسان ،معاف کرنے ،سچ بولنے اور شکر کرنے جیسے اچھے اخلاق کو اختیار کرنے اور انہیں معاشرے میں فروغ دینے کا حکم دیا ہے جبکہ برے اخلاق کو ترک کرنے اور انسانی معاشرے سے ان کے خاتمے کے لیے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے ۔

عربی زبان کے بعد اردو زبان میں سب سے زیادہ قرآن مجید کی تفاسیر لکھی جا چکی ہیں ۔اردو تفسیری ادب بہت وسیع ہے جو کئی عربی تفاسیر ،احادیث مبارکہ ،اقوال صحابہ و تابعین ،ربط آیات اور بعض تفسیری تفردات پر محیط ہے ۔اس طرح اردو کا تفسیری ادب تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کا حسین امتزاج ہے ۔کئی تفاسیر نامکمل بھی ہیں ۔بعض تفاسیر ایسی بھی ہیں جو لکھی گئیں لیکن مکمل طور پر شائع نہ ہو سکیں ۔کئی تفاسیر تفسیر بالرائے المذموم کی نمائندہ بھی ہیں ۔

اردو تفاسیر میں اخلاق ،تصوف اور اخلاقی احکام کے لحاظ سے جن تفاسیر کو نمایاں مقام حاصل ہوا ان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''بیان القرآن''،مولانا ادریس کاندھلویؒ کی ''معارف القرآن''،مولانا مودودی کی ''تفہیم القرآن'' اور مولانا امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' خاص طور پر شامل ہیں ۔اس مقالہ میں ان تفاسیر کے علاوہ مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر ''معارف القرآن'' سے بھی کافی استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ احکام کی توضیح کے حوالے سے یہ تفسیر انتہائی اہم ہے ۔

یہاں اردو تفاسیر سے اخلاقی احکام کی تشریح کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں ۔

عدل کے اصل اور لغوی معنی برابری کے ہیں اسی کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے ۔

فحشاء کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے ۔جھوٹ :حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ جھوٹ میں داخل ہے خواہ وہ عقائد فاسدہ ،معاملات اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔کسی معصیت یا بے موقع خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔

اسلامی عقائد خاص کر عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت انسانی اخلاق کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔مسلمان کو اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنے ،آخرت میں جوابدہی کے احساس اور ایمان اور عمل صالح کے ذریعے جنت کو حاصل کرنے کے ذریعے اچھے اخلاق اختیار کرنے کی ترغیب دلائی جاتی ہے ۔

اس وقت ہمارا معاشرہ اخلاقیات کی اتنی وسیع اور جامع تعلیم کے باوجود مغربی تہذیب کے زیر اثر اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو رہا ہے ۔اس تحقیق کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی اخلاقی تعلیمات یاد دلانا اور ان پر عمل کر کے اپنے اعمال و اخلاق کو سنوارنا مقصود ہے ۔

مقدمہ

(Preface)

ا۔تعارف موضوع:(Topic Introduction)

اخلاق لفظ ''خلق'' کی جمع ہے۔خلق کے لفظی معنی فطرت، عادت، طبیعت یا مزاج کے آتے ہیں۔اخلاق کا اطلاق ان ہی عادات واعمال پر ہوتا ہے جو پختہ ہوں اور جن کا صدور بلاتکلف ہو۔عام طور پر انسان کے مجموعہ اعمال اور مجموعی رویے کو یا ان تعلیمات کو جو باہم بندوں کے حقوق وفرائض سے متعلق ہوں اخلاق کہا جاتا ہے۔اخلاق کی دو اقسام ہیں۔اخلاق حسنہ اور اخلاق رذیلہ۔اخلاق کی طرح اخلاقی احکام کی بھی دو اقسام ہیں۔

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اچھے اخلاق (مثلاً کسب حلال، عدل، احسان، قریبی رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرنے، وعدہ پورا کرنے، صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے وغیرہ) کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔بعض مقامات پر ان اوصاف کو اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اخلاق رذیلہ سے اجتناب کرنے کا حکم فرمایا ہے مثلاً خیانت سے منع کیا گیا ہے، جھوٹے پر لعنت کی گئی ہے، بے حیائی، برائی اور سرکشی، غیبت، بے ہودہ مذاق، بدگمانی وغیرہ سے روکا گیا ہے۔نیز ان عادات کو اختیار کرنے والا محبت الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک مقام پر اخلاقی احکام سے متعلق جامع تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۹۰)

بے شک اللہ عدل واحسان اور قریبی رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے اور ناشائستہ کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم دھیان کرو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب نے سب سے پہلے اخلاق کا نام لیا اور تمام مذاہب میں اخلاق سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے تمام پیغمبر اخلاقی لحاظ سے مثالی انسان تھے۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے:

آج دنیا میں جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہیں انبیا ورسل کی تعلیمات کا پرتو اور انہیں کے صحائف اخلاق کا کوئی نہ کوئی ورق ہے۔(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲/ ۲۱۴)

مذہب کے بعد فلاسفہ یونان نے اخلاق کا نظریہ پیش کیا۔افلاطون نے ''نظریہ اخلاق'' پیش کیا۔ارسطو نے اپنی کتاب ''علم الاخلاق'' تصنیف کی۔اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کو باضابطہ الگ علوم کی حیثیت سے متعارف کرایا۔اس کے بعد رواقیت اور ایبقوریت بھی اخلاقیات کے علمبردار رہے۔اس طرح اخلاق یونانی اور اسلامی فلسفے کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔

قرآن مجید نے گواہی دی ہے کہ امام الانبیاء حضرت محمدؐ اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡم (القلم۶۸:۴)

اور بے شک آپؐ بہت بڑے اخلاق پر ہیں۔

آپؐ کی بعثت کا مقصد اعلی اخلاق کی تکمیل تھا۔حضورؐ نے فرمایا

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسۡنَ الۡاَخۡلَاقِ (موطا لامام مالك)

بے شک مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے

آپؐ کی حیات طیبہ تمام مسلمانوں کے لیے اخلاق کا بہترین عملی نمونہ ہے۔آپؐ کے اخلاق بھی قرآن پاک کی عملی تفسیر تھے۔آپ کے دشمن بھی آپؐ کے اخلاق کے معترف ہیں۔آپؐ نے تمام مسلمانوں کو اچھے اخلاق پیدا کرنے اور برے اخلاق سے بچنے کی تعلیم دی۔آپؐ کی صحبت کے تربیت یافتہ صحابہ بھی ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے مثالی انسان تھے۔غیر مسلم ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے تھے۔لہذا حسن اخلاق نہ صرف نبی کریمؐ کی سیرت اور سنت ہے بلکہ حکم ربی بھی ہے۔قرآن مجید میں جا بجا اس کے متعلق آیات و احکام موجود ہیں۔زیر بحث موضوع ''اردو تفسیری ادب میں اخلاقی احکام'' میں اخلاقی احکام کو تحقیق اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ اردو زبان میں قرآن مجید کی تفاسیر ہیں، جو برصغیر پاک و ہند میں لکھی جا چکی ہیں۔ان میں سے ہر تفسیر علمی اور فکری اعتبار سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔یہ تفاسیر کئی عربی تفاسیر،حدیث اور فقہ وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ کا حاصل ہیں۔مقالہ نگاری کے لیے ان میں سے چار اہم تفاسیر (بیان القرآن،معارف القرآن،تفہیم القرآن،تدبر قرآن) کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۲۔اہمیت موضوع : (Importance Of The Subject)

اسلام کے اخلاقی احکام ہی اسلامی معاشرت کی بنیاد ہیں۔ان احکامات کو بیان کرنے کا مقصد معاشرے کو اخلاقی لحاظ سے اعلی انسان فراہم کرنا ہے۔لہذا ان احکامات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔زیر بحث موضوع میں اخلاق سے متعلق احکام الہی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

عصر حاضر میں اس موضوع کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ خود مسلمانوں نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے انحراف کرنا شروع کر دیا ہے۔آج ہم مسلمان اندرونی طور پر انتشار اور افتراق کا شکار ہیں اور عالمی سطح پر تنہا ہو چکے ہیں۔ہماری بدنامی کا سب سے بڑا سبب ہمارے برے اخلاق ہیں۔اخلاقی تعلیمات قرآن وسنت میں تو موجود ہیں لیکن مسلم معاشروں میں ان کی عملی تصویر نظر نہیں آتی۔تاریخ اسلام گواہ ہے کہ لوگ مسلمانوں کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے لیکن معذرت کے ساتھ آج لوگ مسلمانوں کے اخلاق کی وجہ سے متنفر ہو رہے ہیں اور قبول اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔اس لیے اخلاقیات کے ہر پہلو پر کام کرنے کی ضرورت ہر دور میں ہمیشہ رہے گی۔

جنوری ۲۰۱۶ء کے ماہنامہ خواتین میگزین لاہور میں ایک مضمون بعنوان ''اسلام کتنا عمدہ دین ہے کاش اس کے ماننے والے بھی ویسے ہوتے'' شائع ہوا۔جس میں ہندوستان کی ایک عیسائی عورت کا ذکر ہے جو اسلام کو اس لیے قبول نہیں کرتی تھی کہ اس کے والد کی زمین ایک مسلمان پڑوسی نے غصب کر لی تھی وہ سمجھتی تھی کہ سارے مسلمان فراڈ اور دھوکے باز ہیں۔یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ آج ہمارے بعض مسلمان بھائی اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔(ماہنامہ خواتین میگزین لاہور،ص:۲۲ تا۲۴)

اسی طرح اسلام نے عورتوں کو وراثت کا حق دیا مگر ہمارے اسلامی ملک ''پاکستان'' کے بعض علاقوں میں اس کی جائیداد ہڑپ کرنے کے لیے اس کی قرآن سے شادی کر دی جاتی ہے۔اسلام نے پردے کی تعلیم دی لیکن کئی مسلمان اپنی عورتوں کو پردہ نہیں کراتے۔شادیوں کے

موقع پر ناچ گانے کی محفلیں بپا کی جاتی ہیں، جن میں پیسے کو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور شراب بھی پی جاتی ہے۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے کا رواج عام ہے۔ انصاف نہ ملنے پر کئی لڑکیاں تھانوں کے سامنے خودکشی کر لیتی ہیں۔ تجارت میں دھوکہ دینا معمول بن چکا ہے۔ غرض موجودہ دور میں بے حیائی کا پھیلنا، عدم برداشت، خود غرضی، مفاد پرستی، عدل کا فقدان وغیرہ جیسے مسائل کے حل کے لیے یہ موضوع انتہائی اہم ہے۔

عوام کی اکثریت کی سوچ یہ ہے کہ اخلاق اچھے ہونا اچھا ہے، پسندیدہ ہے اور سنت نبوی ہے اور بد اخلاقی کو محض نا مناسب اور بری عادت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں بعض اچھے اخلاق کو اپنانا فرض اور واجب ہے اور اسی طرح بعض برے اخلاق کو اپنانا حرام ہے مثلاً غیبت اور جھوٹ وغیرہ۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاق کے احکام کو واضح اور ثابت کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس کام کی ضرورت تھی کہ اخلاقی احکام کو تفسیر کی روشنی میں بیان کیا جائے۔

اخلاق چونکہ فلسفہ اور مذہب کا ایک اہم موضوع رہا ہے اس حوالے سے اس کا موازنہ بہت اہم اور مفید ہوگا۔

۳۔ سابقہ کام کا جائزہ: (Literature Review)

سب سے پہلے مذہب کی زبان سے اخلاق کا نام سنا گیا۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو اخلاق کا درس دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تمام کتب میں اخلاق کا درس دیا گیا۔ اس کے بعد یونان وہ خطہ ہے جس نے اس علم کی خدمت کی اور اس کی روح کو فلسفہ کے قالب میں ڈال کر پیش کیا۔ یونان میں اس خدمت کا اولین شرف سوفسطائیوں کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد سقراط نے اس کے مباحث کو وسعت دی اور اس کو چار چاند لگائے یہاں تک کہ ارسطو نے اس کو ایک مہذب و مدون علم بنایا اس کی مشہور و معروف کتاب ''علم الاخلاق'' اس کا بین ثبوت ہے۔ (اخلاق وفلسفہ اخلاق، ص:۹، ۱۰)

کئی مسلمان فلاسفہ نے بھی اخلاق سے متعلق کتابیں تحریر کیں مثلاً ابن قیم کی ''**مدارج السالکین**''، شاہ ولی اللہ کی ''**حجۃ اللہ البالغہ**''، امام راغب کی "**الذریعہ الی مکارم الشرعیہ**"، شیخ ابوالقاسم کا ''**رسالہ قشیریہ**''، ابن مسکویہ کی ''**السعادت**''، ماوردی کی ''**ادب الدنیا**''، ابوالنصر فارابی کی ''**آرائی المدینۃ الفاضلہ**''، ابوعلی ابن سینا کی ''**البر والاثم**''، ابوطالب مکی کی ''**قوت القلوب**'' اور محمد امین کی ''**کتاب الاخلاق**'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جو مقام امام غزالی کی ''**احیاء العلوم**'' کو حاصل ہوا وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آیا۔

فلاسفہ کے علاوہ سیرت نگاروں نے بھی اپنی کتابوں میں نبی کریمؐ کے اخلاق حسنہ پر ایک مستقل باب لکھا یا اپنی کتاب کی ایک مکمل جلد نبی کریم ﷺ کے اخلاق پر تصنیف کی۔ اس طرح اخلاق پر کام ہوا اور اسی طرح مفسرین نے بھی جا بجا اپنی تفاسیر میں اخلاقیات کو واضح کیا ہے۔ متعدد تفاسیر کو سامنے رکھ کر اخلاقی احکام سے متعلق تمام آیات کی تشریح و توضیح مختلف مفسرین کی آرا سے کی جائے اور ان سے علمی اور فکری رہنمائی حاصل کی جائے۔ مختلف تفسیری آرا کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور بیک وقت مختلف تفاسیر کے مطالعہ کا موقع فراہم کرنا، قارئین کے لیے سہولت اور انداز تحقیق میں جدت کا پہلو رکھتا ہے۔ ایسا تحقیقی کام نہ ہی ایم فل کی سطح پر ہوا ہے اور نہ ہی قرآن کے اخلاقی احکام کی تفسیر سے متعلق کوئی باقاعدہ یا الگ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔ لہٰذا اس نہج پر کام کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

۴۔اسلوب تحقیق:(Research Methodology)

تحقیق کے لیے منتخب موضوع چونکہ اردو تفاسیر سے متعلق ہے اس لیے اخلاقی احکام کی توضیح کے لیے اردو تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اخلاقی احکام کی تشریح اردو مفسرین کی آرا کی روشنی میں کی جائے گی۔اخلاقی احکام کی تفسیر میں بنیادی طور پر مولانا اشرف علی تھانوی ،سید ابوالاعلی مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیری فکر سے کی جائے گی۔بعض مقامات پر مفسرین کی آرا کی تلخیص کر کے اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔تفسیر وہی اختیار کی جائے گی جو سادہ اور عام فہم ہو لیکن بعض مقامات پر اردو کے پرانے اور مشکل الفاظ کو آسان اور ترجمے کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔کئی آیات جن کا مفسرین نے حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا ان کو با حوالہ نقل کیا جائے گا ۔تفسیری آراء کا مطالعہ کرنے کے بعد عمدہ اور دل پسند آرا کو اختیار کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تفاسیر کے علاوہ احادیث ،سیرت النبی ﷺ اور اخلاقیات کی کتابوں سے مقالہ کو مزین کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔اس تحقیق کے لیے انٹرنیٹ اور مختلف علمی سافٹ ویئرز سے استفادہ کیا جائے گا۔تحقیقی کام کے لیے پاکستان کے مختلف سرکاری و نجی کتب خانوں ،یونیورسٹیوں کے کتب خانوں اور تحقیقی رسائل وجرائد سے استفادہ کیا جائے گا۔

۵۔نتائج تحقیق: (Results Of Research)

عصر حاضر میں اسلام کے اخلاقی نظام کی امتیازی حیثیت کو ثابت کرنا ہے۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر	نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
باب اول	**اخلاق، اخلاقی احکام، اردو تفسیری ادب کا تعارف**	16	۵	اسلامی اخلاق میں رہبانیت نہیں ہے	55
فصل اول	**اخلاق کا تعارف**	16	۶	توسط و اعتدال	57
1	اخلاق کا لغوی مفہوم	16	۷	اخلاق کی مکمل تعلیم	58
2	اخلاق کا اصطلاحی مفہوم	19	۸	وسعت و جامعیت	59
3	علم الاخلاق، تعریف و موضوع	23	۹	اسلام میں اخلاق حسنہ کی فضیلت و اہمیت	59
۱	اخلاقیات اور مذہب	24	2	اسلام کا فلسفہ احکام	64
۲	مذہب سائنس اور علم الاخلاق	25	۱	اخلاقی احکام	66
۳	اخلاقیات اور تصوف	25	۲	اخلاق حسنہ سے متعلق فہرست قرآنی احکام	68
۴	اخلاقیات اور علم نفسیات	25	۳	اخلاق رذیلہ سے متعلق فہرست قرآنی احکام	69
۵	اخلاقیات اور سوشیالوجی	26	۴	اسلام میں اخلاقی احکام کے اجزا	69
۶	اخلاقیات اور مابعد الطبیعات	26	3	اخلاق نبویؐ کا تعارف	71
4	اخلاق کی اقسام	27	۱	صاحب خلق عظیم	71
۱	حسن اخلاق	28	۲	اخلاق کا عملی اور بہترین نمونہ	74
۲	رذائل اخلاق	31	۳	قرآن مجید میں آپؐ کے اخلاقی اوصاف	76
5	انسانی زندگی میں اخلاق کی ضرورت و اہمیت	35	فصل سوم	**اردو تفسیری ادب کا تعارف و تقابل**	83
فصل دوم	**اسلام کے اخلاقی احکام کا تعارف**	43	1	اردو تفسیری ادب کا مختصر تقابل	89
1	اسلام کا تصور اخلاق	43	فصل چہارم	**منتخب اردو تفاسیر کا تعارف**	91
۱	رضائے الٰہی کا حصول	44	۱	تفسیر بیان القرآن	91
۲	نیت (عمل کی بنیاد)	45	۲	تفسیر معارف القرآن	94
۳	قوت نافذہ	47	۳	تفسیر تفہیم القرآن	97
۴	خیر و شر	47	۴	تفسیر تدبر قرآن	101

باب دوم	منتخب اردو تفاسیر سے اخلاقی احکام کی توضیح وتشریح	110
فصل اول	اخلاق حسنہ سے متعلق احکام کی تشریح	110
۱	صدق	110
۲	صبر	114
۳	ایفائے عہد	120
۴	عدل	123
۵	احسان	130
۶	عفو	132
۷	شکر	136
۸	براور تقوی میں تعاون	139
۹	غض بصر	144
۱۰	حفاظت فروج	149
۱۱	خوش کلامی	151
۱۲	صلہ رحمی	154
۱۳	انفاق فی سبیل اللہ	158
۱۴	امانت داری	164
فصل دوم	رذائل اخلاق سے متعلق احکام کی تشریح	168
۱	فحشاء	169
۲	جھوٹ	173
۳	فضول خرچی کی ممانعت	176
۴	بخل	179
۵	قتل اولاد	186
۶	قتل ناحق	188
۷	غیبت	192
۸	بدگمانی	195
۹	عیب جوئی	197
۱۰	ناپ تول میں کمی	202
۱۱	جھوٹی قسمیں کھانا	205
۱۲	عہد شکنی	209
۱۳	بہتان	214
۱۴	فحش گوئی	224
باب سوم	منتخب اردو تفاسیر سے اصلاح اخلاق کی ترغیبات ومحرکات	232
فصل اول	اصلاح اخلاق کی ترغیبات	233
۱	رضائے الٰہی	233
۲	جنت کا حصول	237
۳	احساس مسئولیت	245
فصل دوم	اصلاح اخلاق کے محرکات	249
1	عقائد اسلامی بطور محرک اخلاق	249
۱	عقیدہ توحید بطور محرک اخلاق	250
۲	ایمان بالملائکہ کا اخلاقی پہلو	253
۳	عقیدہ آخرت کا اخلاقی پہلو	254
2	عبادات بطور محرک اخلاق	257
۱	عبادت کا مفہوم	257
۲	نماز بطور محرک اخلاق	257
۳	زکوۃ بطور محرک اخلاق	261
۴	روزہ بطور محرک اخلاق	266
3	مکافات عملی کا تصور	270
4	خوف خدا	275
باب چہارم	رذائل اخلاق کا سد باب	277

فصل اول	رذائل اخلاق کے محرکات کا سد باب	278	فصل سوم	اخلاق سوزی کی مغربی تحریکات کا تدارک	293
۱	نفس امارہ	278		خلاصہ بحث	300
۲	شیطانی ترغیبات	280		سفارشات	302
۳	خواہشات نفس	284		فہرست آیات	304
۴	نفاق	286		فہرست احادیث	308
۵	عقیدہ آخرت کا انکار	287		مصادر و مراجع	310
فصل دوم	موجودہ اخلاقی فساد کی اصلاح	**289**			

باب اول:

اخلاق اخلاقی احکام اور اردو تفسیری ادب کا تعارف

فصل اول:

اخلاق کا تعارف

1۔ اخلاق کا لغوی مفہوم:

اخلاق کا لفظ خلق کی جمع ہے۔ خلق کے لفظی معنی لغت میں درج ذیل بیان کیے گئے ہیں۔

(ا) السید محمد مرتضی الحسینی الزبیدی نے مشہور زمانہ عربی لغت ''**تاج العروس من جواهر القاموس**'' میں خلق کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والخلق بالضم وبضمتين السجية وهو ما خلق عليه من الطبع و منه حديث عائشه رضى الله عنها "كان خلقه القرآن"۔اى كان متمسكا به وبآدابه واوامره و نواهيه وما يشتمل عليه من المكارم والمحاسن والطاف وقال ابن الاعرابى : الخلق :المروءة والخلق (الدين)وفى التنزيل وانك لعلى خلق عظيم۔ والجمع اخلاق لا يكسر على غير ذلك وفى الحديث ليس شئى فى الميزان اثقل من حسن خلق وحقيقته انه لصورة الانسان الباطنة هى نفسه واوصافها و معانيهاالمختصة بها بمنزلة الخلق لصورته الظاهرة واوصافها ومعانيها ولها اوصاف حسنة و قبيحة والثواب والعقاب يتعلقان باوصاف الصورة الباطنة اكثر مما يتعلقان باوصاف الصورة الظاهرة ولهذا تكررت الاحاديث فى مدح حسن الخلق فى غير موضع كقوله اكمل المومنين ايمانا احسنهم خلقا وقوله ان العبد ليدرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم وقوله بعثت لاتمم مكارم الاخلاق وكذلك جاء ت فى ذم سوء الخلق ايضا احاديث كثيرة ۔(ا)

اور خلق ایک پیش یا دو پیشوں کے ساتھ عادت کے ہیں یا اس طبیعت کو کہتے ہیں جس پر پیدا کیا گیا اور اس سے متعلق حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ نبی اکرمؐ کے اخلاق قرآن تھے، یعنی آپؐ قرآن کے آداب، اس کے اوامر اور اس کے نواھی پر عمل کرنے والے تھے اور جو اس کی خوبیوں، خوبصورتیوں اور بھلائیوں پر مشتمل ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا خلق کے معنی مردانگی کے ہیں اور خلق کے معنی دین کے ہیں اور قرآن مجید میں ہے اور بے شک آپؐ بلند اخلاق پر ہیں۔

(ا) السید محمد مرتضی الحسینی الزبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس (کویت: مطبعۃ حکومت الکویت وزارۃ الاعلام، ۱۴۰۹ھ، ۱۹۸۹ء) ج:۲۵۔ص:۲۵۸

اور جمع اخلاق آتی ہے اور اس کے سوا اس کی جمع مکسر نہیں آتی اور حدیث یں ہے کوئی چیز ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری نہیں ہوگی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان کی باطنی شکل ہے وہ نفس ہے اور اس کی خوبیاں اور اس کے مختص اسباب اس کے ساتھ یہ خلق کی طرح ہے جو ظاہری صورت ،اس کے اوصاف اور اس کے معانی لیے ہے اور اس کے لیے خوبیاں ہیں یہ خوبیاں اچھی اور بری ہوتی ہیں اور جزاوسزا دونوں ظاہری صورت کی خوبیوں کی نسبت باطنی صورت کی خوبیوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک سے زیادہ جگہ میں بار بار اچھے آداب کی تعریف میں احادیث آئی ہیں۔ جیسے آپؐ کا ارشاد ہے مومنوں میں سے کامل ایمان والا وہ ہے جو ان میں سے اخلاق کے لحاظ سے اچھا ہے اور آپؐ کا ارشاد بے شک بندہ اچھے اخلاق سے روزہ دار اور رات کو نماز پڑھنے والے کا درجہ پا لیتا ہے اور آپؐ کا فرمان ہے کہ مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے اور اسی طرح برے اخلاق کی مذمت میں بھی بہت سی احادیث آئی ہیں۔

(۲) علامہ جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور ''خلق'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والخلق الخليقة اعنى الطبيعة وفى التنزيل وانك لعلى خلق عظيم والجمع اخلاق لا يكسر علـى غير ذلك والخلق والخلق ـالسجية يقال خالص المومن و خالق الفاجر وفى الحديث ليس شىء فى الميزان اثقل من حسن الخلق
الخلق.بضم اللام و سكونها وهو الدين والطبع والسجية وحقيقة انه لصورة الانسان الباطنة وهى نفسه واوصافها و معانيها ولهما اوصاف حسنة و قبيحة والثواب والعقاب يتعلقان باوصاف الصورة الباطنة اكثر مما يتعلقان باوصاف الصورة الظاهرة"(۲)

خلق جانور میری مراد فطرت کے ہیں اور قرآن مجید میں ہے ''بے شک آپ اعلی اخلاق پر ہیں اور اس کی جمع اخلاق آتی ہے اس کے سوا اس کی جمع نہیں آتی الخلق اور الخلق کے معنی غصہ کے ہیں کہا جاتا ہے مومن مخلص اور بے دین کا پیدا کرنے والا اور حدیث میں ہے ترازو میں اچھے اخلاق سے زیادہ کوئی چیز بھاری نہیں ہوگی۔
الخلق لام کی پیش اور اس کے سکون کے ساتھ اور وہ دین اور طبیعت اور غصہ ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان کی باطنی صورت کے لیے ہے اور وہ اس کا نفس اور اس کی خوبیاں اور اس کے معانی جس میں وہ ماہر ہے جس طرح اس کی ظاہری صورت اور اس کے اوصاف اور اس کے معانی جس میں وہ ماہر ہے اور ان دونوں کے لیے اچھے اور برے اوصاف ہیں اور سزا اور جزا دونوں باطنی صورت سے تعلق رکھتے ہیں اکثر ان میں سے جو ظاہری صورت کی خوبیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

(۲)العلامة ابى فضل جمال الدين محمد بن مكرم ابن منظور الافريقى البصرى،لسان العرب(بيروت:دار صادر)ج:۱۰،ص:۸۶،۸۷۔حرف القاف

(۳)مصباح اللغات میں ہے:

الخلق والخلق۔ طبعی خصلت،طبیعت،مروت،عادت۔ج(جمع)اخلاق۔(۳)

(۴)امام راغب لکھتے ہیں:

""خلق اورخلق اصل میں دونوں ایک ہی ہیں جیسے **شرب وشرب وصرم** اور **صرم** مگران میں اتنافرق ہے کہ خلق بمعنی خلقت یعنی اس شکل وصورت پر بولا جاتا ہے جس کا تعلق ادراک بصر سے ہوتا ہے اورخلق کا لفظ قوی باطنہ اور عادات وخصائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے۔قرآن میں ہے **وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ** (**القلم**،۶۸:۴)اوراخلاق تمہارے بہت عالی ہیں۔الخلاق۔وہ فضیلت جوانسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔""(۴)

(۵)مولوی فیروزالدین نے""خُلُقٌ""کے معنی:

خو،عادت،خصلت،جمع اخلاق،خوش مزاجی بیان کیے ہیں۔(۵)

(۶)قرآن مجید میں لفظ""**خُلُقٌ**""دومرتبہ آیا ہے،ایک مرتبہ سورۃ **الشعراء** میں اوردوسری مرتبہ سورہ **القلم** میں:

(۱)**اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ** (**الشعراء**،۲۶:۱۳۷)

ترجمہ:نہیں ہے مگرعادت اگلے لوگوں کی۔

(۲)**وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ** (**القلم**،۶۸:۴)

ترجمہ:اوربےشک آپ خلق عظیم پر ہیں۔

(۷)انگریزی زبان میں اخلاق کے لیے درج ذیل الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔(۶)

Manners,Disposition,Virtues,Morality,Ethics

(۸)""Ethic""کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

(1)The principles of right and wrong that are accepted by an individual or a social group.

(2)A system of principles governing morality and acceptable conduct.(7)

---

(۳)مولاناعبدالحفیظ بلیاوی،مصباح اللغات(ملتان:مکتبہ امدادیہ،۱۹۵۰ء)**کذا لك فی المنجد**

(۴)امام راغب اصفہانی مترجم مولانامحمدعبدہ،مفردات القرآن(لاہور:اہل حدیث اکادمی،۱۹۷۱)ص:۳۱۸ ذیل مادہ(خ۔ل۔ق)

(۵)الحاج مولوی فیروزالدین،فیروزاللغات اردو(لاہور:فیروزسنز)ص:۵۹۵ ذیل خ۔ل

(۶)کتابستان سٹینڈرڈ ڈکشنری(لاہور:کتابستان پبلشنگ کمپنی،۱۹۹۸)ص:۴۰

WordWebSoftware,see under word Ethic(7)

(۲) اخلاق کا اصطلاحی مفہوم:

حسن ایوب صاحب لکھتے ہیں:

''قدیم فلاسفہ اور جدید علمائے اسلام نے اخلاق کا اصطلاحی مفہوم کو بیان کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ صحیح مفہوم امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں بیان کیا ہے۔ یہ تعریف اسلامی فلسفی ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ کی اس تعریف سے ملتی جلتی ہے جو اس نے اپنی کتاب ''تهذیب الاخلاق وتطهیر الاعراق'' میں بیان کی ہے۔''(۸)

امام غزالیؒ اخلاق کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلق نفس میں پائی جانے والی وہ ہیئت راسخہ ہے جس کی وجہ سے اعمال سہولت اور آسانی سے ادا ہوتے ہیں غور وفکر کی ضرورت نہیں رہتی اگر وہ ہیئت ایسی ہو کہ اس سے وہ افعال صادر ہوں جو عقلی اور شرعی طور پر پسندیدہ ہیں تو اسے خلق حسن کہا جاتا ہے اور اگر اس سے افعال قبیحہ صادر ہوں تو اسے خلق بد کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ گویا خلق نفس کی ہیئت اور اس کی باطنی صورت کا نام ہے۔''(۹)

حسن ایوب صاحب اس تعریف کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''امام غزالی کی اس تعریف میں ''ہیئت'' کا لفظ حالت یا صفت یا طاقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ہیئت جو دل میں راسخ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہیئت دل میں بیٹھ جائے اپنے قدم اچھی طرح جمالے یہاں تک کہ اسے اخلاق کا نام دیا جا سکے۔ اگر کسی شخص سے شجاعت یا سخاوت کی صفت کبھی کبھی صادر ہو جایا کرے تو اسے بہادر اور سخی نہیں کہا جا سکتا نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شجاعت اور سخاوت کی صفت سے متصف ہے، اور آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ'' اس سے افعال کا صدور بغیر سوچے سمجھے ہو'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص سے غور وفکر کے بعد افعال صادر ہوں اور اس کو اختیار کرنے کے نتیجے میں ملنے والے فوائد اور اسے چھوڑ دینے کے نتیجے میں دوچار ہونے والے خسارے پر اس کی نظر جائے تب وہ کسی فعل کو اختیار کرے یا اسے چھوڑے تو اسے اخلاق نہیں کہا جا سکتا مثال کے طور پر کوئی شخص ایسا ہے جسے انفاق کی دعوت دی جائے تو وہ اس کے موافق ومخالف پہلوؤں پر سوچنے لگے اور اسے اندیشہ ہو کہ اگر خرچ نہیں کروں گا تو کوئی فائدہ ہاتھ سے نکل جائے گا یا لوگ میرے اوپر مذمت کریں گے اور میری طرف انگلیاں اٹھیں گی اسی لیے انفاق کرنا بہتر ہے تو ایسے شخص کو سخی نہیں کہا جائے گا۔''(۱۰)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ رقمطراز ہیں:

---

(۸) حسن ایوب، مترجم عبید اللہ فہد فلاحی، اسلام کی بنیادیں (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء) ص:۴۷۷

(۹) محمد بن محمد، ابوحامد، امام غزالی، مترجم مولانا محمد صدیق ہزاروی، احیاء العلوم (لاہور، پروگریسو بکس، ۲۰۰۳ء) ص۱۲۴

(۱۰) حسن ایوب، مترجم عبید اللہ فہد فلاحی، اسلام کی بنیادیں (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء) ص:۴۷۸

''آدمی جن اعمال کا اہتمام سے قصد کرتا ہے اور جو اخلاق کہ اس میں جمے ہوئے ہیں وہ سب نفس ناطقہ کی جڑ سے نکلتے ہیں، پھر اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نفس کے دامن کو چمٹ کر اسے گھیر لیتے ہیں۔۔۔اور اخلاق کا نفس کی طرف عائد ہونا اس طرح پر ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو برابر کرتا رہتا ہے اور اس کو بکثرت کرتا ہے تو اس کا عادی ہو جاتا ہے پھر وہ بآسانی اس کو کر سکتا ہے اور کچھ غور و فکر یا ارادہ کی محنت برداشت کرنے کی ضرورت پیش نہیں ہوتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ نفس اس کام سے متاثر ہو جاتا ہے۔''(۱۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''شارع کے بندوں کو بالذات جن امور کے ساتھ خواہ بطور ایجاب خواہ بطور تحریم کے مکلّف کیا ہے وہ اعمال ہیں اس لیے کہ اعمال ان حالات نفسانیہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا نفع و نقصان آخرت میں نفوس کی جانب عائد ہوتا ہے اور یہ اعمال ان کیفیات نفسانیہ کو بڑھاتے ہیں اور ان کیفیات نفسانیہ کا بیان اور ان کے لیے صورت ہوتے ہیں۔ان اعمال سے دو طرح سے بحث کی جاتی ہے ایک تو اس اعتبار سے کہ عام لوگوں پر ان کا عمل میں لانا لازم ہوتا ہے اور اس اعتبار سے ان اعمال اور ظاہری طریقوں کا اختیار کرنا مقصود ہوتا ہے جن کا ظاہر و باطن متمیز نہیں ہوتا اور ان کیفیات پر یہ اعمال بمنزلہ قرآئن کے ہوتے ہیں اور ان اعمال کا لوگوں سے سب کے سامنے مطالبہ کیا جاتا ہے اور ان کو ان اعمال سے بچنے اور عذر کرنے کا موقع نہیں ہوتا ایسے اعمال کی بناء درمیانی حالت اور امور منضبطہ پر ہوتی ہے۔دوسری قسم ان اعمال سے لوگوں کے نفس کو مہذب کرنا ہے اور جو کیفیت ان اعمال سے مطلوب ہوتی ہے اس تک نفس کا پہنچانا اس اعتبار سے ان کیفیات کا معلوم کرنا اور ان اعمال کا اس طرح پر معلوم کرنا کہ وہ ان کیفیات کی طرف پہنچانے میں مقصود ہوتا ہے اور ان کا منبا وجدان اور مکلفین کے اختیار دے دینے پر ہوتا ہے پہلے اعتبار سے جس علم میں ان اعمال سے بحث کی جاتی ہے وہ علم شرائع ہے اور جس علم میں دوسرے اعتبار سے بحث کی جاتی ہے وہ علم علم الاحسان (اخلاق) ہے۔''(۱۲)

ملا جلال الدین حروانی اخلاق کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب افعال کسی فکر اور تردد کے بغیر نفس سے سرزد ہونے لگیں تو اس کیفیت کو خلق سے تعبیر کرتے ہیں۔''(۱۳)

سید سلیمان ندویؒ اخلاق کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض سے متعلق وہ تعلیمات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا ہر شے سے تھوڑا بہت تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔''(۱۴)۔

---

(۱۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مترجم مولانا عبدالحق حقانی، حجۃ اللہ البالغہ (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۱ء) ص:۵۶

(۱۲) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مترجم مولانا عبدالحق حقانی، حجۃ اللہ البالغہ (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۱ء) ص:۳۹۸

(۱۳) ڈاکٹر محمد طاہر القادری، حسن اخلاق سلوک و تصوف کی تربیت کی عملی ہدایت (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۱۳

(۱۴) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ (لاہو: رالفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۶، ص:۸

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اخلاق کی درج ذیل تعریفات کی ہیں:

(۱)''اخلاق خلق کی جمع ہے اور اصطلاح علوم میں اس ملکہ کو کہ جس کی بدولت نفس سے افعال کا صدور بغیر غور وفکر کے بسہولت ہوتا ہو خلق کہلاتا ہے۔''

(۲)''مسلسل کسی عمل کے وجود پذیر ہوتے رہنے سے ارادہ انسانی اگر کسی عمل کا خوگر ہو جائے اور وہ اس کی عادت بن جائے تو اس عادت بن جانے اور خوگر ہو جانے کا نام خلق ہے۔''

(۳)''انسانی رجحانات میں سے کسی رجحان کا اپنے استمرار اور تسلسل کی وجہ سے غالب آجانا خلق ہے۔''

(۴)''کسی صفت کا عادت یا خو بن کر خلق کہلانا اور حسب اتفاق اعمال کا صدور خلق نہ سمجھا جانا اس حقیقت کو روشن کرتا ہے کہ دراصل خلق ایک نفسیاتی صفت اور کیفیت کا نام ہے اور اس لیے وہ انسان کی ذات سے جدا کوئی شے نہیں البتہ اس نفسیاتی صفت کا ایک خارجی مظہر ضرور پایا جاتا ہے جس کو علم الاخلاق کی اصطلاح میں کردار کہتے ہیں اور یہی کردار کسی خلق کی موجودگی کے لیے دلیل اور مظہر بنتا ہے۔''(۱۵)

ڈاکٹر خالد علوی''اخلاق'' کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''خلق کی جمع اخلاق ہے جو انسان کے مجموعہ اعمال کا نام بھی ہے اور مجموعی رویہ کا بھی۔خلق یا اخلاق کا اطلاق ان ہی عادات واعمال پر ہوگا جو پختہ ہوں اور جن کا صدور بلا تکلف ہو۔وہ اعمال جو کسی انسان سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبہ یا عارضی جوش سے ظاہر ہوتے ہیں وہ کتنے ہی اعلیٰ اور عمدہ کیوں نہ ہوں خلق کہلانے کے مستحق نہیں''۔(۱۶)

احمد جاوید کہتے ہیں:

''طبیعت انسان کی بنیادی ساخت کو کہتے ہیں جس سے اس کا شعور اور پورا مزاج تشکیل پاتا ہے گویا انسان کے سوچنے کا انداز اس کا ردعمل کا مخصوص طریقہ طبیعت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔طبیعت کے میلانات اخلاق کہلاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں طبیعت کا میلان جب واضح اور مستقل ہو جائے تو اسے اخلاق کہتے ہیں۔''

دوسری جگہ تعریف کرتے ہیں:

''طبیعت میں موجود صلاحیتیں جو فکر وعمل کی عکاسی کرتی ہیں انہیں اخلاق کہا جاتا ہے۔''(۱۷)

ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

اصطلاحاً خلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی کی فطرت وطبیعت کا اس طرح لازمی

---

(۱۵)مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوهاروی، اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۰ء)ص:۱۵، ۱۰۵، ۱۰۶

(۱۶)ڈاکٹر خالد علوی، انسان کاملؐ (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۱ء)ص:۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۵

(۱۷)احمد جاوید، مرتب ڈاکٹر محمد امین، ترک رذائل (لاہور، تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، ۲۰۱۲ء)ص:۱۸، ۱۹

جزو بن جائیں کہ زیادہ غور وفکر کے بغیر روزمرہ زندگی میں ان کا ظہور ہوتا ہو(۱۸)

مولانا عبدالغفار حسن عمر پوری صاحب اپنی کتاب ''انتخاب حدیث'' میں اخلاق کی عمدہ تعریف کی ہے:

''اخلاق سے مراد وہ بہترین تصورات، اصول اور اوصاف ہیں جن پر ایک
پاکیزہ انسانی زندگی اور ایک صالح انسانی معاشرے کی بنا قائم ہو''(۱۹)

غرض اخلاق، خلق کی جمع ہے جس کے معنی پختہ عادات کے ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے مجموعہ اعمال اور مجموعی رویہ کا بھی نام ہے۔ جب انسانی اعمال غور وفکر کے بغیر سرانجام دیے جائیں تو اس کیفیت کو خلق کہتے ہیں۔ اخلاق کا تعلق ان تعلیمات سے بھی ہے جو بندوں کے حقوق وفرائض سے متعلق ہیں۔ یہ ان تصورات، اصول اور اوصاف کا نام ہے جن پر ایک پاکیزہ انسانی زندگی اور اچھے معاشرے کی بنیاد ہے۔ انسانی معاشرے میں اخلاق کا مفہوم بہت وسیع ہے اور مختلف مفکرین اور دانشوروں نے اس کی اپنے انداز سے تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

(۱۸) ڈاکٹر محمد طاہر القادری، حسن اخلاق سلوک وتصوف کی تربیت کی عملی ہدایت (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء) ص:۱۳

(۱۹) عتیق طاہر، اسلام کی اخلاقی تعلیمات، الاضواء (لاہور: شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی، جنوری، جون ۲۰۰۱ء) ص:۱۶۷، ۱۶۸

﴿علم الاخلاق﴾

علم الاخلاق کواخلاقیات بھی کہاجاتا ہے۔اس کاتعلق فلسفہ سے ہے۔مفکرین نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔

(۱) انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں ''**ایتھکس**'' کے تحت لکھا ہے:

"Ethics is also called moral philosophy ,the discipline cocerned with what is morally good and bad , right and wrong.The term is also applied to any system or theory of moral values or principles."

''اخلاقیات کواخلاقی فلسفہ بھی کہاجاتا ہے،ایسا مضمون جواس سے تعلق رکھتا ہے کہ کیا اچھااور برا یا کیا صحیح اور غلط ہے۔اس اصطلاح کا اطلاق اخلاقی اقدار یا اصولوں کے کسی بھی نظام یا نظریہ پر ہوتا ہے۔''(۱)

(۲)مشہور فلسفی ''ارسطو'' نے ''علم الاخلاق'' کی تعریف میں لکھا ہے:

''جس علم میں انسانی کردار پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ یہ تمام احکام صواب وخیر ہیں یا خطاوشر اور اس طرح بحث کی جائے کہ یہ تمام احکام صواب وخطا اور خیر وشر کسی مرتب نظام کی شکل میں آجائیں تو اس علم کو علم الاخلاق کہتے ہیں۔''(۲)

(۳) آر۔اے۔پی۔روجرس نے اخلاقیات کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''اخلاقیات وہ علم ہے جوان اصول کو دریافت کرتا ہے جن سے کردار انسانی کے اصلی غایات کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے ان اصول کی اگر تحقیق ہو سکے اور ان کو اس طرح سے صحیح طور پر بیان کیا جا سکے کہ ان سے ضوابط کردار مستنبط ہوں تو یہی اصول اخلاق معیاری ہوں گے۔''(۳)

(۴) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ''علم الاخلاق'' کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر،انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے اس کو بیان،لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس کو واضح کرنے اور مفید وکارآمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے علم الاخلاق کہلاتا ہے۔مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے جو فضائل ورذائل کا علم بخشتا اور انسان کس طرح فضائل سے مزین ہوسکتا اور رذائل سے محفوظ رہ سکتا ہے اس کا علم عطا کرتا ہو اس کو علم اخلاق کہتے ہیں۔''(۴)

---

(۱)www.britanica.com/topic/ethics-philosophy

(۲)مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین،۱۹۵۰ء)ص:۱۶،۱۷

(۳) آر۔اے۔پی۔روجرس،مترجم مولوی احسان احمد،تاریخ اخلاقیات (کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۰۶ء)ص:۹

(۴)مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین،۱۹۵۰ء)ص:۱۶

(۵) جان ڈیوی:

اخلاقیات وہ علم ہے جس میں کردار پر خیر وشر یا صحیح غلط کے نقطہ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کردار پر خیر وشر یا صحیح وغلط کے نقطہ نظر سے جو احکام عاید کیے جاتے ہیں ان کو ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں پیش کرے۔(۵)

(۶) سافٹ ویئر WORD WEB کے مطابق Ethics کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

(1)Motivation based on ideas of right and wrong.

(2)The philosophical study of moral values and rules.

علم الاخلاق کا موضوع:

علم الاخلاق کا موضوع انسان کے ''ارادی اعمال'' ہیں۔جن پر اچھے برے اور جزا وسزا کا اطلاق ہوتا ہے۔
مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

''علم الاخلاق کا موضوع دو قسم کے اعمال ہیں: ایک وہ اعمال جو انسان کے اختیار وارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور عمل کے وقت جن کے متعلق وہ خوب جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے؟ دوسرے وہ اعمال جو عمل کے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادر ہوتے ہیں لیکن اختیار، شعور اور ارادہ کے وقت ان کے متعلق احتیاط برت سکتا ہے۔''(۶)

(ا) اخلاقیات اور مذہب:

یہ مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے کہ مذہب اخلاقیات کا سرچشمہ ہے یا اخلاقیات کی ترقی یافتہ شکل ہے۔کارل مارکس مذہب سے سخت متنفر تھا وہ مذہب کو چالاک انسانوں کی ذہنی پیداوار قرار دیتا ہے۔اس کے نزدیک اخلاقی اصول اضافی ہیں اور عالمی سطح پر اخلاق کسی وجود کا حامل نہیں، نیز یہ کہ اخلاق پر معاشی حالات کا اثر ہوتا ہے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے پہلے مذہب نے اخلاق کا نام لیا۔حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے اخلاقیات کا درس دیا۔مذہب نے انسانی زندگی کو بے حد متاثر کیا ہے۔مذہب نے انسانی میں نظم وضبط اور حسن ترتیب کو پیدا کیا ہے۔مذاہب نے انسانی معاشروں کو سنوارنے اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔مذاہب خیر وشر میں فرق کرتے ہوئے اچھائی کی دعوت دیتے اور برائی سے منع کرتے نظر آتے ہیں۔مذہب کی طرف سے اچھائی اور برائی کو اختیار کرنے میں کوئی زبردستی نہیں کرتے۔مذاہب میں انسانی اعمال کا مقصود رضائے الٰہی یا جزا پانے اور سزا سے بچنا ہے جبکہ اخلاقیات میں ان اعمال کا مقصد ایک انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے ساتھ ساتھ حقیقی مسرت یا خوشی کا حاصل کرنا ہے۔مذہب انسانوں کو عقائد اور ایمانیات کے ساتھ ساتھ عبادات اور شعائر کی پابندی کا درس دیتا ہے لیکن اخلاقیات کا دائرہ کار مذہب کی نسبت محدود

---

(۵) محمد عظیم، فلسفہ اخلاقیات (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۱۶) ص:۳۰

(۶) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی، اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۰ء) ص:۲۰

ہے اور اس میں وعظ ونصیحت ہی کافی ہے۔ مذہب میں ایمانیات اور حیات بعد الموت کا تذکرہ ملتا ہے جو ایک وسیع تصور ہے جبکہ اخلاقیات کا دارومدار ایک فرد کی نجی، سماجی اور دنیاوی زندگی تک محدود ہے۔

(۲) مذہب، سائنس اور علم الاخلاق:

مذہبی عقائد ونظریات الہامی اور ابدی ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی جبکہ سائنس تجربے، مشاہدے اور تجزیے کی بنیاد پر حاصل ہونے والے علم اور اس کے تحت قائم ہونے والے نظریات کا نام ہے جن میں تبدیلی ممکن ہے۔

معرکہ مذہب و سائنس پہ مصر کے مشہور عالم "**محمد قطب**" لکھتے ہیں:

> ''یورپ میں سائنس و مذہب کی کشمکش وہاں کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔ کلیسا نے کچھ مفروضہ فلسفیانہ نظریات کو مقدس آسمانی وحی قرار دے کر ان سے انحراف کو کفر کا درجہ دے دیا تھا۔ مگر جب سائنس نے ان نظریات کے بودے پن کو ثابت کر دیا تو طبعی طور پر لوگوں نے تجربی علوم کی تصدیق کی اور جھوٹے کلیسا کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے اور مذہبی افکار سے گلوخلاصی کی کوششیں شروع کر دیں۔'' (۷)

اسی طرح گیلیلیو کو مذہبی لوگوں نے اس کے اپنے ہی مشاہدات اور تجربات سے انکار کرنے پر مجبور کیا۔

لیکن اخلاقیات اور سائنس میں ایسا کوئی تناؤ نظر نہیں آتا کیونکہ سائنس کی طرح اکثر اخلاقی اصول کسی نہ کسی منطقی وجہ پر قائم ہیں اور سائنس کا علم اس کی تائید کرتا ہے۔ ایک مشترک وجہ یہ بھی ہے کہ جیسے سائنسی نظریات کو ہدف تنقید بنایا جا سکتا ہے اسی طرح اخلاقی قوانین کو بھی ہدف تنقید بنایا جا سکتا ہے اور ان دونوں پر تنقید کرنے والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔ اخلاقیات میں تجربے اور مشاہدے کی کارفرمائی نظر آتی ہے جیسے اچھے اعمال کا نتیجہ اچھا اور برے اعمال کا برا نتیجہ دیکھنے میں آتا ہے اس طرح سائنس اور اخلاقیات کا تعلق مضبوط ہوتا ہے۔

(۳) اخلاقیات اور تصوف:

تصوف قلبی اور روحانی صفائی کا نام ہے۔ اس پاکیزگی کے لیے مختلف قسم کے مجاہدے، مراقبے اور نفس کشی کی ضرورت ہے۔ تصوف کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ یہاں ایک فرد کو انفرادی اصلاح کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہاں کسی مقدس مذہبی مشن کے لیے لڑنے کی بجائے اپنے نفس سے لڑنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن جب صوفیوں کو جنگلوں اور غاروں کی طرف رخ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو تصوف اور اخلاق کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ اخلاقیات تو ایسے انسانی اعمال اور افعال سے بحث کرتا ہے جو معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور رہبانیت کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۴) اخلاقیات اور علم نفسیات:

اخلاقیات اور نفسیات دونوں انسانی رویوں سے بحث کرتے ہیں۔ نفسیات کے ماہرین انسان کی ذات اور کردار کو سمجھنے کے لیے ایک خاص طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے وہ ایسے نتائج حاصل کرتے ہیں جو یقینی ہوں اور ہر قسم کے شک وشبہ سے محفوظ ہوں۔ اخلاقیات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کا علم ضروری ہے لیکن نفسیات اخلاقیات کی نسبت وسیع علم ہے۔ نفسیات میں انسانی نفس کی ہر کیفیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس میں انسان کے غیر ارادی اعمال بھی شامل ہیں جبکہ اخلاقیات صرف ارادی اعمال سے بحث کرتا ہے۔ نفسیات کا اچھے یا برے اعمال سے کوئی تعلق نہیں جبکہ اخلاقیات کا

---

(۷) محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، 1981) ص:۲۱

مقصد ہی اچھے برے کی تمیز کرنا ہے۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب لکھتے ہیں:

''ان دونوں علوم (علم الاخلاق اور علم النفس) کے درمیان بہت بڑا علاقہ اور ارتباط ہے۔اس لئے کہ علم النفس حسب ذیل اشیاء سے بحث کرتا ہے :قوت احساس،قوت ادراک ،قوت حافظ،قوت ذاکرہ،ارادہ اور ارادہ کی آزادی،خیال،وہم،شعور،عواطف ومیلانات اور لذت والم۔اوران میں سے ایک شے بھی ایسی نہیں ہے کہ علم اخلاق سے بحث کرنے والا اس سے مستغنی اور بے پرواہ ہو سکے۔لہذا یوں کہنا چاہیے کہ علم نفس،علم اخلاق کا ایک ضروری مقدمہ ہے ۔علوم کے اس آخری دور میں علم نفس کی ایک اور شاخ کا اضافہ ہوا ہے جس کو علم النفس الاجتماعی کہا جاتا ہے۔یہ عقل کو اس علم کے اجتماعی رخ کی تعلیم دیتا ہے، یہ لغت پر بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ عقل پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے یہ وحشی اور متمدن اقوام کی عادات وخصائل سے بحث کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ نظم اجتماعی پر کیسے کیسے حالات طاری ہوئے اور کس کس قسم کے دور گزرے ہیں۔اسی لیے علم اخلاق پر جس درجہ علم النفس الاجتماعی اثر انداز ہے شخصی علم النفس اس درجہ موثر نہیں۔''(۸)

(۵) اخلاقیات اورسوشیالوجی:

سوشیالوجی یا علم الاجتماع انسانوں کی اجتماعی زندگی سے بحث کرتا ہے۔اخلاقیات کا موضوع انسانوں کے ارادی اعمال ہیں۔اس طرح اخلاقیات کا سوشیالوجی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔کیونکہ ارادی اعمال کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے زیادہ اس کی اجتماعی زندگی سے ہے۔انفرادی زندگی کا وجود اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے۔

مولانا محمد حفظ الرحمان سیوھاروی اخلاقیات اورسوشیالوجی کے باہم تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علم اجتماع قوموں کی تاریخ ان کی ترتیب وتدریج،ان کے عروج وزوال،ان کے لغات وزبان،ان کے مذہب اوران کے خاندان وقبائل سے بحث کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ قوانین کس طرح عالم وجود میں آئے۔حکومت کا وجود کس طرح عمل میں آیا اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔چنانچہ ان کے مطالعہ سے انسانوں کے اعمال وکردار اور ان کے برے یا بھلے اور درست ونادرست ہونے کے متعلق حکم صادر ہونے میں کافی مدد ملتی ہے۔''(۹)

(٦)اخلاقیات اور مابعد الطبیعات:

مابعد الطبیعات ''علم کائنات'' اور ''علم وجودیات'' کے مباحث پر مشتمل ہے۔علم کائنات کا علم الاخلاق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے،البتہ وجودیات میں وجود یا ہستی،اجسام اوران کی حقیقت وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔کئی اخلاقی تعلیمات اپنی نوعیت کے لحاظ سے مابعد الطبیعاتی ہیں،مثلاً ہم کہتے ہیں جھوٹ نہ بولو،چوری نہ کرو۔اب جھوٹ بولنے یا چوری کرنے سے کوئی مادی فائدہ تو ہو نہیں سکتا (بلکہ ان اعمال سے مادی فائدہ ہو بھی سکتا ہے

---

(۸)مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین ۱۹۵۰ء)ص:۲۵،۲۶

(۹)مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین ۱۹۵۰ء)ص:۲۷

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادیت کا اخلاقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں۔اسی طرح مذہب کا انکار کرنے والے افراد اور معاشرے اخلاق کے لحاظ سے مثالی ہوتے ہیں وہاں کوئی برائی نظر نہیں آتی یا جرائم کی شرح کم ہوتی ہے۔سکینڈے نیون ممالک (جن میں ناروے،سویڈن،فن لینڈ اور ڈنمارک) مذہب سے آزاد ہونے کے باوجود دنیا کے پرامن ممالک کہلاتے ہیں اور وہاں جرائم کی شرح کم ہے۔حاکم وقت بغیر کسی حفاظتی دستے کے گھومتے نظر آتے ہیں اور لوگ چھٹی کا دن عبادت گاہ کی بجائے تفریح گاہ میں گزارتے ہیں۔ایسے ممالک کا قانون بھی اخلاق کا پابند بناتا ہے لیکن ایسے معاشروں میں اخلاقی اقدار کا وجود مابعدالطبیعات کا مرہون منت بھی ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔روحانی سکون،ضمیر کی آواز،دل کا سکون جیسے مابعدالطبیعاتی عوامل انسان کو سیدھی راہ پر چلاتے ہیں۔اس سلسلے میں اخلاقی تعلیمات کے مادی فوائد،مذہب کی اخلاقی تعلیمات اور ملکی قوانین خواہ کچھ بھی ہوں اخلاقی اقدار کی نوعیت ہمیشہ مابعدالطبیعاتی ہی ہوتی ہے۔

(۳)اخلاق کی اقسام

اخلاق کی درج بالا تعریفات سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ خلق عادت،فطرت،طبیعت یا کیفیت کو کہتے ہیں۔یہ عادت،فطرت طبیعت یا کیفیت' خدا،مذہب،معاشرہ،عقل یا شریعت کی پسندیدہ بھی ہوسکتی ہے اور ناپسندیدہ بھی۔اگر یہ پسندیدہ ہے تو اسے اچھا اخلاق کہا جائے گا اور اگر ناپسندیدہ ہے تو برا اخلاق کہا جائے گا۔ذیل میں چند علماء کی تعریفات دی جاتی ہیں جو ہمارے اس دعوی کی تصدیق کریں گی۔

امام غزالیؒ اخلاق کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اخلاق ایک ایسی ہیئت سے عبارت ہے جو دل میں راسخ ہو جس سے افعال نہایت آسانی کے ساتھ بلا سوچے سمجھے صادر ہوتے رہیں۔اگر ہیئت ایسی ہو کہ اس سے بہترین افعال صادر ہوں تو اسے حسن اخلاق کہا جائے گا اور اگر اس ہیئت سے صادر ہونے والے افعال خراب ہوں تو اس ہیئت کو جو کہ ان افعال کا سرچشمہ ہے،برا اخلاق کہا جائے گا۔''(۱)

سید سلیمان ندویؒ اخلاق کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے رذائل ہیں۔''(۲)

مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی اخلاق کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انسانی رجحانات میں سے کسی رجحان کا اپنے استمرار اور تسلسل کی وجہ سے غالب آجانا خلق ہے پس اگر یہ رجحان اپنی حقیقت میں خوب اور بہتر ہے تو اس کا نام ''خلق حسن'' اور اگر قبیح اور معیوب ہے تو اس کو ''خلق السوء'' (بدخلقی) کہا جاتا ہے۔(۳)

---

(۱) محمد بن محمد،ابوحامد،امام غزالی،مترجم مولانا محمد صدیق ہزاروی،احیاء العلوم (لاہور،پروگریسو بکس،۲۰۰۳ء) ج:۳۔ص ۱۲۴

(۲) علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،سیرۃ النبیؐ (لاہو:رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶۔ص:۱۷۴

(۳) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین،۱۹۵۰ء) ص:۱۰۵،۱۰۶

احمد جاوید اخلاق کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''طبیعت میں موجود صلاحیتیں جو فکر و عمل کی عکاسی کرتی ہیں انہیں اخلاق کہا جاتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ غصہ طبیعت کا ایک عنصر ہے یہی عنصر انسانی فکر و عمل کا ایک خاص رخ متعین کرتا ہے یہ رخ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی اخلاق اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔''(۴)

(i) حسن اخلاق:

حسن اخلاق سے مراد وہ ہیئت، کیفیت، عادت یا فطرت ہے جو خدا، مذہب افراد یا معاشرہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ان اوصاف پر تعریف کی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اجر و ثواب کا باعث بھی بنتے ہیں۔ اگر خدا کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جائے تو یہ محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار پاتے ہیں۔ معاشرہ انہی اچھے اعمال کی تائید کرتا ہے اور انہی کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ذیل میں ہم امام غزالی کے نقل کردہ کچھ اقوال نقل کریں گے جو حسن اخلاق کے مفہوم کو واضح کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :

''حسن خلق تین باتوں میں ہوتا ہے حرام کاموں سے بچنا، حلال طلب کرنا اور اہل و عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔''

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں:

''حسن خلق خندہ پیشانی دولت خرچ کرنے اور ایذا رسانی سے باز رہنے کا نام ہے۔''

حضرت واسطیؒ فرماتے ہیں:

حسن خلق یہ ہے کہ آدمی نہ خود کسی سے لڑے اور نہ کسی دوسرے کو لڑنے کا موقع دے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوب پہچان رکھتا ہے۔

حضرت شاہ کرمانی فرماتے ہیں :

''حسن خلق کسی کو اذیت نہ پہنچانا اور مشقت برداشت کرنا ہے۔''

حضرت سہل تستریؒ سے پوچھا گیا حسن خلق کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا:

کم از کم یہ کہ دوسروں کی بات برداشت کی جائے بدلہ نہ لیا جائے ظالم پر رحم کیا جائے، اس کے لیے بخشش مانگی جائے اور شفقت کی جائے۔(۵)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے درج ذیل علماء کے اقوال نقل کیے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ اور **شاہ کرمانیؒ** نے اس سوال کے جواب میں کہ حسن خلق کیا ہے؟ فرمایا:

طاقت رحم، جود و کرم کی بہتات، ایذا رسانی سے اجتناب اور مصائب پر صبر و تحمل کا نام حسن خلق ہے۔

شیخ جنید بغدادی فرماتے ہیں:ؒ

---

(۴) احمد جاوید، مرتب ڈاکٹر محمد امین، ترک رذائل (لاہور، تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، ۲۰۱۲ء) ص:۱۹

(۵) محمد بن محمد، ابو حامد، امام غزالی، مترجم مولانا محمد صدیق ہزاروی، احیاء العلوم (لاہور، پروگریسو بکس، ۲۰۰۳ء) ج:۳۔ ص ۱۲۲، ۱۲۳

''چار چیزیں حسن خلق ہیں سخاوت، الفت، خیر خواہی، شفقت۔''(۶)

امام غزالیؒ حسن اخلاق پر بلیغ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جب چاروں ارکان برابر ہوں اور ان میں اعتدال اور مناسبت ہو تو حسن خلق حاصل ہوگا اور وہ چار ارکان قوت علم، قوت غضب، قوت شہوت اور ان تینوں کو اعتدال پر رکھنے کی قوت ہو۔ قوت علم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس مرتبے پر ہو جس سے اقوال میں سچ اور جھوٹ، عقائد میں حق اور باطل اور افعال میں اچھے برے کی تمیز ہو سکے۔ جب یہ قوت حاصل ہوگی تو اس سے حکمت کے ثمرات حاصل ہوں گے اور حکمت تمام اخلاق حسنہ کی اصل ہے اسی کے بارے میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا(البقرہ ۲:۲۶۹)

اور جسے حکمت دی گئی اسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی

قوت غضب کا حسن یہ ہے کہ حکمت کے تحت رکے اور جاری ہو۔ اسی طرح شہوت کا حسن اور وعمدگی یہ ہے کہ وہ حکمت کے تحت ہو یعنی جیسے شریعت اور عقل کا اشارہ ہو اس کے مطابق چلے۔ قوت عدل شہوت اور غضب کو عقل اور شریعت کے اشارے کے مطابق کنٹرول کرنا ہے تو عقل ایک ناصح مشیر کی طرح ہے اور قوت عدل ہی قدرت ہے۔ قوت غضبیہ کا حسن اور اعتدال شجاعت کہلاتا ہے قوت شہوت کے اعتدال کو عفت (پاکدامنی) کہا جاتا ہے۔ اگر قوت غضب اعتدال سے بڑھ جائے تو اسے تہور (لاپرواہی) اور اگر کمی کی طرف جائے تو اسے بزدلی اور کمزوری کہتے ہیں۔ اگر شہوت کی قوت اعتدال سے بڑھ جائے تو اسے حرص کہا جاتا ہے اور اگر کمی کی جانب مائل ہو تو جمود کہتے ہیں۔ درمیانی حالت محمود ہے اور یہی فضیلت ہے اور اس کی دونوں طرفیں قابل مذمت اور ذیل ہیں اور جب عدل فوت ہو جائے تو اس کی زیادتی اور کمی والے دو کنارے نہیں ہوتے بلکہ اس کی ایک ہی ضد ہے اور اسے ظلم کہتے ہیں۔ حکمت اغراض فاسدہ میں جب حد سے زیادہ ہو تو اسے خبث اور مکروفریب کہتے ہیں اور کم ہو تو اسے بیوقوفی کہا جاتا ہے درمیانی حالت کو ہی حکمت کہتے ہیں۔ تو اب اخلاق کے اصول چار باتیں ہوئیں حکمت، شجاعت، پاک دامنی اور عدل وانصاف۔(۷)

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

''امام غزالیؒ نے خلق کی تعریف کے حوالے سے بات کرتے ہوئے دو نقطہ ہائے نظر بیان کیے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس طرح انسان کی ظاہری صورت میں تبدیلی ممکن نہیں اسی طرح انسان کی باطنی صورت میں بھی تبدیلی ممکن نہیں۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کے جذبات وخواہشات پر قابو پا کر اس کی باطنی قوتوں کی مناسب تنظیم سے اس کے اندر تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے اور اس تبدیلی کا نام حسن خلق ہے۔ اگر یہ تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو تعلیم وتربیت، وعظ ونصیحت اور انبیاء وصلحاء کی کاوشیں سب شغل بے کاری ہوتا اور حضورؐ یہ نہ فرماتے (**حسنوا اخلاقکم**) یعنی اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ۔ امام غزالیؒ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر دوسرے نقطہ نظر کو ترجیح دیتے ہیں۔''(۸)

---

(۶) مولانا محمد حفظ الرحمن سیوھاروی، اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۰ء) ص:۵۶۶

(۷) محمد بن محمد، ابوحامد، امام غزالی، مترجم مولانا محمد صدیق ہزاروی، احیاء العلوم (لاہور، پروگریسو بکس، ۲۰۰۳ء) ج:۳، ص۱۲۴، ۱۲۵

(۸) ڈاکٹر خالد علوی، انسان کاملؐ (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۱ء) ص:۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۵

مشہور فلسفی ارسطو نے حسن اخلاق کی وضاحت میں لکھا ہے:

خیر مسرت ہے اور مسرت روح کی ایک کیفیت ہے۔روح کے دو حصے ہوتے ہیں ایک عقلی اور دوسرا غیر عقلی! غیر عقلی حصہ کو ارسطو پھر دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے،ایک نباتی (vegetative) اور دوسرا اشتہائی (Appetitive) انسانی روح کا نباتی حصہ پودوں اور درختوں کی زندگی جیسا ہے اور اشتہائی حصہ میں حیوانی زندگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔روح کے اشتہائی حصہ میں کسی نہ کسی حد تک شعور بھی پایا جاتا ہے۔روح کے عقلی حصہ میں صرف تفکر پایا جاتا ہے۔عملی زندگی میں روح کے دونوں حصے مل کر کام کرتے ہیں۔

جس طرح روح کے دو حصے ہیں اسی طرح فضائل بھی دو قسم کے ہیں،ایک علمی اور دوسرا اخلاقی۔علمی فضائل کا تعلق روح کے عقلی حصے سے ہے اور اخلاقی فضائل کا تعلق اشتہائی حصے کو عقل کے تابع رکھنے سے ہے علمی فضائل تعلیم کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اخلاقی فضائل عادت اور تربیت سے پیدا ہوتے ہیں۔(۹)

اخلاق حسنہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ایسے اخلاق جن کا عملی پہلو صرف انسانوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس میں تمام جاندار شامل ہیں۔ارشاد الٰہی ہے

وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (البقرہ ۲:۱۹۵)

ترجمہ: نیکی کرو بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے

(۲) ایسے اخلاق جن کا عملی پہلو کسی طبقے کے ساتھ خاص ہے۔اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (الشعراء ۲۶:۲۱۵)

ترجمہ: اور جو مومن تمہارے پیچھے چلیں ان کے لیے انکساری کے ساتھ اپنی شفقت کا بازو جھکا دو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ (ال عمران ۳:۱۱۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا راز دار دوست نہ بناؤ۔

(۳) اخلاق کی اس قسم میں اچھے اخلاق کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا (ال عمران ۳:۱۰۳)

ترجمہ: اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو

وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ (البقرہ ۲:۶۰)

ترجمہ: اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو

(۴) ہر انسان کی زندگی دوسرے انسان سے وابستہ ہے اس لیے ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں۔ان حقوق کی کی ادائیگی سے انسان کو خوشی ملتی ہے اور اس کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔معاشرہ امن کا گہوارہ بن جاتا ہے اور خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ (النساء ۴:۳۶)

---

(۹) نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان (لاہور، علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۱ء) ص: ۱۶۶۔۱۶۷

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور قریبی
رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور ہمسایہ جو قریبی رشتہ دار ہے اور اجنبی ہمسایہ اور ساتھ والا ساتھی اور
مسافر اور غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

(۵) ایسے اخلاق جو دیگر مذاہب اور اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵)

یعنی ہم کسی رسول کے ماننے میں تفریق نہیں کرتے

دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (ال عمران ۳:۶۴)

ترجمہ: فرما دیجیے اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔

غرض اخلاق کی طرح اخلاق حسنہ کے مفہوم کو مفکرین اور دانشوروں نے اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اخلاق حسنہ سے مراد وہی اخلاق ہوں گے جو عقل اور شریعت کے پسندیدہ ہوں۔ تمام مذاہب نے تقریباً اچھی عادات کو اچھے اخلاق کا نام دیا ہے۔ لیکن اسلام نے جس جامعیت کے ساتھ اخلاق حسنہ کو واضح اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شکل میں عملی نمونہ فراہم کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

(ii) رذائل اخلاق:

رذائل رذیلۃ کی جمع ہے جس کے معنی نالائقی اور بری عادت کے آتے ہیں۔ (۱)

سید سلیمان ندویؒ ''رذائل'' کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور گناہ گار ٹھہرتے ہیں۔ جن کی برائی کو عقل مند جانتا اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان کو منکر (بری باتیں)، فحشاء (بے حیائی)، فاحشۃ (فحش)، سوء (برائی)، سیئۃ (برا)، مکروہ (ناپسندیدہ)، خطأ (ناصواب یا بھول)، اثم (گناہ) عدوان (زیادتی) وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں۔ ان ہی الفاظ سے یہ اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھونا اور قابل نفرت ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرح دونوں کی نگاہ میں بدنما ہیں۔'' (۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۹۰)

---

(۱) مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات (ملتان: مکتبہ امدادیہ، ۱۹۵۰ء) ص: ۲۸۹

(۲) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج: ۶۔ ص: ۲۸۴، ۲۸۵

بے شک اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قریبی رشتہ داروں کو (ان کا حق) دینے کا
حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے
روکتا ہے وہ تمہیں نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

یہ قرآن مجید کی جامع آیت ہے جو محاسن اخلاق اور رذائل اخلاق کا احاطہ کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول ہے:

''سارے قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے۔''

قتادہ فرماتے ہیں:

''جو اچھی عادتیں ہیں، ان کا حکم قرآن نے دیا ہے اور جو بری خصلتیں ہیں ان سے
اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے، بدخلقی اور برائی سے اس نے ممانعت کردی ہے۔'' (۳)

فحشاء یا فاحشۃ:

کا مادہ ''**فحش**'' ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔
اصطلاح میں حدود الٰہی سے آگے بڑھ جانے کو فحشاء کہا جاتا ہے۔

منکر:

کے لفظی معنی ہیں جس کی پہچان نہ ہو۔ یعنی ایسا کام جو جانا پہچانا نہ ہو اور ہر شخص فطری طور
پر اسے ناپسند کرے۔ اس کی مذمت کی جائے۔ اس کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی
ضرورت نہ ہو بلکہ ہر ذی شعور معاشرے میں یکساں طور پر برے سمجھے جائیں۔

بغی :

کے لفظی معنی زیادتی اور کسی پر ہاتھ بڑھانے کے ہیں۔ (۴)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَمِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (الاعراف، ۷:۳۳)

فرما دیجیے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

مولانا ادریس کاندھلوی کے نزدیک:

اس سے مراد ظلم اور تعدی ہے، یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسروں پر فوقیت اور غلبہ کا خواہاں ہونا جسے تکبر و تجبر کہتے
ہیں۔ انسان میں جو قوت شیطانیہ اور قوت وہمیہ کا مادہ موجود ہے اس سے ظلم و تعدی اور سرکشی نمودار ہوتی ہے۔ (۵)

---

(۳) اسماعیل بن عمر، ابن کثیر، مترجم مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۱۹۹۹ء) ج:۳، ص:۱۴۷

(۴) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۶۔ص:۲۸۶-۲۸۸

(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۴، ص:۳۹۷

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''یعنی اپنی حدود سے تجاوز کر کے ایسے حدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔اس تعریف کی رو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خودمختارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجاتے ہیں،اور وہ بھی جو بندگان خدا کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔''(۳)

مولانا امین احسن اصلاحی:

''بغی کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں،یعنی آدمی اپنی قوت وطاقت اور اپنے زور اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس سے دوسروں کو دبانے کی کوشش کرے۔''(۴)

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''الاثم : کے اصل معنی کوتاہی کے ہیں۔**اثمہ** اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بوجھ کر سست چلے۔اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے،یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت وفرمانبرداری میں قدرت واستطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بوجھ کر قصور دکھانا۔''(۵)

اس آیت میں رذائل کو تین لفظوں پر محیط کیا گیا ہے۔ایک فواحش یعنی بے حیائی و برائی کے وہ کام جو پوشیدہ اور ظاہر ہوں۔دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی۔ہر برے اخلاق میں یہ تینوں یا ان میں سے کوئی ایک برائی ضرور پائی جائے گی۔

رذائل کی ترتیب:

رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالی کی کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کسی کو کتنا لگاؤ ہے۔درج بالا آیت میں ترغیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے سب سے پہلے فحشاء پھر منکر پھر بغی۔

فحشاء: میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اسا سا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔

منکر: سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم،باپ کی سنگدلی،اولاد کی نالائقی وغیرہ

بغی: جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت پر چھا جاتی ہے جیسے چوری،قتل،ڈاکہ وغیرہ۔

دوسرے نظریہ کی رو سے صفات ذمیمہ میں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ برائیاں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔(۶)

---

(۳) سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲،ص:۲۴

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴،ص:۴۳۹

(۵) سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲،ص:۲۴

(۶) علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،سیرۃ النبیؐ (لاہو: رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶۔ص:۲۸۶-۲۸۸

ہمارے اندر اخلاق کا ملکہ ودیعت کیا گیا ہے۔ ہماری قوتیں فی نفسہ بری نہیں ہیں بلکہ ان کا بے جا استعمال اور ان کے استعمال میں غلطی اور لغزش انہیں بد اخلاقی کا لباس پہناتی ہے۔ اسلام نے اس غلطی اور لغزش سے پردہ اٹھایا ہے بداخلاقیوں میں مبتلا ہونے والے اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مثلا

(۱) بری صحبت:

اس سے بچنے کے لیے فرمایا:

كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبه ۹:۱۱۹)

یعنی بروں نہیں بلکہ نیکوں اور سچوں کی معیت اختیار کرو۔

(۲) جسمانی یا ذہنی بیماری:

اس کے بارے میں حضرت محمدؐ نے فرمایا:

المُؤمِنُ الْقَوِیُّ خَيْر وَاَحَبّ اِلَی اللّٰهِ مَنَ الْمُؤمِنُ الضَّعِيْف (۷)

اللہ تعالی کے نزدیک طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے۔

(۳) ماحول کی خرابی:

يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاقُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحريم ۶:۶۶)

جماعتی مصیبتیں بھی آتی ہیں تو کنارہ کش افراد کو بھی نہیں چھوڑتیں۔

(۴) جہالت اور بے علمی:

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> ''بعض اعمال کے متعلق علم نہ ہونا کہ یہ بداخلاقی کے زمرے میں ہیں یا نہیں۔ اس لیے اسلام نے مفصل ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے اور اصولی طور پر بتایا ہے کہ اخلاق حسنہ اسماء حسنی کا پرتو اور صفات الہیہ کا ظل اور سایہ ہیں۔ وہی اخلاق اچھے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور وہی اخلاق برے ہیں جو صفات اللہ کے منافی ہیں۔ جو اخلاق اخلاق الہیہ سے مطابقت رکھیں وہ اچھے ہیں اور جو ان کے منافی ہوں وہ برے۔ اس جہالت کو دور کرنے کے لیے حسن خلق اور سوء خلق سے جتنے اخلاق واوصاف پیدا ہوتے ہیں ان سب کو اللہ تعالی نے مومنوں اور منافقوں اور کافروں کے اخلاق واوصاف میں بیان کر دیا ہے۔''(۸)

غرض ایسی ہیئت جو برے اعمال کا سبب بنے یا ایسی عادت، طبیعت یا کیفیت جو خدا، مذہب، افراد یا معاشرہ کے لیے ناپسندیدہ ہو یا ایسا رجحان جو معیوب اور قبیح ہو برا اخلاق کہلائے گا۔ اس اخلاق کی ہر شعبہء زندگی میں مذمت کی جاتی ہے اور بعض اوقات خدا کی ناپسندیدگی کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ عذاب الہی کا موجب بھی بن جاتے ہیں۔ معاشرہ ان اعمال کے تدارک کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ان میں سے بعض قابل تعزیر جرم بھی ہوتے ہیں اور ان پر دنیاوی سزا بھی دی جاتی ہے۔

---

(۷) صحيح مسلم ،كتاب القدر، باب فی الامر بالقوة وترك العجز، رقم: ۴۸۲۲

(۸) اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء) ج:۲، ص:۱۹۱

(۴) انسانی زندگی میں اخلاق کی ضرورت واہمیت:

☆۔ اللہ تعالی نے انسانی زندگی میں اخلاق کی اہمیت کوواضح کرتے ہوئے فرمایا

اَلَّذِی خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ (الملک ۶۷:۲)

وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں سب سے بہتر ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ان کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔اول یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے،اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔خالق نے اسے یہاں اامتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہوگیا ۔تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تا کہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملا یہ دکھا دے کہ وہ (کیسا) انسان ہے؟ چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا برا؟ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے لہذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے معلوم کرنا ہوگا کہ حسن عمل کیا ہے؟ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی کیونکہ اگر جزا نہ ہوتو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔''(۱)

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''احوال انسانی میں سے یہاں صرف دو چیزیں موت وحیات بیان کی گئیں کیونکہ یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے احوال وافعال پر حاوی ہیں۔''(۲)

ربیع بن انس نے فرمایا کہ موت انسان کو دنیا سے بیزار کرنے اور آخرت کی طرف رغبت دینے کے لیے کافی ہے یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ انسان کی اس آزمائش میں جو اس کی موت وحیات سے وابستہ ہے حق تعالی نے فرمایا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے یہ نہیں فرمایا کہ کس کا عمل زیادہ ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک کسی عمل کی مقدار کا زیادہ ہونا قابل توجہ نہیں بلکہ عمل کا اچھا اور صحیح ومقبول ہونا معتبر ہے۔اسی لیے انسان کے عمل کو گنا نہیں بلکہ تولا جائے گا جس میں بعض ایک ہی عمل کا وزن ہزاروں اعمال سے بڑھ جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی یہاں تک کہ **احسن عملا** تک پہنچے تو فرمایا

---

(۱) سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت،۱۹۸۴ء) ج:۶،ص:۴۱،۴۲

(۲) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن،۲۰۰۸ء) ج:۸،ص:۵۱۵

احسن عملا وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو اور اللہ کی اطاعت میں ہر وقت مستعد و تیار ہو۔(۳)

☆۔انسان کے اندر فطری طور پر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا(الشمس۹۱:۷،۸)

اور نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کے گناہ
اور پرہیز گاری کی سمجھ اس کے دل میں ڈالی۔

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالی نے نفس انسانی کو بنایا پھر اس کے دل میں فجور اور تقوی دونوں کا الہام کر دیا مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالی نے گناہ اور اطاعت دونوں کے مادے اور استعداد رکھ دی ہے پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار اور قوت دے دی کہ وہ اپنے قصد و اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کرے یا اطاعت کی۔جب وہ اپنے قصد و اختیار سے ان میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی قصد و اختیار پر اس کو ثواب یا عذاب ملتا ہے۔''(۴)

سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

''الہام لفظ لہم سے ہے جس کے معنی نگلنے کے ہیں۔۔۔اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحا اللہ تعالی کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔نفس انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیز گاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالی نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی،اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں،فجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقوی برائیوں سے اجتناب ایک اچھی چیز۔یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اس کو عطا کر دی ہے۔یہی بات سورہ بلد میں فرمائی گئی ہے کہ **وهدينٰه النجدين (البلد ۹۰:۱۰)** اور ہم نے اسے خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے۔اسی کو سورہ دھر میں یوں بیان کیا:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدهر۷۶: ۳)

ترجمہ: ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر

اور اسی بات کو سورہ قیامۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوامہ (ضمیر) موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے **(القيٰمة ۷۵:۲)** اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے **(القيٰمة ۷۵:۱۴،۱۵)**

---

(۳) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج:۸،ص:۵۱۷

(۴) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج:۸،ص:۷۵۶

یہ امتیاز واحساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کوئی بھی معاشرہ خیر وشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا وسزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔اس چیز کا ہر زمانے ہر جگہ اور ہر مرحلہ تہذیب وتمدن میں پایا جانا اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے اور مزید برآں یہ اس کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالق ،حکیم ودانا نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے کیونکہ جن اجزا سے انسان مرکب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادی نظام چل رہا ہے ان کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔''(۵)

سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

''فجور وتقوی کا یہ الہامی علم اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر شخص خود ہی اس سے تفصیلی ہدایت حاصل کر لے، بلکہ اس غرض کے لیے اللہ تعالی نے وحی کے ذریعہ سے انبیاء علیہم السلام کو مفصل ہدایت دی جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ فجور کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے جن سے بچنا چاہیے اور تقوی کس چیز کا نام ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔اگر انسان وحی کے ذریعہ سے آنے والی اس واضح ہدایت کو قبول نہ کرے تو وہ نہ فجور سے بچ سکتا ہے نہ تقوی کا راستہ پا سکتا ہے۔''(٦)

غرض انسان فطری اعتبار سے بعض عادات کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کا تعلق خواہ کسی مذہب ،قوم یا ملک سے ہو وہ اپنے فطری شعور کی وجہ سے اچھے اور برے اخلاق میں تمیز کر سکتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ ظلم ،جھوٹ ،خیانت کو ہر معاشرے میں برا سمجھا گیا ہے جبکہ سچ ،انصاف اور امانت داری کی ہمیشہ تعریف کی گئی ہے۔ذیل میں ہم اقوام عالم کے مشہور حکماء کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

۱۔کون فیوشس :

کے نزدیک انسانی زندگی بامقصد تھی اور کائنات کا تصور بالکل ارتقا پذیر ہے جس کی اصلاح میں ہر انسان اپنی ذاتی کوشش سے اضافہ کر سکتا ہے اور اسی لیے اس کا خلاقی نظام رجائیت کا آئینہ دار ہے جس میں انسانی سیرت وکردار کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے وہ زندگی سے گریز نہیں بلکہ زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتا اور اس کو انسانی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی تعلیم دیتا ہے۔

کون فیوشس نے الفاظ کے لغوی معنی کے ساتھ ساتھ اخلاقی مفہوم کو ملا کر تصورات کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔انسان کے متعلق اس کا تصور یہ تھا کہ وہ بہترین خلقت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت چونکہ خدا کی فطرت پر بنائی گئی ہے اس لیے نیک ہے،ایک شخص نے کون فیوشس سے اس کے نظام اخلاق کے بنیادی اصول کے متعلق سوال کیا اس نے جواب دیا: انسان کی فطرت خدا کی فطرت پر ہے وہ علم جو اس فطرت سے مطابقت رکھتا ہے درست ہے یہی سیدھا راستہ ہے۔

کون فیوشس کا سارا نظام اخلاق عیسائیت کے عقیدہ کفارہ (انسان اپنے باپ حضرت آدمؑ کی وجہ سے پیدائشی طور پر گناہگار ہے اس کی فطرت میں شر اس قدر ہے کہ جب تک کوئی ابن اللہ اس کا بوجھ نہ اٹھائے وہ نجات کی توقع نہیں کر سکتا) کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھا۔اس کی نگاہ میں نہ تو یہ کائنات اور زندگی شر کا مظہر تھی جس سے بھاگنا انسان کا وظیفہ حیات ہو اور نہ اس کی فطرت مسخ شدہ ہے کہ وہ انفرادی کوششوں سے اس کی اصلاح نہ کر سکے اور اسے کسی ایسی ہستی کی ضرورت ہو جو اس کا کفارہ ادا کر سکے۔

---

(۵) سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت،۱۹۸۴ء) ج:٦،ص:۳۵۲،۳۵۳

(٦) سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت،۱۹۸۴ء) ج:٦،ص:۳۵۵

کون فیوشس کا شاگرد منیش کہتا ہے کہ پیدائش کے وقت انسان کی فطرت بالکل نیک ہوتی ہے اور یہ صرف بعد کے اثرات ہیں جو ماحول یا والدین کی تربیت کے زیر اثر انسان کو صحیح راہ سے منحرف کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

ایک چینی مفکر کاؤ نے اس نظریہ کی مخالفت میں آواز اٹھائی اس کے خیال میں انسانی فطرت نہ نیک ہے نہ بد بلکہ جس طرح پانی کے بہاؤ میں مشرق و مغرب کی تمیز نہیں ہوتی اور جس طرف سے راہ ملے وہ نکل جاتا ہے اسی طرح انسانی اعمال بھی ماحول کے زیر اثر اپنا راستہ تلاش کر لیتے ہیں نیکی اور بدی کا لیول بعد کی پیداوار ہے۔(۷)

۲۔ گوتم بدھ:

نے جہالت کو دور کرنے کے لیے اپنا نظام اخلاق کی بنیاد آٹھ اصولوں پر رکھی ہے۔

(۱) صحیح عقیدہ یا تصور:

انسانی نفس سے متعلق جب تک صحیح نظریہ موجود نہ ہو اعمال کی درستی ممکن نہیں۔

(۲) صحیح مقاصد یا ارادہ:

جب تک کوئی انسان جہالت سے بچنے اور نجات کے راستے پر چلنے کے لیے قوی ارادہ نہ کرے تب تک اس سے کوئی نیکی کا عمل سرزد نہیں ہو سکتا ،اس لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کو ترک کر کے جذبات و خواہشات پر قابو پائے اور تمام انسانوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھے۔

(۳) صحیح گفتار:

جھوٹ، چغلی، سخت و ترش کلامی، بے کار باتوں سے پرہیز۔

(۴) صحیح اعمال:

گوتم نے گرہستیوں کے لیے مندرجہ ذیل اعمال کو ضروری قرار دیا۔

(ا) کسی جاندار کو ضائع نہ کیا جائے (ب) کسی ایسی چیز کو لینے کی کوشش نہ کی جائے جو اس کی نہ ہو (ج) جھوٹ بولنا منع ہے (د) کوئی نشہ آور چیز استعمال نہ کی جائے (ہ) زنا ایک بدترین فعل ہے جس سے بچنا ایک لازمی چیز ہے (و) رات کو زیادہ کھانا مناسب نہیں (ز) خوشبو استعمال کرنا برا ہے (ح) ہر آدمی کو چاہیے کہ زمین پر بوریا بچھا کر سوئے۔

(۵) صحیح کمائی:

جائز اور ناجائز ذرائع آمدنی کی تمیز قائم کر کے گوتم نے لوگوں میں ایک صحت منداخلاقی نقطہ نگاہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

(۶) صحیح کوشش اور ہمت

(۷) صحیح نقطہ نگاہ

(۸) صحیح اطمینان و سکون

قرآنی اخلاق کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایمان اور عمل صالح۔ ایمانی لحاظ سے بدھ مت میں خدا، رسول اور عقیدہ آخرت کی کوئی گنجائش نہیں البتہ عمل صالح کا سارا حصہ اس میں موجود ہے۔لیکن بدھ مت نے معاشرے کی اصلاح کی بجائے انفرادی فلاح و بہبود کا تصور دیا ہے ۔ اس نظام کا سارا زور صرف فراد کی اخلاقی اصلاح تھا۔ ناقدین کا خیال ہے کہ گوتم بدھ کو ہندو معاشرے کا مصلح کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔

مشرقی مذاہب نے معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے اور روکنے کے لیے محض افراد کی اندرونی اصلاح کی اس کے برعکس مغرب نے محض خارجی

---

(۷) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۲۲۔۲۴

عوامل کی درستگی پرزور دیا۔مغرب میں بدھ مت کی مقبولیت کا ایک بڑسبب یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت اور نوعیت کے لحاظ سے عیسائیت سے مشابہ ہے۔(۸)

ھندو مت:

بھاگوتی مذہب خدائے واحد اور خلاق حسنہ کی بنیاد پر قائم تھا۔بھگوت گیتا کے قدیم حصہ میں تمام بلند اخلاقی جذبات بھاگوتی مذہب کے تصورات کا آئینہ ہیں۔بھگوت گیتا جس ماحول میں وجود میں آئی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد خالص اخلاقی تھا یعنی زندگی کے مسائل کو سلجھانا اور نیک اعمال کی ترغیب دینا اسی لیے اسے لوگ شاستر یعنی کتاب اخلاق کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔(۹)
بشیر احمد ڈار صاحب لکھتے ہیں:

''ایک خالص وحدت وجودی نظریہ حیات میں انسانی وجود، اس کی خودی، اس کے اختیار کی کوئی گنجائش نہیں اس لیے ایسے فلسفوں میں اخلاق کا وجود اور عدم مساوی ہے۔مغرب میں سپنوزا اور مشرق میں محی الدین ابن عربی اور اس کے متبعین اور شنکراچاریہ سبھی نے وحدت وجود کی حمایت کرتے ہوئے بھی اخلاق کی طرف پوری توجہ دی لیکن یہ درحقیقت ایک متضاد کیفیت ہے جس کی وجہ محض یہ ہے کہ چونکہ انسانی معاشرہ بغیر اخلاق کے ایک قدم نہیں چل سکتا اس لیے ان مفکرین کو اس پر بحث کیے بغیر گزارہ نہیں تھا ورنہ ان کے فلسفہ حیات میں عملی اخلاق کے لیے کوئی جگہ نہیں۔جب وجود مطلق ہی مختار کل اور حقیقت کل ہے، جب کائنات اور انسان کا علحدہ کوئی وجود ہی نہیں، جب اس کا اختیار بالکل صفر ہو تو آخر اخلاق کہاں سے پیدا ہوگا؟ چونکہ بھگوت گیتا محض اخلاق کی کتاب ہے اور اس کا مقصد انسانی کردار کی اصلاح ہے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ وحدت وجودی نظریے کی حمایت جو اس کتاب میں میں مختلف جگہوں پر ملتی ہے وہ بعد میں داخل کی گئی ہو تاکہ برہمن مت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔''(۱۰)

ہندوستان میں عام طور پر نجات کے تین طریقے مروج تھے:

پہلا طریقہ : تو ویدوں میں مندرج تھا یعنی رسمی عبادات مثلا قربانی وغیرہ اور دیگر نیک کام کرنا (کرم یوگ)
دوسرا طریقہ : بعد میں اپنشدوں کی وجہ سے مروج ہوا اس میں عمل کی بجائے علم پر زور دیا گیا، یعنی جس شخص کو صحیح علم حاصل ہو تو گویا اس نے نجات کے دروازے کی کنجی پر قبضہ کرلیا، بعد میں ویدانت نے اسی نظریہ کی تائید کی۔(جنان یوگ)
تیسرا طریقہ : عام طور پر بھگتی کہلاتا ہے جس میں علم اور عمل کی بجائے جذبات کا اظہار زیادہ ہوتا ہے یعنی خدا سے محبت اور الفت ک اظہار (بھگتی یوگ)۔بھگوت گیتا گویا اسی بھگتی کے طریقہ کی نمائندہ ہے اگرچہ اس میں باقی دونوں طریقوں علم و عمل پر بھی مناسب زور دیا گیا ہے۔(۱۱)

یوگ سے مراد ضبط نفس ہے۔کرم یوگ، جنان یوگ اور بھگتی یوگ سے مراد ایسا ضبط نفس ہے جو صحیح عمل، صحیح علم اور صحیح عبادت سے حاصل ہوتا ہے یہی گیتا کی خوبی ہے کہ اس میں انسانی فطرت کا صحیح اور مکمل تصور موجود ہے۔اس کے ذہنی، عملی اور جذباتی رجحانات کے اظہار کے لیے مساوی طور پر

---

(۸) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۷۱۔۷۴
(۹) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۸۹
(۱۰) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۹۰
(۱۱) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۸۱

مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔نہ وحدت وجود کی طرح صرف علم پر زور ہے اور نہ صوفیانہ اور مروجہ یوگ کی جذباتی مذہبیت پر اکتفا کی گئی ہے بلکہ ان سب کو ملا کر ایک معتدل نظام عمل پیش کیا گیا ہے۔

تناسخ کے مسئلے کی بنیادی روح یہ ہے کہ اس زندگی میں جو کام انسان کرتا ہے اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔اگر وہ عمل برا ہے تو اس کا برا نتیجہ ظاہر ہوگا لیکن اگر وہ عمل اچھا بھی ہو تب بھی اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا اور کاموں کا یہ اثر ہے جو انسان کو زندگی اور موت کے دائمی چکر سے نجات حاصل نہیں ہونے دیتا۔(۱۲)

زرتشت :

زرتشت کا نظام اخلاق بدی اور شر کے خلاف ایک عملی اور مثبت اقدام کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ انسانی فلاح و بہبود کا انحصار اس حکم اور عمل پر رکھتا ہے۔رہبانی اور وحدت وجودی نظریات کے حامیوں نے کہا کہ بدی کا کوئی علحدہ وجود ہی نہیں۔اب اگر بدی بدی نہیں بلکہ نیکی کی ایک معکوس شکل ہے تو پھر اس زندگی میں اخلاقی تگ ودو یا تعمیر سیرت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔زرتشت کے نزدیک یہ تجزیہ بالکل غلط ہے اور بدی مستقل بالذات ہے۔زرتشت کے نزدیک یہ کافی نہیں کہ ہر انسان اپنے اپنے طور پر نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے مجتنب ہو بلکہ ہر شخص اس کوشش میں لگا رہے کہ دوسرے انسانوں کو بھی یہی توفیق نصیب ہو۔

زرتشت کا مطمح نظر ایک صالح انسان کی تعمیر ہے۔زرتشت کے فلسفہ اخلاق کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:اندیشۂ نیک،گفتار نیک،کردار نیک۔ان کے مقابلہ میں تین چیزوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔اندیشۂ بد،گفتار بد،کردار بد۔اس کے اخلاقی نظام میں انسان کے اختیار کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔جب انسان کی فلاح کا تمام دارومدار،خیر وشر کی جنگ میں حصہ لینا اور خیر کی قوتوں کا ساتھ دینا ہے تو اس سے لازمی طور پر اس کے اختیار کی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔اس کے ہاں کسی قسم کے رہبانی توکل اور جبریہ عقائد کی گنجائش ہی نہیں۔زرتشتی اخلاق میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سختی سے تاکید کی گئی ہے۔ایسا شخص جو اچھائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے اہورامزدا کی رضا کا طالب ہے۔زرتشت کے نزدیک نیک اعمال کا بدلہ اور جزا دونوں جہانوں میں ملتا ہے مثلاً کاشتکاری کے ذریعہ دنیا میں مویشیوں اور غلہ کی بہتات اور آخرت میں نجات اور سعادت۔

مشرق وسطی میں عیسائیت کے مقابلے میں زرتشت نے بدی اور شر کے خلاف ایک عملی اور مثبت اقدام کی عوت دی۔اسی لیے نیٹشے نے جب عیسائی رہبانی نظام پر حملہ کیا تو زرتشت کے نام پر اپنی ایک کتاب کو منسوب کیا۔نیٹشے شاید پہلا مغربی مفکر تھا جس نے اپنی معاصر سوسائٹی کی اخلاقی خرابیوں کو محسوس کیا۔اس کے خیال میں مروجہ اخلاقی اقدار جس کو اس نے غلامانہ اخلاق کا نام دیا زوال کا پیش خیمہ ہیں۔اس لیے ان کو ترک کر کے ایک صحت منداخلاق کو رواج دینا ضروری ہے۔اس نے زرتشت کے نظریہ خیر وشر کو بہترین سمجھ کر اسے اختیار کیا۔ان دونوں کے نزدیک انسان کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر کونے میں شر کی قوتوں کا مقابلہ کرے تاکہ خیر اور بھلائی کی قوتوں کو تقویت ملے۔غرض زرتشتی اخلاق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے اعمال میں اسی طرح راستی اور عدل کو اختیار کرے جس طرح اہورامزدا اپنی مخلوق سے پیش آتا ہے۔(۱۳)

سقراط:

مذاہب عالم کی طرح سقراط نے خدا،حیات بعدالموت اور روح کی بقا کے مسائل کو اخلاقی زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ان تینوں مسائل کی بنیاد پر اس نے اخلاقی مسائل کو تعمیر کیا ہے۔آخرت کا تصور اس نے زرتشت سے لیا ہے۔سقراط نے روح انسانی کا بلند تصور جس میں روح کی بقا کا نظریہ بھی شامل ہے یونانی فکر میں پیش کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔سقراط کی زندگی کا مقصد اسی نظریہ آخرت یا حیات بعدالموت کی تبلیغ کرنا تھا۔

---

(۱۲)بشیر احمد ڈار،حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۵۸ء)ص:۱۰۴،۱۰۶

(۱۳)بشیر احمد ڈار،حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۵۸ء)ص:۱۴۶-۱۵۲

اپالوجی میں ایک جگہ سقراط نے اس دنیا کے مشاغل کے مقابلے میں آخرت کے اعمال کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔(۱۴)

ایک انسانی عمل کے دو اجزا ہیں۔(۱) علم (۲) ارادہ۔ علم کا تعلق انسانی ذہن کے ساتھ ہے جبکہ ارادہ کا تعلق انسان کے جبلی اور فطری میلانات اور حیاتیاتی تقاضوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سقراط نے اخلاقی اعمال کے لیے صرف علم کو ہی کافی سمجھا اور ارادہ کے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ سقراط نے علم (یعنی تقوی) کو ہی تمام اخلاقی زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔(۱۵)

افلاطون:

انسان کو نیکی اور بدی کا علم دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو معاشرتی رسوم و رواج سے اور دوسرا اس کو اپنی عقل کے ذریعے خیر اور شر کا علم ہوتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک معاشرتی رسوم و رواج انسانی اخلاقیات کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ اس کے نزدیک صرف عقل ہی انسانی اخلاقیات کی بنیاد بن سکتی ہے۔ تمام اخلاقی اقدار کا سرچشمہ صرف انسانی عقل ہی ہو سکتی ہے۔

غرض افلاطون نے اخلاقیات کا کوئی منظّم اور مربوط نظام پیش نہیں کیا بلکہ اس کی اخلاقیات دراصل اس وقت کے یونان میں رائج اخلاق ہی تھے۔ مثلاً وہ غلامی کو اتنا جائز سمجھتا ہے کہ اس کی حمایت میں کوئی دلیل دینا پسند نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمانے سے بھی اسے نفرت ہے۔ یہ دونوں امور یونان کے مروجہ اخلاق کا حصہ تھے۔(۱۶)

ارسطو:

سقراط اور افلاطون نے اخلاقی فعل کے اجزا علم اور ارادہ میں سے ارادہ کے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ سقراط کے نزدیک علم رکھنے والا شخص برائی کر ہی نہیں سکتا، لیکن ارسطو کے نزدیک ایسا عمل جس میں انسان کا ارادہ اور اس کی مشیت شامل نہ ہو اخلاقی فعل نہیں کہلا سکتا۔

ارسطو کے نزدیک اخلاقی عمل کی علامت یہ ہے کہ وہ افراط اور تفریط سے پاک ہو اور اس میں اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہو اور جب تک اعتدال کی راہ اختیار نہ کی جائے اس وقت تک خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ نظریہ اعتدال رہبانی اخلاق کے خلاف شدید احتجاج تھا۔ اپنے نظریہ اعتدال کو واضح کرنے کے لیے اس نے چند مثالیں بھی دیں۔

افراط	وسط	تفریط
تہور	شجاعت	بزدلی
شہوت پرستی	عفت	بے حسی
اسراف	سخاوت	بخل

ارسطو اس سے متفق ہے کہ بغیر علم کے اخلاقی عمل سر انجام نہیں دیا جا سکتا، لیکن فطری اور جبلی طور پر سرزد ہونے والے اعمال اپنی عمدگی اور افادیت کے باوجود اخلاقی اعمال نہیں کہلا سکتے۔ اخلاقی اعمال جذبات اور خواہشات کو عقل کے ماتحت چلانے کا نام ہے۔ اخلاق عقل اور ارادہ سے ہے۔ ارسطو نے علم و ایمان کے ساتھ عمل کو لازمی قرار دیا اور کہا کہ نیکی فقط علم نہیں بلکہ وہ علم و عقل کی بنا پر مرتب شدہ اعمال کا نام ہے۔ جہاں نیکی عادت نہیں وہاں نیکی کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اتفاق سے سرزد شدہ اچھا عمل سیرت کا جز نہیں ہوتا اور نہ اس سے کسی کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے نیکی علم کی افزونی

---

(۱۴) بشیر احمد ڈار، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء) ص: ۲۶۲

(۱۵) ڈاکٹر نعیم احمد، تاریخ فلسفہ یونان، (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۰، ۲۰۰۱) ص: ۱۷۰

(۱۶) ڈاکٹر نعیم احمد، تاریخ فلسفہ یونان، (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۰، ۲۰۰۱) ص: ۱۲۵-۱۲۸

سے نہیں بلکہ جذبات کے مسلسل تصرف اور ضبط نفس کی مشق سے پیدا ہوتی ہے۔

ارسطو سقراط کی طرح یہ نہیں کہتا کہ اگر انسان کو خیر و شر کا علم حاصل ہو جائے تو وہ شر کر ہی نہیں سکتا بلکہ وہ عملی زندگی کی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ بعض اوقات عادت علم پر غالب آجاتی ہے۔مثلا ایک شرابی سے جب یہ سوال کیا گیا کہ وہ شراب کو برا سمجھنے کے باوجود کیوں پیتا ہے؟اس نے کہا کہ کوئی اندرونی قوت اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔یہ اندرونی قوت دراصل عادت تھی جو اس کے علم پر غالب آچکی تھی۔غرض ارسطو نیک سیرت کی تعمیر میں علم کے ساتھ مسلسل ضبط نفس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔(۱۷)

تورات:

کے احکام عشرہ میں سے چھ کا تعلق اخلاقی احکام سے ہے۔ان احکامات میں ماں باپ کی عزت کرنے قتل،زنا،چوری نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینے سے منع کیا گیا ہے،نیز پڑوسی کی کسی بھی چیز مثلا اس کی بیوی،اس کے غلام اور لونڈی،اس کے بیل اور گدھے وغیرہ سے لالچ نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔(۱۸)

غرض ہر مذہب،معاشرے اور فلاسفہ نے انسانی زندگی میں اخلاق کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔انسان کے اندر فطری طور پر اچھے اور برے اخلاق کی شناخت ودیعت کی گئی ہے۔لیکن اس کا سارا اخلاق وہبی اور طبعی نہیں بلکہ بعض اخلاق کسبی ہیں جو وہ اپنے علم،تربیت اور معاشرے سے حاصل کرتا ہے۔اسی طرح وعظ و نصیحت اور اپنے باپ دادا کی پیروی بھی انسانی اخلاق کو متاثر کرتی ہے۔عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ یا میڈیا نے انسانی زندگی کو کافی حد تک متاثر کیا ہے اور انسانی اخلاق کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں اخلاق کی اہمیت کو عربی شاعر (شوقی) نے کیا خوب بیان کیا ہے:

ے وانما الامم الاخلاق ما بقیت

فان هموذهبت اخلاقهم ذهبوا

قومیں اسی وقت مضبوط اور توانا رہتی ہیں جب
تک ان کا اخلاق مضبوط رہتا ہے،لیکن جب
ان کے اخلاق کو زوال آجاتا ہے تو وہ بھی پیوند
زمین ہو جاتی ہیں۔(۱۹)

علامہ محمد اقبالؒ نے انسانی زندگی میں عمل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ے عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔(۲۰)

---

(۱۷) ڈاکٹر نعیم احمد،تاریخ فلسفہ یونان،(لاہور:علمی کتاب خانہ،۲۰۰۰،۲۰۰۱ء) ص ۱۶۶-۱۷۲

(۱۸) علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،سیرۃ النبیؐ (لاہو:رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶۔ص ۶۵

(۱۹) حسن ایوب،مترجم عبید اللہ فہد فلاحی،اسلام کی بنیادیں (لاہور:اسلامک پبلیکیشنز،۱۹۸۹ء) ص:۴۹۸

(۲۰) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال،بانگ درا (لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۰ء) ص:۲۱۱۲

فصل دوم: اسلام کے اخلاقی احکام کا تعارف

(ا) اسلام کا تصور اخلاق:

جب ہم مذاہب عالم اور فلاسفرز کے اخلاقی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کسی مذہب یا دانشور نے مکمل ضابطہ اخلاق پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے صرف چند اخلاقی اقوال پر اکتفا کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا کے اکثر مذاہب اور دانشوروں کے فلسفہ اخلاق کا اصل ماٰخذ انسانی عقل، تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اخلاقی تصورات یا تو باطل ہیں یا ناقص اور نامکمل ہیں۔
سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں اس وقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پا سکا جس پر وہ قابل اطمینان طریقے سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لیے حقیقتاً لا جواب ہو کر رہ گئے۔ نہ وہ اس خیر برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اس کی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتی اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا، نہ اسے وہ ماٰخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا؟ نہ اسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کامیابی ہوئی جس کے حکم کی بنا پر اخلاق کے کسی بلند جامع اور عالمگیر ضابطے کی قوت نفاذ حاصل ہوتی اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لیے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خودسری کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک حل کیا بھی، مگر یہ اسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج ہمیں اخلاقی تنزل کے ایک خوفناک طوفان کی شکل میں اٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آ رہے ہیں۔''(۱)

ان کے برعکس اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی اخلاق کی صحیح بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلام بنیادی انسانی اخلاقیات اور دیگر اخلاقی فلسفوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اسلام اخلاق کا ہی دوسرا نام ہے اور اخلاق کو اسلامی تعلیمات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ماٰخذ انسانی عقل نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول حضرت محمدؐ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس سے مراد قرآن اور سنت ہیں۔ چنانچہ اچھے اور برے اخلاق میں فرق کرنے کا معیار قرآن اور سنت ہیں۔ چنانچہ وہی اخلاق اچھے اور پسندیدہ ہوں گے جو قرآن وسنت کی رو سے اچھے اور پسندیدہ ہوں گے اور وہی اخلاق برے ہوں گے جن کو قرآن وسنت میں برا اور ناپسندیدہ کہا جائے گا، اس سلسلے میں انسان کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اخلاق کے لحاظ سے اسلام انسان کی حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ اس کی رو سے انسان نہ خدا ہے، نہ خدائی صفات کا حامل ہے اور نہ ہی خدا کا شریک ہے۔ اسلام اس تصور کی بھی نفی کرتا ہے کہ انسان خدا کے وجود کا انکار کر دے اور مادر پدر آزاد زندگی گزارے۔ اسلام کے نزدیک انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس کے پاس زندگی، جوانی، مال و دولت، علم غرض اس کا جسم بھی اس کے پاس اس کے رب کی امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کی زندگی کا مقصد واضح کر دیا ہے۔ وہ اپنے تمام اعمال میں الہامی قوانین کا پابند ہے۔

انسان کو بے کار پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی زندگی دراصل ایک امتحان ہے۔ اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دو صفات سے متصف ہونا ضروری ہے اور یہی دو چیزیں انسانی زندگی سے مطلوب ہیں۔ ایک ایمان اور دوسرا عمل صالح۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲:۸۲)

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۵ء) ص:۱۳۲

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے یہی لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایمان کے بغیر عمل صالح کی قبولیت نہیں ہے۔ اعمال صالحہ کا مفہوم بہت وسیع ہے اس میں عبادات، اخلاق اور معاملات شامل ہیں۔ اخلاق کا تعلق انسانی فرض ادا کرنے سے ہے۔

اسلام کے فلسفہ اخلاق کو واضح کرنے کے لیے ان اخلاقی اصولوں پر غور کرنا ہوگا جو قرآن وسنت میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اصول دائمی ہیں اور ان میں کوئی تغیر اور تبدل بھی واقع نہیں ہوگا، اس لیے ان پر عمل کرنا آسان ہے۔

(۱) رضائے الٰہی کا حصول:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض اخلاق حسنہ اختیار کرنے پر اپنی محبت کا وعدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان نیک اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس کی محبت کا طالب رہتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (البقرہ۲:۲۰۷)

اور لوگوں میں سے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ۲:۲۶۵)

اور ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں

اخلاقی احکام اگر اللہ کی رضا کے لیے سرانجام دیے جائیں تو یہی کامیابی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم۳۰:۳۸)

پس تم قریبی رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو یہ ان لوگوں
کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد فرمایا

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُوْءْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النسآء۴:۱۱۴)

اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔

نبی کریم حضرت محمدؐ کی بیشتر احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نیک عمل کی بنیاد رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے۔ ذیل میں ایک حدیث درج کی جاتی ہے۔

حدیث اَبِى مُوسٰى رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِىِّ ﷺ فَقَالَ : اَلرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرَى مَكَانُهٗ فَمَنْ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ ؟ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔(۲)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی (لاحق بن ضمیرہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر

---

(۲) صحیح البخاری ،کتاب الجهاد والسیر ،باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا ،رقم ۱۲۱۸

ہوئے اور عرض کیا کہ ایک شخص جنگ میں شرکت کرتا ہے غنیمت حاصل کرنے کے لئے، ایک شخص جنگ میں شرکت کرتا ہے ناموری کے لیے، ایک شخص جنگ میں شرکت کرتا ہے تاکہ اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ جائے تو ان میں سے اللہ کے راستے میں کون لڑتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جو محض اس لیے لڑے کہ اللہ ہی کا کلمہ بلند رہے۔ صرف وہی اللہ کے راستے میں لڑتا ہے۔

غرض ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی کی رضا کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے اور اس کے علاوہ کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہونا چاہیے اور یہی وہ مقصد ہے جو انسانی اعمال کو صحیح رخ فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالی کے پیغمبر اور ان کے صحابہ کرامؓ نے اسی مقصد کو اپنے پیش نظر رکھا، جس پر دنیا میں ہی ان کو رب العالمین نے خود کہہ دیا گیا کہ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ رضائے الٰہی کا حصول ہی وہ مقصد ہے جس کی کمی دیگر اخلاقی نظاموں میں نظر آتی ہے۔

(۲) نیت (عمل کی بنیاد) :

اسلام میں تمام انسانی اعمال کا دارومدار نیت یعنی دل کے ارادہ پر ہے۔ اگر نیت اچھی ہوگی تو عمل بھی اچھا ہوگا اور اگر نیت بری ہوگی تو عمل بھی برا ہوگا۔ اچھی نیت پر بھی اجر ملتا ہے اور عمل کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے جبکہ بری نیت پر کوئی گناہ نہیں اور عمل کرنے پر ایک برائی کا ہی گناہ ملتا ہے اور اگر معافی مانگ لی جائے تو اللہ تعالی معاف بھی فرما دیتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ (اٰل عمران ۳:۱۴۵)

جو دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا
ہم اس کو وہ دیں گے اور عنقریب ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ ۲:۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنے صدقے باطل نہ کرو احسان رکھ کر اور ایذا دے کر اس کی طرح
جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرے اور اللہ اور قیامت پر ایمان نہ لائے۔

نیت کی اہمیت کو واضح کرنے کے سلسلے میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

عَنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَبِىْ حَفْصٍ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ، وَاِنَّمَا لِامْرِىءٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ۔ (۳)

حضرت عمر بن خطابؓ نے بیان کیا میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ بے شک عمل کا

---

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان والنذور، النیۃ فی الایمان، رقم ۶۳۱۱

دارومدار نیت پر ہے اور انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ نیت کرے گا۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔

نیکی کے ارادہ کرنے پر بھی اجر وثواب ہے۔ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِیِّ ﷺ ،فِیْمَا یَرْوِیْ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّ وَ جَلَّ ،قَالَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ ، ثُمَّ بَیَّنَ ذٰلِكَ ،فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً ،فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰی سَبْعِمائَةِ ضِعْفٍ،اِلٰی اَضْعَافٍ كَثِیْرَةٍ،وَمَنْ هَمَّ بِسَیِّئَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْهَا ،كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ سَیِّئَةً وَاحِدَةً(۴)

حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ''اللہ تعالی نے نیکیاں اور برائیاں مقدر کر دی ہیں اور پھر انہیں صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ پس جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کر تو اللہ تعالی نے اس کے لیے اپنے یہاں دس گنا سے سات سو گنا تک نیکیاں لکھی ہیں اور اس سے بڑھا کر! اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور پھر اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالی نے اس کے لئے اپنے یہاں ایک نیکی لکھی ہے اور اگر اس نے ارادہ کے بعد اس پر عمل بھی کر لیا تو اپنے یہاں اس کے لیے ایک برائی لکھی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَo وَالَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (یونس۱۰:۲۶،۲۷)

بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنھوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اسی جیسا اور ان پر ذلت چڑھے گی، انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے چڑھا دیے ہیں وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

---

(۴)صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من هم بحسنة او بسیئة،رقم ٦١٢٦

پھر دل کوانسانی جسم میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ
كُلُّهٗ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ قَلْبُ۔(۵)

خبردار کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے وہ درست ہوتو سارا جسم درست ہوتا
ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے سن لو وہ دل ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کی حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔''(۶)

غرض اسلام میں نیت عمل کی بنیاد ہے اور اسے بہت زیادہ اہمیت بھی حاصل ہے۔نیت میں اگر اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کا وجود ہے تو اس کا عمل اس کے لیے اجر وثواب کا باعث ہے اور اگر نیت کا انحصار دکھاوا یا کوئی اور دنیاوی مقصد پورا کرنا ہے تو وہ آخرت کے لحاظ سے فائدہ مند نہیں۔چونکہ اسلام میں عمل کا اچھا یا برا ہونا اللہ تعالی کی طرف سے طے ہوتا ہے اس لیے نیت کے اچھا یا برا ہونے کا معیار بھی حکم الہی ہے۔

(۳)قوت نافذہ :

اسلام میں اخلاق صرف ظاہری عمل کا نام نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے،اور دل کی پاکیزگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان ایمان رکھے کہ کوئی علیم وخبیر ہستی ایسی ہے جو میرے دل کے رازوں سے بھی واقف ہے۔چاہے وہ ہجوم میں ہو یا تنہائی میں،رات کی تاریکی میں ہو یا دن کے اجالے میں اس کا خدا ہر وقت اس کے ساتھ ہے اور اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری چیز آخرت پر ایمان ہے جو انسان میں جوابدہی کا احساس پیدا کرتی ہے کہ اسے اپنے سے برتر،اپنے خالق و مالک کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔اس دن رشوت،سفارش،برادری کچھ کام نہیں آسکے گا۔تمام اعمال انسان کے سامنے ہوں گے۔ایک چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور ایک چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی اس کے سامنے ہوگا۔

خوف خدا اور آخرت پر ایمان ہی دراصل انسان کی وہ (اندرونی) قوت نافذہ ہیں جو خلوت میں بھی انسان کو برائی کے قریب نہیں جانے دیتیں کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے اور قیامت کے دن میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا؟اس لیے وہ زنا کے اسباب فراہم ہوتے ہوئے بھی اپنے رب سے ڈر کر زنا نہیں کرتا۔غیر اسلامی معاشروں میں رائے عامہ،سماجی دباؤ یا حکومت جلوت میں تو انسان کی حفاظت کرتے ہیں لیکن خلوت میں وہ انسان کی حفاظت نہیں کر سکتے۔یہی وجہ ہے کہ نیویارک میں بجلی بند ہونے پر بینک لوٹ لیے جاتے ہیں۔۔اسلام کی یہی وہ قوت نافذہ ہے جو اسے دنیا کے باقی اخلاقی نظاموں سے ممتاز کر دیتی ہے کیونکہ دیگر مذاہب اور فلاسفہ کے ہاں اسی قوت نافذہ کی کمی نظر آتی ہے۔

(۴)خیر وشر:

اسلام میں نیکی کے لیے **حسنة**،خیر،بر،معروف اور برائی کے لیے **سیئة**،شر،اثم اور منکر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ان میں سے سب

---

(۵)صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبراء لدینه، رقم :۵۲

(۶)علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ(لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء)ج:۶،ص:۳۱

سے جامع الفاظ معروف اور منکر ہیں۔ نبی کریمؐ نے نیکی اور برائی کی پہچان بتاتے ہوئے ارشادفرمایا:

عَنِ النَّوَاسِ بِنْ سَمْعَانَ الاَنْصَارِی قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلْقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِى صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ(۷)

حضرت نواس بن سمعانؓ انصاری سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا۔آپؐ نے فرمایا نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے سینے میں کھٹکتا ہے اور تو ناپسند کرتا ہے کہ کہیں لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع نہ ہو جائے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمد کی اصطلاح میں اس کا نام نفس لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے۔''(۸)

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ ۷۵:۲)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"**لوامه** اللام کی زبر کے ساتھ سے مشتق ہے جس کے معنی ملامت اور سرزنش کے ہیں۔نفس لوامہ سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے،یعنی جو گناہ سرزد ہوا یا عمل واجب میں کوتاہی ہوئی اس پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا اور اعمال خیر اور حسنات کے متعلق بھی اپنے آپ کو اس پر ملامت کرے کہ اس سے زیادہ نیک کام کر کے اعلیٰ درجات کیوں نہ حاصل کیے؟ غرض مومن کامل اپنے ہر عمل خیر و شر اور حسنات و سیئات میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا ہے۔گناہ یا واجب میں ملامت تو ظاہر ہے،حسنات اور نیک کاموں میں ملامت کی وجہ یہ ہے کہ اے نفس تو یہ نیکی اس سے زیادہ بھی تو کر سکتا تھا اس زیادتی سے کیوں محروم رہا؟۔اور اسی مفہوم کی وجہ سے حضرت حسن بصریؒ نے نفس لوامہ کی تفسیر نفس مومنہ سے کی ہے۔''(۹)

نفس کی تین اقسام ہیں۔**نفس امارہ،نفس لوامہ،نفس مطمئنہ**۔حضرات صوفیائے کرام نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ نفس اپنی جبلت وفطرت کے اعتبار سے امارۃ بالسوء ہوتا ہے یعنی انسان کو برے کاموں کی طرف بلانے اور اس میں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے مگر ایمان اور عمل صالح اور ریاضت و مجاہدہ سے یہ نفس لوامہ بن جاتا ہے کہ برائی اور کوتاہی

---

(۷)صحیح مسلم ،کتاب البر و الصلۃ والآداب،باب تفسیر البر والاثم،رقم :۲۵۵۳

(۸)علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ (لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶،ص:۳۴

(۹)مفتی محمد شفیع،معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن،۲۰۰۸ء) ج:۸،ص:۶۲۲،۶۲۳

پرنادم ہونے لگتا ہے، مگر برائی سے بالکلیہ انقطاع اس کا نہیں ہوتا۔آگے عمل صالح میں ترقی اور قرب حق تعالی کے حصول میں کوشش کرتے کرتے جب اس کا یہ حال ہو جائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلاف شرع کام سے طبعی نفرت بھی ہونے لگے تو اس نفس کا لقب مطمئنہ ہو جاتا ہے۔''(۱۰)

دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے متعلق ارشاد ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ o وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ(القیامۃ ۷۵:۱۴،۱۵)

بلکہ انسان اپنی جان پر باخبر ہے ۔ اگرچہ اپنے عذر (حیلے،بہانے) لا ڈالے۔

ضمیر کی اسی آواز کے متعلق نبی کریمؐ نے وابصہ بن معبد کی کچھ یوں رہنمائی فرمائی:

یَا وَابِصَةُ اَخْبِرُكَ اَمْ تسأَلُنِی ؟قُلْتُ لَا بَل اَخْبِرُنِی فَقَالَ جِئْتَ تَسْأَلُنِی عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ : نَعَمْ .فَجَمَعَ اَنَامِلَهٗ فَجَعَلَ یَنْکُتُ بِهِنَّ فِی صَدْرِیْ،وَیَقُولُ:یَا وَابِصَةُ اسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاسْتَفْتِ نَفْسَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ الْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ ،وَالْاِثْمُ :مَا حَاكَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَفِی الصَّدْرِوَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتَوْكَ(۱۱)

اے وابصہ میں تجھے آگاہ کروں یا تم مجھ سے سوال کرو گے؟ میں نے کہا نہیں بلکہ مجھے آگاہ فرمائیے۔پس فرمایا: تو نیکی کے بارے میں پوچھنے آیا ہے۔میں نے کہا ہاں۔پھر جمع فرمایا اپنی انگلیوں کے اوپر والے حصے کو پھر ان سے میرے سینے کو کریدنے لگے اور فرمانے لگے اے وابصہ اپنے دل سے پوچھ اور اپنے آپ سے فتوی لے۔تین مرتبہ آپ نے یہی فرمایا۔نیکی وہ ہے جس پر جی مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تیرے جی میں کھٹکے اور سینے میں اٹکے اگرچہ لوگوں نے تجھے فتوی دے دیا ہو اور وہ تجھے فتوی دیتے رہیں۔

جس کام کے متعلق کوئی واضح حکم نہ ہو اس کے متعلق انسان کو یقین نہ ہو کہ وہ اچھا ہے یا برا تو ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے لیے نبی کریمؐ نے ایک عمدہ کسوٹی ارشاد فرمائی۔اس سلسلے میں اسے اپنے دل سے پوچھنا چاہیے اور یہی ہمارے ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔اپنے ضمیر سے کبھی غلط جواب نہیں ملتا۔ضمیر کے اطمینان کے ساتھ کیا جانے والا عمل نیکی ہے جبکہ ضمیر کے اطمینان کے بغیر کیا جانے والا عمل گناہ ہے۔ضمیر کی رہنمائی کے بغیر ہونے والا عمل انسانی دل میں یہ خلش برقرار رکھتا ہے کہ میرا عمل گناہ ہے اور آخرت میں موجب سزا ہے۔انسان اسی ضمیر کے حوالے سے جواب دہ ہے۔اس سے متعلق رائے عامہ یا لوگوں کے فتوی کا کوئی اعتبار نہیں۔اگر اعتبار ہے تو صرف ضمیر اور دل کا ہے کیونکہ انسان خود بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

ضمیر کی تعریف:

عام طور پر ضمیر سے ہماری مراد وہ قوت حاکمہ ہوتی ہے جس کی ہم اطاعت کرتے ہیں جو ہمارے نفس کے اندر ہمارے ارادے کی نگرانی کرتی ہے۔ان اصولوں کی پاسداری اس کا وظیفہ ہوتا ہے جن کے تقاضوں پر عمل کرنا ہم پر واجب ہے۔

علماء نے ''ضمیر'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

---

(۱۰) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج:۸،ص:۶۲۳

(۱۱) مسند احمد بن حنبل، مسند العشرة المبشرین بالجنة، مسند الشامیین رقم: ۱۷۶۴۷

''ایک آواز جو دلوں کی گہرائی سے نکلتی ہے، خیر کا حکم دیتی ہے، برائی سے
روکتی ہے اگر چہ اسے کسی بدلہ کی توقع نہ ہو یا کسی سزا کا خوف نہ ہو۔''

حسن ایوب اس تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فلاسفہ اور علمائے اخلاق نے ضمیر کی جو تعریف کی ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک پہلو ہے۔ روشن پہلو وہی ہے جو ان اچھے اصولوں اور قوانین کے سامنے اسے جھکاتا ہے جنہیں انسان مقدس و محترم سمجھتا ہے، انہیں اپنی زندگی کا نظام مانتا اور راور ان کو اختیار کرنے والوں کے لیے امان قرار دیتا ہے۔ اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ یہ ضمیر ان ظالمانہ اصولوں اور فاسدانہ روایات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے جنہیں ماحول یا امت کے حالات یا جمی جمائی تقلیدی فضا اور موروثی ترکہ تشکیل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس تعریف سے ایک ایسا ضمیر بھی سامنے آتا ہے جس کے اپنے آزاد اصول ہوتے ہیں جن پر شریعت یا قانون کی قدغن نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر چوری کا جرم بعض قوموں کے نزدیک فضیلت اور خوبی سمجھی جاتی تھی اور جو شخص اس میں ماہر نہ ہوتا وہ دوسروں کی حقارت بھری نظروں اور خود اپنے ضمیر کی ملامت کا نشانہ بنتا تھا۔

اس لیے گزشتہ تعریف کے مطابق ہم اسلام پسندوں کے نزدیک ضمیر کو میزان نہیں بنایا جا سکتا جس پر کلی اعتماد کیا جا سکے۔ ہم نے دوسروں کی تقلید میں ضمیر کو آزاد رکھ چھوڑا ہے حالانکہ ہم پر واجب ہے کہ ضمیر کا وہی مفہوم متعین کریں جو شریعت نے متعین کیا ہے۔ (یعنی گناہ سے بچنے کی ایمانی طاقت کا شعور ہی اللہ تعالی کی حدود کا نگران ہے، اسی کے حکم کے مطابق انسانی دل پر حکومت کرنے والا ہے اور اللہ کی نافرمانی سے انسان کو خبردار کرنے والا ہے۔)''(۱۲)

اسلام میں صرف خود برائی سے بچنا اور نیکی کا عمل کرنا کافی نہیں بلکہ دوسروں کو نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا جاتا ہے۔ اپنے دائرہ کار میں ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اچھائی کو فروغ دینے اور برائی سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

گناہ کے اثرات بھی دل پر پڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَاَخَطِيْئَةً نُكِتَتْ فِی قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَاِذَاهُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ عَادَ زِيدَ فِيْهَا حَتّٰى تَعْلُوَقَلْبَهٗ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِیْ ذَكَرَ اللّٰهُ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ قَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حسن صحيح (۱۳)

حضرت ابو ہریرہؓ اللہ کے رسول حضرت محمدؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا بے شک بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ اور وہ زنگ ہے جسے اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ انکے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے۔ کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

---

(۱۲) حسن ایوب، مترجم عبید اللہ فہد فلاحی، اسلام کی بنیادیں (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء) ص: ۴۹۲-۴۹۷

(۱۳) **سنن ترمذی، کتاب تفسير القرآن، باب ومن سورة ويل للمطففين، رقم: ۳۳۳٤**

ایک مومن کو نیک اعمال سے خوشی جبکہ برے اعمال سے غم پہنچتا ہے۔یہی احساس اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتی ہے۔خوشی اور غم کا یہ احساس نیکی اور بدی کا فطری اور طبعی نتیجہ ہے۔اس کو انسانی اعمال کا محرک یا غرض وغایت سمجھنا غلط ہے کیونکہ غرض وغایت اللہ تعالی کی ذات اور اس کی رضا ہے۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں :

''سرور کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے،تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض وغایت نہیں بلکہ اب اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں۔''(۱۴)

قرآن مجید میں اسی نکتہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِى قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (الحجرٰت ۴۹:۷)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگا دی یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اسی آیت کی تفسیر میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِى اَمَامَةَ اَنَّ رَجُلا سَاَلَ النَّبِى صلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَا الْاِيْمَان؟قَالَ :اِذَا سَرَّتك حَسَنَتُكَ وَسَاءَ تْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤمِنٌ قَالَ يَا رَسُول اللّٰه مَا الْاِثْمُ؟قَالَ اِذَا حَاكَ فِى صَدْرِكَ شَئٌ فَدَعَهُ(۱۵)

ابوامامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جب تمہاری نیکی تمہیں خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔اس نے کہا اے اللہ کے رسول گناہ کیا ہے؟ فرمایا جب تیرے سینے میں کوئی چیز کھٹکے پس اس کو چھوڑ دے۔

اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی شامل ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے کوئی کسی دوسرے کے گناہوں کی سزا نہیں پائے گا۔اس طرح اسلام نے عیسائیت کے عقیدہ کفارہ کی بھی تردید کر دی کہ حضرت آدمؑ اور حوا کے گناہ کی وجہ سے ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔ہر بچہ جب تک بپتسمہ نہ لے پاک نہیں ہو سکتا۔عیسائیوں کے نزدیک انسان نیک اعمال کے ذریعے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔انسانی نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ یسوع مسیح لوگوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر اپنی جان کی قربانی دیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں کفارہ کے لیے(**ATONEMENT**) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کی تفصیل میں لکھا ہے:

---

(۱۴)علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ (لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء)ج:۶،ص:۳۶

(۱۵) مسند احمد بن حنبل،مسند العشرة المبشرين بالجنة،مسند الانصار، رقم۲۱۶۱۷

"Atonement is often attached to sacrifice both of which often connect moral purity and religious acceptability.The term "**Atonement**" developed in the English language in the 16th century by the combination of "at one ment" meaning " to set at one" or " to reconcile."It was used in the various English translations of the Bible,including the king James version(1611).It has been a favourite way for Christians to speak about the significance attributed to the death of Jesus Christ on the cross. In Christian orthodoxy there is no remission of sin without the sheddingof[Christ's]blood''.

''کفارہ اکثر قربانی کے ساتھ متصل ہے جن میں دونوں اکثر اخلاقی پاکیزگی اور مذہبی منظوری کے ساتھ رسمی پاکیزگی سے منسلک ہیں۔انگریزی زبان میں کفارہ کی اصطلاح نے سولھویں صدی میں (at one ment) کے ملاپ سے ترقی پائی جس کے معنی ہیں ''ایک میں قائم کرنے کے لیے'' یا ''مصالحت کرنے کے لیے''۔یہ بائیبل کے کئی انگریزی تراجم میں بھی استعمال ہوئی جس میں کنگ جیمز کا ورژن (۱۶۱۱) شامل ہے۔یہ عیسائیوں کے لیے ایک محبوب راستہ ہے کہ وہ اس اہمیت کے متعلق بات کریں جو صلیب پر یسوع مسیح کی موت سے منسوب ہیں۔عیسائی قدامت پسندی میں مسیح کے خون بہانے کے بغیر گناہ کی معافی نہیں ہوتی۔''(۱۶)

عیسائی علم عقائد میں کفارہ سے مراد یسوع کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ ایک گناہگار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔اس عقیدہ کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا دوسرے یہ کہ خدا صفت کلام (بیٹا) اس لئے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کردے۔

تھیوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"The Atonement of Christ is the sacrificial work of Jesus for sinners .In his death on the cross Christ atoned for the sins of humanity such that God is satisfied and reconciliation is accomplished for all who will be redeemed.The obedience and death of christ on behalf of sinners is the ground redemption."

''کفارہ مسیح سے مراد یسوع مسیح کی گناہگاروں کے لیے قربانی ہے۔صلیب پر اس کی موت میں مسیح کا انسانیت کے گناہوں کے لیے کفارہ ہے جیسا کہ خدا مطمئن ہے اور ان سب کے لیے جو نجات حاصل کریں گے مفاہمت مکمل ہو چکی ہے۔گناہگاروں کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کی موت اور فرمانبرداری زمینی نجات ہے۔''(۱۷)

اسی طرح ایسے مذاہب جنہوں نے تناسخ ارواح اور آواگون کا نظریہ دیا ہے انہوں نے بھی انسان کو پیدائش سے ہی گنہگار اور داغدار ٹھہرایا ہے۔انہوں نے اس کے ایک جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو سابقہ اعمال کے ہاتھ میں قید کر دیا ہے۔وہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے ہی برے اعمال سے اپنا اعمال نامہ سیاہ کر چکا ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ کفارہ کی تردید کرتے ہوئے ہر شخص کو اس کے اپنے عمل کا ذمہ دار قرار دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

---

(۱۶)(www.britannica.com/topic/atonement-religion)

(۱۷)(www,theopedia.com>atonement-of-christ).

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُوَازِرَۃٌوِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ(الانعام۶:۱۶۴)

اور جو کوئی کچھ کمائے وہ اسی کے ذمہ ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمہیں اپنے رب کی طرف پھرنا ہے وہ تمہیں بتا دے گا جس میں اختلاف کرتے تھے۔

دوسرے مقام پر اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌاِلٰی حِمْلِهَا لَايُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُواالصَّلٰوۃَوَمَنْ تَزَكّٰی فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰی لِنَفْسِهٖ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (فاطر ۳۵:۱۸)

اور کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بوجھ سے لدا ہوا (گنہگار کسی کو) اپنا بوجھ (اٹھانے) کے لیے بلائے تو وہ اس سے کچھ نہ اٹھائے گا خواہ اس کا قرابت دار ہو، آپؐ تو صرف ان کو ڈراتے (نصیحت کر سکتے ہیں) جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں بن دیکھے اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جو پاک ہوتا ہے وہ صرف اپنے لیے پاک صاف ہوتا ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔

ابن کثیرؒ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قیامت کے دن کوئی دوسرے کے گناہ اپنے اوپر نہ لے گا۔ اگر کوئی گنہگار اپنے بعض یا سب گناہ دوسرے پر لادنا چاہے تو یہ چاہت بھی اس کی پوری نہ ہوگی۔ کوئی نہ ملے گا جو اس کا بوجھ بٹائے عزیز و اقارب بھی منہ موڑ لیں گے اور پیٹھ پھیر لیں گے، گو ماں باپ اور اولاد ہو۔ ہر شخص اپنے حال میں مشغول ہوگا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں پڑوسی پڑوسی کے پیچھے پڑ جائے گا اللہ سے عرض کرے گا کہ اس سے پوچھ تو سہی کہ اس نے مجھ سے اپنا دروازہ کیوں بند کر لیا تھا؟ کافر مومن کے پیچھے لگ جائے گا اور جو احسان اس نے دنیا میں کیے تھے وہ یاد دلا کر کہے گا کہ آج میں تیرا محتاج ہوں مومن بھی اس کی سفارش کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا عذاب قدرے کم ہو جائے گو جہنم سے چھٹکارا محال ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو اپنے احسان جتائے گا اور کہے گا کہ رائی کے ایک دانے کے برابر مجھے آج اپنی نیکیوں میں سے دے دے وہ کہے گا ابا آپ چیز تو تھوڑی سی طلب فرما رہے ہیں لیکن آج تو جو کھٹکا آپ کو ہے وہی مجھے بھی ہے میں تو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ پھر بیوی کے پاس جائے گا اس سے کہے گا میں نے تیرے ساتھ دنیا میں کیسے سلوک کئے ہیں؟ وہ کہے گی بہت ہی اچھے۔ یہ کہے گا آج میں تیرا محتاج ہوں مجھے ایک نیکی دے دے تاکہ عذابوں سے چھوٹ جاؤں جواب ملے گا سوال تو بہت ہلکا ہے لیکن جس خوف میں تم ہو وہی ڈر مجھے بھی لگا ہوا ہے میں تو کچھ بھی سلوک آج نہیں کر سکتی۔'' (۱۸)

قرآن مجید کی دوسری آیت میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَامَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (لقمٰن۳۱:۳۳)

---

(۱۸) اسماعیل بن عمر، حافظ، ابوالفدا ءعمادالدین، مترجم مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ ۱۹۹۹ء) ج:۴۔ص:۳۲۰

اے لوگو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو، اور اس دن کا خوف کرو (جس دن) نہ کام
آئے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کے اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آئے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ O وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ O وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (عبس ۸۰: ۳۴، ۳۵، ۳۶)

جس دن آدمی اپنے بھائی، اور اپنی ماں، اور اپنے باپ، اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے بھاگے گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بوجھ سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اوپر لے لے اور اسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکہ معظّمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے ان سے ان کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دین آبائی پر قائم رہو، عذاب وثواب ہماری گردن پر۔ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر ومعصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بار گناہ اپنے اوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسا دلا رہے ہیں جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے منہ موڑے گا، کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔'' (۱۹)

اسلامی نقطۂ نظر سے ایسے بچے جو عاقل و بالغ ہونے سے قبل وفات پا چکے ہیں چاہے وہ کفار کے بچے ہی کیوں نہ ہوں ان پر کچھ گناہ نہیں اور وہ جنتی ہیں۔ مسلمانوں کے کم سن عمر میں وفات پانے والے بچے ان کے لیے سفارشی ہیں۔ ان کی نماز جنازہ میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ یا اللہ اس کو میرا ایسا سفارشی بنانا جس کی سفارش تیری بارگاہ میں قبول ومقبول ہو۔

حج کے عظیم موقع پر جب انسان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفَثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ (۲۰)

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور (اس حج میں) فسق وفجور سے باز رہے تو وہ ایسے لوٹتا ہے جیسے آج ہی اس کی ماں نے پیدا کیا ہو۔

---

(۱۹) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۴ء) ج: ۴۔ ص: ۲۲۸

(۲۰) **صحيح البخاری، كتاب الحج، باب فضل حج المبرور، رقم: ۱۴۴۹**

اس حدیث میں ''جیسے آج کے دن اس کی ماں نے پیدا کیا ہو'' سے یہی مراد ہے کہ وہ بغیر گناہ کے پیدا کیا گیا ہے اور جیسے ایک پیدا ہونے والے بچے کے ذمے کوئی گناہ نہیں اسی طرح ایک حاجی کے ذمے بھی کوئی گناہ نہیں۔

(۵) اسلامی اخلاق میں رہبانیت نہیں ہے:

امام راغبؒ رہبانیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ترھب (تفعل) کے معنی تعبد یعنی راہب بنے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گزاری میں غلو کرنے کو رہبانیۃ کہا جاتا ہے۔''(۲۱)

رہبانیت کو انگریزی زبان میں (Asceticism) کہا جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> The practice of the denial of physical or psychological desires in order to attain a spiritual ideal or goal.
>
> جسمانی یا نفسیاتی خواہشات کے انکار کی مشق جو ایک روحانی مثالی (انسان) یا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔(۲۲)

رہبانیت سے مراد بے رغبتی اور کنارہ کشی ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد نفسانی لذتوں کو چھوڑ کر باہمی حقوق و فرائض سے کنارہ کشی اختیار کرنا بیوی، بچوں اور معاشرتی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرکے جنگلوں اور ویرانوں میں آباد ہوکر عبادت و ریاضت، مجاہدہ نفس بلکہ نفس کشی کے ذریعے حق سے ملنے کی کوشش کرنا رہبانیت کہلاتا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ رہبانیت کے مفہوم اور تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''رہبانیت رہبان کی طرف منسوب ہے۔ راہب اور رہبان کے معنی ڈرنے والا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جب بنی اسرائیل میں فسق و فجور عام ہوگیا خصوصاً ملوک اور روسا نے احکام انجیل سے کھلی بغاوت شروع کردی ان میں کچھ علماء و صلحا تھے انہوں نے اس بدعملی سے روکا تو ان کو قتل کردیا گیا جو کچھ بچ رہے انہوں نے دیکھا اب منع کرنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں اگر ہم ان لوگوں میں مل جل کر رہے تو ہمارا دین برباد ہوجائے گا۔ اس لیے ان لوگوں نے اپنے اوپر یہ بات لازم کرلی کہ اب دنیا کی سب لذتیں اور جائز آرام بھی چھوڑ دیں، نکاح نہ کریں، کھانے پینے کے سامان جمع کرنے کی فکر نہ کریں، رہنے سہنے کے لیے مکان اور گھر کا اہتمام نہ کریں، لوگوں سے دور کسی جنگل پہاڑ میں بسر کریں، پھر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی سیاحت میں گزار دیں تاکہ دین کے احکام پر آزادی سے پورا پورا عمل کرسکیں۔ ان کا یہ عمل چونکہ خدا کے خوف سے تھا اس لیے ایسے لوگوں کو راہب یا رہبان کہا جانے لگا۔ ان کی طرف نسبت کرکے ان کے طریقہ کو رہبانیت سے تعبیر کرنے لگے۔''(۲۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ طرز زندگی راہ حق کے متلاشیوں نے خود شروع کیا تھا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔

---

(۲۱) امام راغب اصفہانی، مترجم مولانا محمد عبدہ، مفردات القرآن (لاہور: اہل حدیث اکادمی، ۱۹۷۱ء) ص: ۴۱۶

(۲۲) (www.britannica.com/topic/asceticism)

(۲۳) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج: ۸، ص: ۳۳۶، ۳۳۷

وَرَهۡبَانِيَّةَ نِ ابۡتَدَعُوهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ (الحدید ۵۷:۲۷)

اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی اسے ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر (انہوں نے رہبانیت کی یہ بدعت) محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے (شروع کی تھی)۔

ڈاکٹر محمد نواز چوہدری رہبانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بدھ مت رہبانیت کا دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو دنیا ترک کرنے کا درس دیتا ہے۔ بدھ کی تمام تر تعلیمات کی بنیاد ترک دنیا اور نفس کشی پر ہے۔ چونکہ ''نروان'' نفس کشی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے وہ سخت ریاضتیں تجویز کرتا ہے۔ مثلاً داڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کو نوچنا تاکہ غرور حسن خاک میں مل جائے۔ کانٹوں یا کیلوں کے بستر پر لیٹنا، بدن پر خاک ملنا جو تعذیب نفس کی صورت ہے، عورت اور مرد کے فطری تعلق سے پرہیز ، کسی جاندار کو ہلاک کرنے سے اجتناب۔ علاوہ ازیں نئے کپڑے نہ پہننا بلکہ کوڑے پر پڑے ہوئے چیتھڑے یا قبرستان کے مردوں کے کفن اتار کر پہننا۔'' (۲۴)

سید سلیمان ندویؒ رہبانیت کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے آپ کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال ، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملت کے فرائض و حقوق کو بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں۔'' (۲۵)

اسلام میں رہبانیت جیسی بے جا مشقتوں کو برداشت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ قرآن و سنت کی اتباع کے ذریعے اس دنیا میں رہ کر کاروبار زندگی کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے قرب الٰہی کی منزل پا سکتے ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكَاةِ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ (النور ۲۴:۳۷)

وہ لوگ (جنہیں) کوئی تجارت اور نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے اور زکوۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔

قرآن مجید معاشرتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عمل صالح کا درس دیتا ہے اور اس میں ترک دنیا یا رہبانیت کے لیے کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح فرمایا:

---

(۲۴) پروفیسر محمد نواز چودھری، مطالعہ مذاہب عالم (لاہور: پولیمر پبلیکیشنز، ۲۰۰۱ء) ص ۱۹۹

(۲۵) علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندویؒ، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۶، ص: ۴۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)

اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی نبوت کی ۲۳ سالہ زندگی میں رہبانیت کو اختیار نہیں فرمایا بلکہ آپ نے رہبانیت کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ الْاِمَامُ رَاعٍ وَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِی اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، وَالْمَرْءَةُ رَاعِيَةٌ فِی بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی نگرانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حاکم نگران ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں سوال ہوگا اور آدمی اپنے گھر والوں پر نگران ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے باری میں سوال کیا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگران ہے اور اس سے اس کی نگرانی کے بارے میں سوال ہوگا۔ (۲۶)

اسلام میں اخلاق تو باہمی حقوق وفرائض ادا کرنے کا نام ہے اور رہبانیت ان فرائض سے جان چھڑانے کا نام ہے۔ لہذا رہبانیت کا اخلاق اور اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں رہبانیت کا کوئی وجود نہیں۔ کمال یہ نہیں کہ دنیا سے بھاگ کر نفس کو دنیاوی آلائشوں سے پاک رکھا جائے بلکہ کمال یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان اپنے رب اور اپنی حقیقت کو نہ بھولے اور تمام فرائض بحسن خوبی انجام دے۔

(۶) توسط واعتدال:

اسلام کا تصور اخلاق توسط واعتدال پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل ہیں اور کائنات کے نظام کو عدل کی بنیاد پر چلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی معاملات میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں اگر عدل کی تاکید کی گئی تھی تو حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں احسان کی تعلیم دی گئی تھی۔ اسلام نے عدل اور احسان دونوں کی تعلیم دے کر اخلاقی لحاظ سے ایک معتدل نظام پیش کیا ہے۔ اس امت کو قرآن مجید میں امت وسط یعنی اعتدال والی امت کہا گیا۔ امام غزالیؒ نے انسانی خصلتوں میں اعتدال کو حسن اخلاق کا نام دیا ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> ''حضور اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے انسان کے فکری اور مذہبی سرمائے میں چند رویوں کا غلبہ تھا۔ اگر ایک طرف خوف تمام رویوں کو متعین کرتا تھا تو دوسری طرف امید ومسرت کے جذبے رہنمائی کرتے تھے۔ اس طرح ایک طرف انتقام مسلمہ اصول تھا جس سے اجتماعی زندگی منضبط ہوتی تھی تو دوسری طرف عفو ودرگزر تھا جو فرد کی اخلاقی عظمت کی معراج متصور ہوتا تھا۔ افراد اور معاشرے انہی رویوں اور اصولوں کی بنیاد پر پہچانے جاتے اور منظّم ہوتے۔ اسلام نے خوف ورجا اور انتقام وعفو کے درمیان اعتدال کی راہ کو ایک اخلاقی اصول کے طور پر متعارف کرایا اور انسانوں کو انتہا پسندانہ رویوں اور یک رخے رجحانات سے نجات دلائی۔ توسط واعتدال کا اصول اخلاقی زندگی کی روح اور انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔'' (۲۷)

---

(۲۶) صحیح البخاری، کتاب الجمعه، باب الجمعة فی القریٰ والمدن رقم: ۹۰۱

(۲۷) ڈاکٹر خالد علوی، انسان کاملؐ (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۱ء) ص: ۵۹۱

سید سلیمان ندویؒ اسلام کے تصور اخلاق میں توسط و اعتدال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عدل قانون اور احسان اخلاق ہے۔اس جامعیت کا اصول شریعت محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے،ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔'' وہ مزید لکھتے ہیں:

''اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے،قانون کے تحت میں رکھا مثلاً قتل،سرقہ،رہزنی،تہمت لگانا،چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومت اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس سے متعلق تھیں ان کو اخلاق کے دئرہ میں رکھا مثلاً جھوٹ نہ بولنا،رحم کھانا،غریبوں کی امداد وغیرہ۔اس طرح شریعت محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔''(۲۸)

غرض اسلام نے اخلاق کا ایک ایسا معتدل نظام دیا جو معاشرے کے ہر فرد،ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے مناسب ہے۔اس میں خوف اور امید،عفو اور انتقام،عدل اور احسان کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔تاہم اسلام میں امید،عفو،احسان اور برائی کے بدلے نیکی کرنے کی تعلیم نمایاں ہے۔

(۷) اخلاق کی مکمل تعلیم :

دیگر مذاہب اور فلاسفہ کے اخلاقی فلسفے جزوی ہیں لیکن اسلام کا فلسفہ اخلاق کلی ہے۔اخلاق،اسلام کا دوسرا نام ہے۔اسلام ایک مکمل دین ہے اور اس کی تمام تر تعلیمات اکمل اور کامل ہیں۔نبی اکرم حضرت محمدؐ کی رسالت کی خصوصیات میں کاملیت شامل ہے۔اس لیے اسلام کی اخلاقی تعلیمات بھی مکمل ہیں اس کے برعکس دیگر مذاہب کی اخلاقی تعلیمات نامکمل اور مختصر ہیں'' مثلاً عقیدہ توحید کی دعوت تمام مذاہب نے دی ہے لیکن کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور مظاہر کا مکمل تعین نہیں کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سوا دیگر تمام مذاہب میں شرک کسی نہ کسی شکل میں شامل ہو گیا ہے۔لیکن اسلام نے شرک کے اسباب اور اثرات کو روکا۔اس زمانے میں بت پرستی کے ذریعے شرک کیا جاتا تھا۔نبی اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر بتوں کو توڑا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بتوں کی یاد تازہ کرنے والی ہر چیز سے منع فرمایا مثلاً تصویر جو بذات خود بری چیز نہیں تھی لیکن چونکہ وہ بت پرستی کی ایک قبیح صورت تھی اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے اور اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندویؒ کے نزدیک آنحضورؐ نے اخلاق کی تکمیل تین طرح سے فرمائی ہے۔

(۱) تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ (۲) ہر برائی اور بھلائی کی ساری جزیات کا احاطہ

(۳) نرمی و گرمی،عاجزی و بلند ہمتی،دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔(۲۹)

---

(۲۸) علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ (لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶ ص:۵۴

(۲۹) علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ (لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶ ص:۶۴

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ انہوں نے صداقت کے ایک جزو کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے، اس لیے جزو کے کل بننے میں جس قدر زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لیے لامحالہ انہیں باطل کے بہت سے اجزا لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ اور ناقص تھیں۔'' (۳۰)

مولانا مودودی کے نزدیک :

اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب ہیں۔ ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان۔ (۳۱)

(۸) وسعت اور جامعیت :

اسلام کی اخلاقی تعلیمات ہمہ گیر، جامع اور وسیع ہیں۔ یہ ہر فرد، ہر قوم، ہر علاقے اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔ اسلام میں اخلاق کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں خون کو حاصل ہے۔ یعنی خون جیسے جسم کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے اور گردش کرتا رہتا ہے اسی طرح اخلاق بھی اسلام کی تمام تر تعلیمات میں پایا جاتا ہے۔ یہ تعلیمات خواہ عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات سے، معاشرت سے متعلق ہوں یا معیشت سے، معاملات سے متعلق ہوں یا سیاست سے ان میں کسی نہ کسی صورت میں اخلاقی پہلو موجود ہے۔ زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے پر اخلاق کا ہمہ گیر اثر موجود ہے۔ اس کے برعکس دیگر غیر اسلامی اخلاقی نظام اخلاق کو انسان کی انفرادی زندگی تک محدود کر دیتے ہیں یا چند معاشرتی معاملات تک پھیلا دیتے ہیں۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے۔ یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔'' (۳۲)

(۹) اسلام میں اخلاق حسنہ کی فضیلت واہمیت:

اسلام میں اخلاق حسنہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اخلاق کی بنیاد ایمان اور عمل صالح پر رکھی گئی ہے۔ اسلام اچھے اخلاق کو اختیار کرنے اور برے اخلاق سے اجتناب کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام اخلاق حسنہ کو عمل صالح قرار دے کر اس پر اجر کا وعدہ کرتا ہے اور برے اخلاق کو گناہ قرار دے کر جرم و سزا کا باعث قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کی اکثر آیات میں یہ اعلان بڑے واضح انداز میں کیا گیا ہے کہ اچھے اخلاق اور ان کو اختیار کرنے والے کو اللہ رب العزت پسند فرماتے ہیں جبکہ برے اخلاق اور ان کو اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتے ہیں۔

---

(۳۰) سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۵) ص: ۱۳۶

(۳۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۵) ص: ۱۶۶

(۳۲) علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندویؒ، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج: ۶: ص: ۶۳، ۶۴

اخلاق حسنہ اللہ تعالی کی صفات میں سے ہے اسی لیے وہ اپنے بندوں کو بھی اچھے اخلاق کا درس دیتے ہیں۔ مثلا اللہ تعالی خود عادل ہیں اور عدل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالی خود سب سے زیادہ سچے ہیں اور اپنے بندوں کو سچ بولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالی معاف کرتے ہیں اور معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے ظلم کو اپنے اوپر اور اپنے بندوں کے درمیان حرام کر دیا ہے۔ عباد الرحمٰن کی صفات ہوں یا کامیاب مومنوں کی صفات وہ ایمان کے ساتھ اعلی اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ اسلام میں عقائد اور عبادات کے بعد اخلاق کا درجہ ہے بلکہ بعض مواقع پر اخلاق کو عبادات پر فوقیت دی گئی ہے چنانچہ حقوق العباد میں حق تلفی کی معافی اللہ تعالی نے اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے اس بندے کے اختیار میں رکھی ہے جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔

اخلاق کو اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک آنے والے ہر نبی نے اچھے اخلاق کو اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے اور دنیا میں آج جہاں کہیں بھی اخلاق کی کوئی روشنی نظر آتی ہے وہ انہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی وجہ سے ہے۔ سید سلیمان ندویؒ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

> اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی نیکی کی روشنی اور اچھائی کا نور ہے جہاں کہیں بھی خلوص اور دل کی صفائی کا اجالا ہے ،کیا وہ صرف انہی بزرگوں کی تعلیم اور ہدایت کا نتیجہ نہیں جن کو تم انبیائے کرام کے نام سے جانتے ہو؟ پہاڑوں کے غار، جنگلوں کے جھنڈ، شہروں کی آبادیاں غرض جہاں بھی رحم انصاف غریبوں کی مدد یتیموں کی پرورش اور نیکیوں کا سراغ ملتا ہے، اسی برگزیدہ جماعت کے کسی نہ کسی فرد کی دعوت اور پکار کا دائمی اثر ہے۔ (۳۳)

دیگر انبیا کی طرح اخلاق کی تعلیم کو حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کی بعثت سے اچھے اخلاق کی تکمیل ہوئی۔ آپؐ نے اپنی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ

میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (۳۴)

ابوذر غفاریؓ کے بھائی انیس نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد کہا کہ:

رَاَیْتُهٗ یَامُرُ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ

میں نے انہیں اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے دیکھا۔ (۳۵)

آپؐ نے اللہ تعالی سے حسن اخلاق کو طلب کیا۔ ایک طویل دعا میں آپؐ نے ان الفاظ کے ساتھ حسن اخلاق مانگا:

واھد نی لا حسن الاخلاق لا یھدی لا حسنھا الا انت،

واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت

---

(۳۳) سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس (لاہور: ادارہ مطبوعات طلبہ، ۱۹۹۵) ص: ۱۳

(۳۴) موطا لامام مالك،كتاب حسن الخلق باب ما جاء من حسن ا لخلق رقم : ٨

(۳۵) مسلم، كتاب فضائل الصحابه ،مناقب ابی ذر ٢٤٧٤

میرے رب میری سب سے اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی فرما تیرے سوا اچھے اخلاق کی راہ کوئی نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے اور انہیں تیرے سوا کوئی اور دور نہیں کر سکتا۔(۳۶)

نبی کریم ﷺ نے تمام انسانوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے کی تعلیم دی اس سلسلہ میں ارشاد نبویؐ ہے:

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبْ بِنْ جُنَادَة وَاَبِی عَبْدِا لرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ اور ابوعبدالرحمٰن معاذ بن جبلؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرو اور گناہ کے بعد نیکی کر لیا کرو وہ نیکی اس گناہ کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیا کرو۔(۳۷)

قیامت کے دن ایک مومن کے نامہ اعمال میں سے اچھے اخلاق سب سے زیادہ وزنی چیز ہوگی:

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا شَیْءٌ اَثْقَلُ فِی مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ وَاَنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ

حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مومن کے ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہوگی اور اللہ تعالی منہ پھٹ فحش گو کو ناپسند کرتا ہے ۔(۳۸)

اچھے اخلاق سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَکْمَلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِھِمْ خُلُقًا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومنوں میں سے سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ ہے جو ان میں سے اخلاق میں اچھا ہے اور تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے اخلاق میں اچھا ہے۔(۳۹)

---

(۳۶)مسلم کتاب صلاۃالمسافرین وقصرھا ،باب الدعاء فی صلاۃ الیل وقیامه رقم ۷۷۱

(۳۷)سنن ترمذی ،کتاب البر والصلة رقم ۱۹۱۸۷

(۳۸)سنن ترمذی کتاب البر والصلة عن رسول الله ﷺ،باب ما جاء فی حسن الخلق ،رقم ۲۰۰۲

(۳۹)سنن ترمذی ،کتاب الرضاع،باب ما جاء فی حق المرءۃعلی زوجھا ،رقم ۱۱۶۲)

مَـا مِنْ شَـی ءٍ یُـوْضَـعُ فِـی الْمِیْـزَانِ اَثْـقَـلُ مِـن حُسْنِ الْخُلُقِ فَـاِنَّ صَـاحِـبَ حُسْـنِ الْـخُـلُـقِ لَیَبْـلُـغُ بِـهٖ دَرَجَةَ صَـاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلٰوۃِ

(قیامت کے)ترازو میں اچھے اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی حسن خلق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔(۴۰)

اچھے اخلاق کی وجہ سے ایک مومن روزہ دار اور نمازی کا مرتبہ پالیتا ہے۔

عَـنْ عَـائِشَةَ رَحِـمَهَـا اللّٰـهُ قَـالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَـقُـوْلُ اِنَّ الْـمُـؤْمِـنَ لَیُـدْرِكُ بِـحُسْـنِ خُـلُـقِـهٖ دَرَجَةَ الـصَّـائِـمِ الْـقَـائِـمِ

حضرت عائشہ اللہ ان پر رحم کرے سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مومن اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے روزہ دار اور نمازی کا درجہ پالیتا ہے۔(۴۱)

آپؐ نے اچھے اخلاق کو معیار فضیلت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ خِیَـارَكُـمْ اَحَـاسِـنَـكُـمْ اَخْلَاقًـا

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔(۴۲)

دوسری روایت میں ہے:

اِنَّ مِـنْ اَخْیَـرِكُـمْ اَحْسَـنَـكُـمْ خُـلُـقًـا

بے شک تم میں سے بہتر وہ ہے جو تم میں سے اخلاق کے لحاظ سے اچھا ہے۔(۴۳)

حضرت محمدؐ نے اچھے اخلاق کو بہترین عطیہ قرار دیا، ایک حدیث میں ہے:

قَـالُـوْا یَـا رَسُـوْلَ الـلّٰـهِ مَا خَیْرَ مَا اُعْطِیَ الْاِنْسَانُ؟قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ

انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول انسان کو جو دیا گیا ہے اس میں سے بہتر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اچھے اخلاق۔(۴۴)

---

(۴۰)ترمذی ،کتاب البروالصلة عن رسول الله ﷺ ،باب ما جاء فی حسن الخلق،رقم ۲۰۰۳)

(۴۱)سنن ابی داود .کتاب الادب باب فی حسن الخلق،رقم ٤٧٩٨

(۴۲)صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق واسخاء وما یکره من البخل، رقم ٥٦٨٨

(۴۳)صحیح بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا،رقم ٥٦٨٢

(۴۴)المستدرك علی الصحیحین،کتاب الطب،خیر ما اعطی الانسان خلق حسن رقم ٢٦٧

ایک حدیث میں اللہ کے رسول کے قرب کے ذریعہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

عَنْ جَابِر اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اِلَیَّ وَ اَقْرَبِکُمْ مِنِّی مَجْلِسًا یَوْ مَ الْقِیَامَۃِ اَحَاسِنَکُمْ اَخْلَاقًا ،وَاِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَکُمْ مِنِّی مَجْلِسًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَلثَّرْثَارُوْنَ وَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَیْہِقُوْنَ (۴۵)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں میرا سب سے زیادہ محبوب اور آخرت میں نشست میں مجھ سے زیادہ قریب وہ ہیں جو تم میں اخلاق کے اچھے ہیں اور بے شک مجھے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن نشست میں مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو زیادہ باتیں کرنے والے باچھیں کھول کر طویل گفتگو کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہوں گے۔

غرض اسلام میں اخلاق حسنہ کو خاص اہمیت اور مقام حاصل ہے۔ایک مومن کو اچھے اخلاق کی وجہ سے جو بلند مقام حاصل ہوتا ہے وہ درج بالا احادیث سے ثابت ہے۔اس لیے اہل ایمان کو اچھے اخلاق اختیار کرنے چاہئیں تا کہ دنیا و آخرت کے فوائد سے ہمکنار ہو سکیں۔

---

(۴۵)سنن ترمذی ،کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہ ﷺباب ما جاء فی معالی الاخلاق رقم۲۰۱۸

(۲)اسلام کا فلسفہ احکام:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علم الاحکام کی تعریف اس طرح کی ہے:

علـم الاحـکـام : وهي الواجب والمندوب والمباح والمكروه والحرام سواء كانت من قسـم الـعـبـادات ،اومـن قسـم الـمـعـامـلات او مـن تـدبـيـر مـنـزل او من سياسة المدنية وتفصيل هذا العلم منوط بذمة الفقيه(۱)

علم الاحکام سے مراد واجب، مندوب، مباح ،مکروہ اور حرام ہے چاہے یہ (پانچوں) عبادات یا معاملات سے تعلق رکھتے ہوں یا گھریلو اور ملکی معاملات سے متعلق ہوں ،اور اس علم کی تفصیل کرنا فقیہ کی ذات سے وابستہ ہے۔

شیخ محمد خضری بک عنوان ''قرآن کے مضامین'' کے تحت لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے تین چیزوں کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے

(۱) اللہ، فرشتوں، آسمانی کتابوں، پیغمبروں اور روز قیامت سے متعلق عقائد و احکام، اس قسم کے مباحث علم الکلام کا موضوع ہیں۔

(۲) وہ احکام جو قلب کے افعال سے متعلق ہیں مثلاً فضائل اخلاق و عادات یہ چیزیں علم اخلاق (تصوف) کا موضوع ہیں۔

(۳) وہ احکام جو اعضاء و جوارع کے افعال سے متعلق ہیں شریعت نے کس چیز کا حکم دیا ہے؟ کس سے روکا ؟ کس کی اجازت دی ہے؟ یہ قسم علم فقہ کا موضوع ہے۔'' (۲)

قرآن کریم کا دوسرا موضوع ''احکام'' ہے۔ قرآن مجید میں بندوں کو مختلف احکام کا مکلّف کیا گیا ہے:

(۱) پہلی قسم کے احکام تو وہ ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں یہ براہ راست اللہ اور بندے کا معاملہ ہے، ان کے صحیح ہونے کے لیے نیت بھی ضروری ہے۔ پھر ان عبادات کی بھی تین قسمیں ہو جاتی ہیں ایک تو وہ جو خالص عبادات ہیں مثلاً نماز اور روزہ، دوسری وہ عبادت جو مالی بھی ہے اور اجتماعی بھی، یہ زکوۃ ہے، تیسری وہ جو بدنی ہے اور اجتماعی ہے یہ حج ہے ،یہ ان چار عبادتوں کو ایمان کے بعد اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے ۔

(۲) دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جو انسانوں کے باہمی معاملات سے متعلق ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہیں:

(الف) وہ احکام و قوانین جو دعوت اسلام کے تحفظ سے متعلق ہیں یعنی جہاد کے احکام

(ب) خاندانی احکام، جو نکاح، طلاق، نسب اور وراثت پر مشتمل ہیں

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شارح مفتی محمد امین، الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر (کراچی، دارالاشاعت، ۲۰۰۷) ص:۸۴

(۲) شیخ محمد خضری بک، مترجم مولانا حبیب احمد ہاشمی، تاریخ فقہ اسلامی (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۸ء) ص:۳۲

(ج) وہ احکام جن میں لوگوں کے باہمی معاملات سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً خرید وفروخت، اجارہ وغیرہ اسی قسم کو اصطلاح میں معاملات کہتے ہیں۔

(د) تعزیری احکام : جن میں قصاص اور حدود کے احکام شامل ہیں۔(۳)

آپؐ کی بعثت چونکہ ملت ابراہیمی پر ہوئی اس لیے تمام مسائل واحکام میں ملت ابراہیمی کے اصول وقواعد کو قائم رکھا گیا۔ ہر حکم کسی حکمت یا مصلحت کے تحت نازل کیا گیا۔ ملت ابراہیمی کی تحریف شدہ عبادات کی اصلاح کی گئی۔ یہ احکام قرآن مجید میں مختصراً بیان کیے گئے ہیں ان کی تفصیل حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ ان احکام کے نزول کے مختلف اسباب یا صورتیں تھیں۔ کبھی آپؐ سے کوئی سوال کیا گیا تو حکم نازل ہوا اور کبھی کسی خاص واقعے سے متعلق حکم نازل کیا گیا۔ اسے سبب نزول اور شان نزول بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے احکام جو کسی واقعے سے متعلق ہیں ان کو سمجھنے کے لیے متعلقہ واقعہ کا علم ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی پانچ سو آیات احکام شرعیہ سے متعلق ہیں۔

یہ احکامات اس انسانی عقل کے عین مطابق ہیں جو خواہشات نفس سے آزاد ہو کر وحی الٰہی کی پابند ہو اور اپنے دائرہ کار سے آگاہ ہو۔ اسی کو عقل سلیم بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی حکمت، مصلحت اور فائدہ موجود ہے لیکن ان سب کا احاطہ کرنا انسانی عقل کے بس میں نہیں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو ان احکامات کی تعلیم اور تفہیم کے لیے بھیجا۔

ایک حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے حکمت اور مصلحت پر نہیں ہوتا۔ مثلاً حرمت شراب میں علت نشہ جبکہ حکمت لوگوں کو حواس کھو کر برے کاموں سے بچانا ہے۔ اب نشہ کی علت جس چیز میں پائی جائے گی وہ حرام ہوگی۔ بہت سے علماء نے اسلامی احکام کی حکمتوں کو واضح کرنے کے لیے باقاعدہ کتابیں بھی لکھی ہیں مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے شرعی احکام کی حکمتوں کو واضح کرنے کے لیے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ان لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے جو شرعی احکام کی حکمتوں کا انکار کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

> ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی اور اعمال اور ان کی جزائیں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت سے تکلیف کرنا بعینہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کو چھونے کا حکم دے، جس میں بجز آزمائش کے کچھ فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پائے اور سرکشی کرے تو سزا دی جائے۔ یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کے اجماع جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے، اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔''(۴)

اسی طرح وہ لکھتے ہیں:

---

(۳) شیخ محمد خضری بک، مترجم مولانا حبیب احمد ہاشمی، تاریخ فقہ اسلامی (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۸ء) ص:۵۷

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مترجم مولانا عبدالحق حقانی، حجۃ اللہ البالغہ اردو (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۱) ص:۱۹

> ''ایسے ہی علم حدیث نے یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ جب کوئی حکم شرع بروایت صحیح ثابت ہو جائے تو اس کی تعمیل کو مصلحت کے معلوم ہونے پر موقوف نہ رکھے۔ اکثر عقلیں عموماً مصلحتوں کو اپنے بل پر معلوم نہیں کر سکتی ہیں اور نیز ہم کو اپنی عقلوں پر اعتماد نہیں ہے جتنا کہ آنحضرت ﷺ پر ہے۔ اس لیے ان لوگوں پر اس علم کا اظہار نہیں کیا گیا جو اس کے اہل نہیں تھے۔ اس علم کی بھی وہی شرائط ہیں جو کتاب الٰہی کی تفسیر کی ہیں۔ بغیر سند حدیث کے محض اپنی رائے سے اس میں خوض کرنا حرام ہے۔'' (۵)

غرض شرعی احکام کی اطاعت کا اصل مقصد ان احکام کی حکمت اور مصلحت معلوم کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔

ایک واضح حکم کے بعد عقلی دلائل کی ضرورت نہیں رہتی۔ ابلیس نے ایک واضح حکم الٰہی کے جواب میں عقلی دلیل دینا شروع کر دی جس پر وہ رحمت الٰہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ شرعی احکامات کی اتباع کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان واضح احکامات کو اپنے واضح مفہوم میں اختیار کیا جائے اور اپنی نفسانی خواہشات کے لیے ان میں تاویل یا تحریف نہ کی جائے۔ اپنی خواہشات کے مطابق تشریح خواہشات نفس کی پیروی ہوگی۔ اس لیے کتاب اللہ کے احکامات کی پیروی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

حضرت محمدؐ کی نبوت و رسالت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالمگیر ہے۔ آپؐ ہر زمانے ہر علاقے اور اقوام عالم کے نبی ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید بھی ایک عالمگیر کتاب ہے جو تمام انسانوں اور زمانوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔ قرآن وسنت کے واضح اور صریح احکامات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہر زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے۔ بعض احکامات میں چند اہم اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے ان کی جزوی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ اس لیے ہر دور کے اہل علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی جزوی تفصیلات سے آگاہ کرتے رہیں۔

اللہ رب العزت احکام الٰہی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

> **وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۳۱)**
>
> احکام الٰہی کو ہنسی کھیل نہ سمجھو اور اللہ نے تم پر جو احسان کیے ہیں ان کو یاد کرو۔ اس کا یہ احسان بھی نہ بھولو کہ اس نے تم پر کتاب اور عقل کی باتیں اتاری ہیں اور منظور یہ ہے کہ تمہیں ان حکموں یا کتاب کے ذریعے سے نصیحت کرے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔

اخلاقی احکام:

اخلاقی احکام سے مراد وہ احکامات ہیں جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہیں۔ ان کا تعلق انسان کے ارادی اعمال سے ہے بغیر ارادہ کے سرزد ہونے والے اعمال پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

---

(۵) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مترجم مولانا عبدالحق حقانی، حجۃ اللہ البالغہ اردو (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۱) ص:۲۲

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَا اَخۡطَاتُمۡ بِهٖ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ (الاحزاب ۵:۳۳)

تم سے جو غلطی (یعنی نادانستہ اور بغیر ارادے کے) ہو جائے اس کی وجہ سے تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا

البتہ جو بات تم اپنے دلوں کے ارادے سے کرو (اس پر گناہ ہے)۔

عقائد وعبادات سے متعلق احکام کے بعد اسلام میں اخلاقی احکام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اسلام میں اخلاق کی طرح اخلاقی احکام بھی دو اقسام پر مشتمل ہیں ۔ان احکامات کی ایک قسم اچھے اخلاق سے متعلق ہے ۔اچھے اخلاق اصطلاحا معروف بھی کہلاتے ہیں۔یہ احکامات عدل ،احسان،تقوی،تزکیہ نفس،ایثار وغیرہ کی تفصیل سے متعلق ہیں۔اللہ تعالی نے انسانوں کو ہمیشہ اچھے اخلاق اختیار کرنے ان کو معاشرے میں فروغ دینے کا حکم دیا ہے۔قرآن وسنت میں ہمیشہ اچھے اخلاق پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے مثلا اللہ تعالی نے تزکیہ نفس،تقوی،عدل،احسان اور دیگر اچھے اخلاق کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ان احکامات کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان پر عمل کرنے سے اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوتی ہے۔مثلا اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (البقرہ ۱۹۵:۲) ترجمہ: بیشک اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ (البقرہ ۲۲۲:۲) ترجمہ: بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ (اٰل عمران ۱۵۹:۳) ترجمہ: بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ (ال عمران ۱۴۶:۳) ترجمہ: اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔

اخلاق حسنہ اللہ تعالی کے نزدیک قابل تعریف ہیں۔ان اخلاقی احکام پر عمل کرنے کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں کیا گیا۔مثلا عدل ہے تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کو بھی حقوق دیے گئے ہیں۔اسلام انہیں ہر قسم کی مذہبی آزادی دیتا ہے اور انہیں جان ومال کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی دوسری قسم اخلاق رذیلہ کو ترک کرنے سے متعلق ہے ۔برے اخلاق کو اصطلاحا منکر بھی کہا جاتا ہے ۔یہ احکامات گناہ،جھوٹ،فضول خرچی،بخل،قتل،چوری،غیبت اور بہتان وغیرہ کو چھوڑ دینے سے متعلق ہیں۔اللہ تعالی نے انسانوں کو ہمیشہ برے اخلاق ترک کرنے اور ان سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔معاشرے کے دیگر افراد کو برے اخلاق سے بچانے کی تعلیم دی گئی ہے۔اسلام نے ہمیشہ برے اخلاق کی مذمت کی ہے اور انہیں انسان کی معاشرتی زندگی کے لیے تباہ کن قرار دیا ہے۔جھوٹ اللہ کی رحمت سے محروم کر دیتا ہے،سود اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ ہے۔اسی طرح بخل،فضول خرچی،قتل ناحق،قتل اولاد اور دیگر برے اخلاق کی مذمت کی گئی ہے۔اسلام نے خاص کر ان اخلاق رذیلہ کی مذمت اور تدارک کیا ہے جو اسلام سے قبل عربوں کے معاشرے میں موجود تھے اور ان کے رسوم ورواج بن چکے تھے۔امت مسلمہ کو ان برائیوں کے اسباب سے بھی منع کیا گیا ہے اور یہی اسلام کی خوبی ہے کہ وہ معاشرتی طور پر برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکتا ہے۔ان برے اخلاق کو اللہ تعالی ناپسند فرماتے ہیں اور جو ان برائیوں پر عمل کرتا ہے اللہ تعالی اسے بھی ناپسند کرتے ہیں۔ارشاد الہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ (البقرہ ۱۹۰:۲) ترجمہ: اللہ تعالی حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ (البقرہ ۲۰۵:۲) ترجمہ: اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ (ال عمران ۱۴۰:۳) ترجمہ: اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ (الانفال ۵۸:۸) ترجمہ: بے شک اللہ تعالی خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

ان اخلاقی احکام کا مقصد ایک صالح اور مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے۔جیسے اللہ کے رسول حضرت محمدؐ نے قائم کیا۔جہاں عدل کی حکمرانی تھی ۔مسلمان خود بھوکے اور پیاسے رہتے تھے لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کو کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تھے۔ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا درد محسوس کرتا تھا

۔ہرایک سے مساوی سلوک کیا جاتا تھا۔رنگ،نسل یا وطن کی بنیاد پر کسی کو فضیلت حاصل نہ تھی بلکہ تقوی معیار فضیلت تھا۔

یہ اخلاقی احکام قرآن مجید میں جامع ،وسیع ،عام فہم ،سلیس اور مختصر انداز میں بیان کیے گئے ہیں ۔قرآن مجید کا ایک بہت بڑا حصہ اخلاقی احکام پر مشتمل ہے۔اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ایک موقع پر جامع انداز میں اخلاقی احکام دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًاوَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوْا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَاتَقْتُلُواالنَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَo وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًااِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ oوَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيْمًافَا تَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْاالسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o(الانعام۶:۱۵۱،۱۵۲،۱۵۳)

فرمادیجیے کہ آو میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کونسی باتیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو،ہم تمہیں بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، چاہے وہ بے حیائی کھلی ہو یا چھپی ہوئی اور جس جان کو اللہ نے حرمت عطا کی ہے اسے کسی برحق وجہ کے بغیر قتل نہ کرو۔لوگو یہ ہیں وہ باتیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے تا کہ تمہیں کچھ سمجھ آئے اور یتیم جب تک پختگی کی عمر کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو (اس کے حق میں) بہترین ہو اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو (البتہ) اللہ کسی بھی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا اور جب کوئی بات کہو تو انصاف سے کام لو چاہے معاملہ اپنے قریبی رشتہ دار ہی کا ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو لوگو! یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔اور (اے پیغمبرؐ! ان سے) یہ بھی کہو کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہذا اس کے پیچھے چلو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔لوگو یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے تا کہ تم متقی بنو۔

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر بائیس سے چالیس تک اخلاقی احکام کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں مذکور اخلاق حسنہ سے متعلق احکام کی فہرست:

سچ بولنا۔عفو ودرگزر۔توکل۔صبر۔شکر۔دین پر استقامت ۔اللہ تعالی کی راہ میں شہادت۔صدقہ وخیرات کا حکم۔میانہ روی اختیار کرنے کا حکم۔والدین،اولاد،زوج،رشتہ داروں،یتیموں مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک۔مسافروں،سائلوں اور غریبوں کی مدد کرنے کا حکم،غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم۔امانت داری۔ایفائے عہد۔معاہدات کی پاسداری،اچھی بات کرنے کا حکم،لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا،ملاقات کے وقت سلامتی کی دعا دینا،عدل، سچی گواہی دینا،نرمی سے بات کرنا،صلح جوئی،اتحاد واتفاق،حلال کمانا اور کھانا،محنت کرنا،تجارت کرنا،ایمانی برادری،انسانی بھائی چارہ،اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا،ناپ تول میں انصاف سے کام لینا،ملک میں فساد نہ پھیلانا،استیذان (یعنی کسی کے گھر میں اجازت لے کر داخل ہونا)،ایثار،تحمل وبردباری،برائی کے بدلے میں نیکی کرنا،مخالفین کے ساتھ مباحثوں اور

مناظروں میں اچھا طریقہ اختیار کرنا،مشرکین کے بتوں تک کو گالی نہ دینا،صدقہ وغیرہ پر احسان نہ جتلانا،پردہ ،دل کا تقوی اور پاکیزگی،ضعیفوں،کمزوروں اورعورتوں کے ساتھ نیکی کرنا ،سکون سے چلنا ،طہارت (جسم، جان ، کپڑوں کی پاکیزگی) سے متعلق احکام،قرض حسنہ دینا،شرمگاہ کی حفاظت کرنا،خدا کی نعمت کوظاہر کرنا،سب پر رحم کرنا،قرض معاف کرنا،میدان جنگ میں پیٹھ نہ پھیرنا،مانگنے والے کو نہ جھڑکنا۔

قرآن مجید میں مذکوراخلاق رذیلہ سے متعلق احکام کی فہرست:

جھوٹ کا تدارک،علم پر عمل نہ کرنے کی مذمت،بخل اورفضول خرچی کی ممانعت،تکبراور تفاخر کی مذمت، برے ناموں سے یاد کرنا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، گداگری کی حوصلہ شکنی،قتل ناحق اورقتل اولاد سے متعلق احکامات، زنا کی حرمت، اسباب زنا سے روکنا (مثلا غیر محرم کو دیکھنے کی ممانعت) خیانت، آنکھ، کان اور دل سے پوچھ گچھ،لغو سے منہ موڑنا،غصہ نہ کرنا،فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ اور رہزنی پر سزا،غلط طریقے سے دوسرے کا مال ہتھیانا، پاکبازی جتانا، ناحق قسم کھانے کی ممانعت،چغل خوری،طعنہ زنی، بہتان / تہمت لگانے کی سزا،غیبت نہ کرنے کا حکم، بدگمانی، برے نام رکھنا، بے ہودہ مذاق، جاسوسی کے ذریعے دوسروں کے عیب تلاش کرنے کی مذمت۔ جنگ سے پیٹھ پھیرنے کی مذمت۔شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، کھلی اور چھپی بے حیائی سے بچنے کا حکم،ظلم سے روکنا،لوگوں سے بے رخی نہ کرنا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کے اجزا:

اسلام کے اخلاقی احکام تین حصوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) حقوق وفرائض سے متعلق احکام

(۲) فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق سے متعلق احکام

(۳) آداب: یعنی اعمال کو احسن طریقے سے سرانجام دینا

غرض اسلامی احکام کے ذریعے ہم کسی چیز کے فرض، واجب، سنت،نفل، مباح، مکروہ، حرام ہونے سے متعلق آگاہی حاصل کرتے ہیں۔قرآنی مضامین علم الکلام، علم الاخلاق اور علم فقہ سے متعلق ہیں۔قرآنی احکام عبادات ،انسانوں کے باہمی معاملات اور حدود وتعزیرات سے متعلق ہیں۔قرآن مجید کی تقریبا پانچ سو آیات احکام سے متعلق ہیں، تاہم قرآن مجید، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس وغیرہ کے ذریعے احکام اخذ اور معلوم کیے جاتے ہیں ۔ ہر حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے۔ان احکام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید میں اخلاق سے متعلق بھی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ان میں سے بعض پر عمل کرنا فرض، واجب، سنت یا نفل کے درجے میں آتا ہے ۔اسی طرح بعض کام حرام اور کبیرہ گناہ ہیں جبکہ بعض مباح اور مکروہ ہیں۔ان احکامات پر عمل کرنے سے اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ برے اخلاق جن کو اصطلاحا منکر کہا جاتا ہے ان سے بچنا ضروری اور لازمی ہے۔

اسلام نے والدین، اولاد، یتیموں اور زوجین وغیرہ کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔اسی طرح عدل، احسان، ایفائے عہد، صدق، شکر جیسے اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان پر عمل کرنے کو لازم قرار دیا گیا ہے اور معاشرے میں اخلاق حسنہ کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔اسی طرح جھوٹے پر لعنت کی گئی ہے۔غیبت حرام ہے۔قتل ناحق، چوری، زنا، بہتان جرم کے زمرے میں آتے ہیں اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والے کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے۔ان سزاؤں کو حدود اللہ کہا گیا ہے جن میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔

اللہ تعالی کے تمام احکام کسی حکمت اور مصلحت پر مشتمل ہیں۔ دنیا کے دیگر نظاموں کے برعکس اسلامی شریعت نے انسانی معاملات سے متعلق یہ ہدایات کسی سطحیت یا ظاہر بینی کی بنیاد پر نہیں بلکہ شریعت نے انسان کے مزاج، انسان کی نفسیات اور انسان کی کمزوریوں اور خامیوں کا پورا ادراک کرتے ہوئے انسان کے لیے نظام زندگی متعین کیا ہے۔شرعی احکام میں انسان کی لامتناہی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔شریعت کی اس گہرائی اور تعمق کا اندازہ

امام شاطبیؒ کی ''الموافقات''، شاہ ولی اللہؒ کی ''حجت اللہ البالغہ'' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے لگایا جاسکتا ہے اور اس گہرائی کی مثال انگلش ،رومن یا دنیا کے کسی قانون کی تفسیر میں ملنا مشکل ہے۔ احکام میں حالات اور زمانے کی رعایت رکھنا شریعت اسلامی کا مزاج ہے۔

اسلامی احکام انسانی فطرت کے عین مطابق ،آسان اور قابل عمل ہیں۔ اسلامی احکام کا اصل مقصود دنیا میں کامیاب زندگی گزارنا اور آخرت میں کامیاب وکامران ہونا ہے۔ انسانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ان احکامات کو من وعن قبول کریں اور ان پر عمل کرتے ہوئے دنیا وآخرت کی کامیابی حاصل کریں۔

اخلاق نبوی ﷺ کا تعارف

(۱) صاحب خلق عظیم:

قرآن مجید میں اللہ رب العزت اخلاق کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم۶۸:۴)

اور بیشک آپ بہت بڑے اخلاق پر ہیں

محمد بن احمد الانصاری القرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ابن عباس اور مجاہد نے ''علی خلق عظیم'' کے معنی 'ادیان میں سے دین عظیم پر ہونا (مراد لیا ہے) کیونکہ کوئی دین اللہ تعالی کے نزدیک اس (دین اسلام) سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور عطیہ نے کہا کہ وہ قرآن کا ادب ہے اور کہا گیا کہ وہ آپ کی اپنی امت کے ساتھ نرمی ہے اور ان کے علاوہ آپ کی عزت، اور قتادہ نے کہا وہ حکم دیتا ہے اللہ کے حکم سے اور روکتا ہے جس سے اللہ نے روکا ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ آپ اچھی طبیعت پر ہیں۔''(۱)

اسماعیل بن عمر المعروف ''ابن کثیر'' خلق عظیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ایک تو آپ کی جبلت اور پیدائش میں ہی اللہ نے پسندیدہ اخلاق بہترین خصلتیں اور پاکیزہ عادتیں رکھی تھیں، دوسرے آپ کا عمل قرآن کریم پر ایسا تھا کہ گویا احکام قرآن کا مجسم عملی نمونہ ہیں، ہر حکم کو بجالانے اور ہر نہی سے رک جانے میں آپ کی حالت یہ تھی کہ گویا قرآن میں جو کچھ ہے وہ آپ کی عادتوں اور آپ کے کریمانہ اخلاق کا بیان ہے۔''(۲)

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے ایک یہ کہ آپ اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہیں اسی وجہ سے آپ ہدایت خلق کا کام میں یہ اذیتیں برداشت کر رہے ہیں۔ ورنہ ایک کمزور اخلاق کا انسان یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ دوسرا آپ کے بلند اخلاق بھی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے۔''(۳)

پیر کرم شاہ الازہری ''خلق عظیم'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

(۱) **محمد بن احمد الانصاری القرطبی، الجامع لاحکام القرآن (library.islamweb.net) الجزء ثامن عشر، سورہ ن**

(۲) اسماعیل بن عمر، حافظ، ابوالفداء عمادالدین، مترجم مولانا محمد جوناگڑھی، تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۱۹۹۹ء) ج:۵، ص:۴۰۴

(۳) سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۴ء) ج:۶، ص:۵۹

''خلق عظیم سے مراد اخلاق کے لحاظ سے آپ کو جو مقام حاصل ہے مخلوق خدا میں سے کوئی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔علی کا لفظ استعلاء کے لیے یعنی کسی پر حاوی ہونا چھا جانا اور قابو پا لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔آیت یوں نہیں ہے **وان لك خلقا عظیما** بلکہ **وانك لعلی خلق عظیم** ہے۔مقصد یہ ہے کہ اخلاق حمیدہ اور افعال پسندیدہ پر حضورؐ کا قبضہ ہے یہ سب زیر فرطن ہے، یہ سب مرکب ہیں حضورؐ ان کے راکب اور شہسوار ہیں۔اس لیے حضورؐ کو ان امور کے لیے کسی تکلف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔آفتاب ذات محمدی سے صفات محمدیہ اور کمالات احمدیہ کی کرنیں خود بخود پھوٹتی ہیں۔اللہ تعالی نے بھی حکم دیا **قل لا اسئلکم علیه اجرا وما انا من المتکلفین** ۔اے حبیب آپ اعلان کردیں کہ میں تم لوگوں سے نہ کسی اجر کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ تکلف اور بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ فرما کر بتادیا کہ حضورؐ کی ذات تمام تر کمالات کی جامع ہے وہ کمالات جو پہلے نبیوں اور رسولوں میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے وہ مجموعی طور پر اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ اس ذات اقدس واطہر میں موجود ہیں۔شکر نوحؑ ،خلت ابراہیمؑ ،اخلاص موسیٰؑ ،صدق اسماعیلؑ ،صبر یعقوبؑ تواضع سلیمان سب یہاں جمع ہیں۔''(۴)

امام شرف الدین بوصیریؒ نے اپنے مخصوص انداز میں کیا خوب فرمایا ہے:

فاق للنبیین فی خلق وفی خلق-------- ولم یدانو فی علم والاکرم

فانه شمس فضلهم کواکبها-------------- یظهرن انوارها للناس فی ظلم

یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی ظاہری شکل وصورت اور سیرت واخلاق کے اعتبار سے تمام انبیا سے برتر ہیں کوئی نبی آپؐ کے مقام علم اور شان کرم کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔حضور کی ذات بزرگی کا آفتاب ہے سارے انبیاء ستارے ہیں اور ستارے عہد جاہلیت کے اندھیروں میں آپ کے انوار اور تابانیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔(۵)

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''انسان کی عملی سیرت کا نام خلق (اخلاق) ہے قرآن کے سوا اور کس مذہب کے صحیفہ نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا،لیکن قرآن نے صاف کہا اور دوست ودشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا **وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ٥وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۶۸:۳،۴)** یہ دونوں فقرے گو نحو میں معطوف اور معطوف علیہ ہیں لیکن درحقیقت اپنے اشارۃ النص اور ترکیب کلام کے لحاظ سے علت ومعلول ہیں یعنی دعوی اور دلیل ہیں، پہلے ٹکڑہ میں آپ کے اجر کے نہ ختم ہونے کا دعوی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں آپ کے عمل اور اخلاق کو دلیل میں پیش کیا گیا ہے یعنی آپ کے اعمال اور آپ کے اخلاق خود اس کی دلیل ہیں کہ آپ کے اجر کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔''(۶)

---

(۴) محمد کرم شاہ،ضیاء القرآن (لاہور،ضیاء القرآن پبلیکیشنز،۱۹۹۵ء) ج:۵،ص:۳۳۱

(۵) محمد کرم شاہ،ضیاء القرآن (لاہور،ضیاء القرآن پبلیکیشنز،۱۹۹۵ء) ج:۵،ص:۳۳۱

(۶) سید سلیمان ندوی،خطبات مدراس (لاہور:ادارہ مطبوعات طلبہ،۱۹۹۵) ص:۱۲۶،۱۲۷

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''حضور کے خلق سے کسی کا خلق اعلیٰ نہیں کیونکہ حضورؐ اپنی مرضی اور مشیت سے دستکش ہو گئے اور اپنے آپ کو کلیۃً حق تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ امام قشیریؒ کا ارشاد ہے نہ آلام ومصائب کے باعث شاہد حقیقی سے منہ موڑا اور نہ جود وعطا سے دامن بھر لینے کے بعد اس سے بے رخی برتی۔ حضرت جنید کی رائے ہے حضور کے خلق کو عظیم اس لیے کہا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بغیر حضورؐ کی کوئی خواہش نہ تھی۔ حضورؐ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور اس کا ادب سکھانا خوب تھا **ادبنی ربی تادیبا حسنا**۔ جب اس عبد کریم کا مودب، مربی اور معلم خود رب العالمین ہے تو پھر اس تلمیذ ارشد کے حسن ادب، حسن تربیت اور کمال علم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ شاہ خوباں صرف خود ہی ہر کمال، ہر جمال کے پیکر رعنا اور تصویر جمیل نہ تھے بلکہ اپنے نیاز مندوں کو بھی ان نعمتوں سے مالا مال کر دیا ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ آنے والی نسل انسانی کے لیے وہ ایک دلکش نمونہ بن گئے۔''(۷)

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو پہلی وحی کے وقت آپ کے ساتھ پندرہ سال گزار چکی تھیں، وحی کے خوف پر آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے اخلاق عالیہ پر ان الفاظ کے ساتھ شہادت دیتی ہیں:

كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ(۸)

ہرگز نہیں اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ یقیناً آپ صلہ رحمی کرتے ہیں ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جو چیز لوگوں کے پاس نہیں وہ انہیں کما دیتے ہیں مہمان کی خاطر تواضع کرتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) مدد کرتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ آپ کے اخلاق کریمانہ کی گواہی اس طرح دیتی ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ مَا كَانَ اَحَدٌ اَحْسَنَ خُلُقًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا دَعَاهُ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَلَا مِنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ اِلَّا قَالَ لَبَّيْكَ (۹)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اخلاق کے لحاظ سے کوئی بھی شخص حضور نبی کریمؐ سے زیادہ حسین نہ تھا اگر صحابہ کرامؓ یا آپ کے گھر والے آپ کو پکارتے تھے تو آپ ہمیشہ لبیک (حاضر ہوں تمہارے لیے حاضر ہونا) سے جواب دیتے۔

حضرت عائشہؓ سے جب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا:

اَلَسْتَ تَقْرَاُ الْقُرْآنَ قُلْتُ بَلٰى قَالَتْ فَاِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ الْقُرْآنَ

---

(۷) محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن (لاہور، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء) ج:۵، ص:۳۳۲

(۸) صحیح بخاری، کتاب بدا الوحی، باب کیف کان بدا الوحی، رقم:٤

(۹) الانوار فی شمائل النبی المختار، باب فی حسن خلقه ﷺ، رقم الحدیث:۲۰۲

کیاتم نے قرآن نہیں پڑھامیں نے کہاہاں کیوں نہیں آپؐ نے فرمایا بے شک اللہ کے نبی کے اخلاق قرآن تھے۔(۱۰)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسم نمونہ بن کر دکھایا تھا۔جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپؐ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا،جس چیز سے اس میں روکا گیا آپ نے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا،جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا سب سے بڑھ کر آپ کی ذات ان سے متصف تھی اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھیرایا گیا سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔''(۱۱)

بعض مفسرین نے خلق عظیم سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لیا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹)

آپؐ درگزر کریں اور بھلائی کا حکم دیں اور جاہلوں سے منہ پھیر لیں۔

(۲) اخلاق کا عملی اور بہترین نمونہ:

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے حضورؐ اکرم کی ذات گرامی کو بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب ۳۳:۲۱)

حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت سے امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔

امام راغبؒ ''اسوہ'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاُسوۃ والاسوۃ (قُدوۃ اور قِدوۃ کی طرح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسروں کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری،سرور بخش ہو یا تکلیف دہ اسی لیے آیت کریمہ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** میں ''اسوۃ'' کی صفت حسنۃ لائی گئی ہے۔(۱۲)

پیر کرم شاہ الازہری ''اسوہ'' کا مفہوم درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسوہ کے معنی قدوہ یعنی پیشوا،رہنما اور امام کے ہیں۔یا۔جس سے کوئی غمزدہ دل اور شکستہ دل تسلی حاصل کر سکے یعنی غمگسار(۱۳)

---

(۱۰) صحیح مسلم،صلاۃ المسافرین وقصرها،باب جامع صلٰوۃ الیل ومن نام عنه او مرض،رقم:۷۳۶

(۱۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور:مکتبہ تعمیر انسانیت،۱۹۸۴ء) ج:۶ ص:۵۹

(۱۲) راغب اصفہانی،،مترجم مولانا محمد عبدہ،مفردات القرآن (لاہور:اہل حدیث اکادمی ۱۹۷۱ء) ص:۳۲

(۱۳) پیر محمد کرم شاہ،ضیاء القرآن (لاہور،ضیاء القرآن پبلیکیشنز،۱۹۹۵ء) ج:۴ ص:۳۳،۳۴

اسماعیل بن عمر المعروف ''ابن کثیر'' آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ آیت بہت بڑی دلیل ہے اس امر پر کہ آنحضرت ﷺ کے تمام اقوال، افعال، احوال، اقتدا، پیروی اور تابعداری کے لائق ہیں۔ جنگ احزاب میں جو صبر وتحمل اور عدیم المثال شجاعت کی مثال حضورؐ نے قائم کی (مثلاً راہ الٰہ کی تیاری، شوق جہاد اور سختی کے وقت بھی رب سے آسانی کی امید اس وقت آپ نے دکھائی یقیناً یہ تمام چیزیں اس قابل ہیں کہ مسلمان اسے اپنی زندگی کا جز و اعظم بنا لیں اور اپنے پیغمبر اللہ کے حبیب ''احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ'' کو اپنے لیے بہترین نمونہ بنا لیں اور ان اوصاف سے اپنے تئیں متصف کریں۔'' (۱۴)

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''اسلام فلسفیانہ نظریات کا مجموعہ نہیں کہ آپ اپنے ڈرائنگ روم میں آرام دہ صوفوں پر بیٹھ کر انہیں موضوع بحث بنائیں اپنے ذہن رسا سے طرح طرح کی ترمیمیں پیش کریں مجلس مذاکرہ منعقد کر کے مقالے پڑھیں اور پھر یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا بلکہ یہ تو ایک نظام حیات ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتا ہے اور ہر مرحلہ پر پیغام دیتا ہے۔ اس پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات پر کاربند ہونا اس وقت تک آسان نہیں جب تک ایک عملی نمونہ ہمارے پاس نہ ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے صرف قرآن نازل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی تبلیغ کرنے کے لیے اپنے محبوب کو منتخب فرمایا تا کہ وہ ارشادات خداوندی پر خود عمل کر کے دکھائے اور ان پر عمل کرنے سے زندگی میں جو زیبائی اور نکھار پیدا ہوتا ہے اس کا عملی نمونہ پیش کرے تا کہ جو حق کے متلاشی ہیں وہ قرآنی تعلیمات کی عملی تصویر دیکھ کر اپنے سینے سے لگائیں۔'' (۱۵)

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

اس (آیت) سے رسول کریمؐ کے اقوال و افعال سب کی اقتدا کا حکم ثابت ہوا، مگر محققین ائمہ تفسیر کے نزدیک اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جس کام کا کرنا یا چھوڑنا بدرجہ استحباب ثابت ہوا اس کا کرنا یا چھوڑنا ہم پر بھی درجہ استحباب میں رہے گا اس کی خلاف ورزی گناہ نہ قرار دی جائے گی۔ (۱۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر معاملہ میں آپؐ کی زندگی کو اپنے لیے نمونے کی زندگی سمجھیں اور اسی کے مطابق اپنی سیرت اور کردار کو ڈھالیں۔ (۱۷)

---

(۱۴) اسماعیل بن عمر، حافظ، ابوالفدا ءعماد الدین، مترجم مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۱۹۹۹ء) ج:۴، ص:۲۳۱

(۱۵) پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن (لاہور، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء) ج:۴، ص:۳۳، ۳۴

(۱۶) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج:۷، ص:۱۲۱

(۱۷) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۴ء) ج:۴، ص:۸۱

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''آئیڈیل لائف اور نمونہ تقلید بننے کے لیے جو حیات انسانی منتخب کی جائے، ضروری ہے کہ اس کی سیرت کے موجودہ نقشہ میں یہ چار باتیں پائی جائیں یعنی تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت، میرا یہ مقصد نہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں ان کے عہد اور زمانہ میں ان خصوصیات سے خالی تھیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ ان کی سیرتیں جو ان کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں یا جو آج موجود ہیں وہ ان کی خصوصیات سے خالی ہیں، وہ ان کی خصوصیات سے خالی ہیں اور ایسا ہونا مصلحت الٰہی کے مطابق تھا، تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ انبیاء محدود زمانہ اور متعین قوموں کے لیے تھے، اس لیے ان کی سیرتوں کو دوسری قوموں اور آئندہ زمانہ تک محفوظ رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف محمد رسول اللہ ﷺ تمام دنیا کی قوموں کے لیے اور قیامت تک کے لیے نمونہ عمل اور قابل تقلید بنا کر بھیجے گئے تھے، اس لیے آپ کی سیرت کو ہر حیثیت سے مکمل دائمی اور ہمیشہ کے لیے محفوظ رہنے کی ضرورت تھی اور یہی ختم نبوت کی سب سے بڑی عملی دلیل ہے۔'' (۱۸)

سید سلیمان ندوی جامعیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کسی سیرت کے عملی نمونہ بننے کے لیے تیسری شرط جامعیت ہے۔ جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس آئیڈیل زندگی کے آئینہ میں موجود ہوں۔ اس نقطہ نگاہ سے کبھی دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیا علیہ الصلٰوۃ والسلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔'' (۱۹)

غرض اللہ کے رسول کی زندگی میں مومنوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ مسلمان چاہے زندگی کے کسی شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں اللہ کے رسول کی سیرت و سنت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسانوں کی ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ کسی نے اچھا سپہ سالار دیکھنا ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار کو دیکھے، کسی نے اچھا استاد دیکھنا ہو تو دار ارقم اور اصحاب صفہ کے استاد کو دیکھے، کسی نے مثالی امام اور خطیب دیکھنا ہو تو مسجد نبوی کے امام اور خطیب کو دیکھے، ایک عادل اور مثالی حکمران دیکھنا ہو تو ریاست مدینہ کے حکمران کو دیکھے۔ غرض کسی نے ایک مکمل انسان دیکھنا ہو تو حضور اکرمؐ کے اسوہ کو دیکھے۔ آپؐ کی سیرت اور اسوہ کی پیروی تمام مسلمانوں پر لازم ہے اور اس کے بغیر دنیا و آخرت کی کامیابی ناممکن ہے۔

(۳) قرآن مجید میں آپؐ کے اخلاقی اوصاف کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں رسول اکرم حضرت محمد ﷺ کے اخلاقی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبة ۹:۱۲۸)

---

(۱۸) سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس (لاہور: ادارہ مطبوعات طلبہ، ۱۹۹۵) ص: ۴۳، ۴۴

(۱۹) سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس (لاہور: ادارہ مطبوعات طلبہ، ۱۹۹۵) ص: ۳۶

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت دشوار گزرتا ہے جو تمہاری بھلائی کے خواہاں ہیں، جو مسلمانوں پر بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

پیر محمد کرم شاہ الازھری لکھتے ہیں:

"عــنــت کہتے ہیں مشقت وشدت کو یہاں ما یا تو مصدر ہے یا موصولہ یعنی ہر وہ چیز جس سے اے اولاد آدم تمہیں تکلیف پہنچتی ہو وہ حضورؐ کے قلب رحیم پر بھی گراں گزرتی ہے اور ہر وہ چیز جس سے تمہارا بھلا ہو اس کے حضور بہت خواہشمند ہیں۔ **عـزیـز علیـه ان تـدخـلـوا الـنـار وحـریـص علیـکـم ان تـدخـلـواالـجـنة**... تمہارا آگ میں داخل ہونا ان پر دشوار گزرتا ہے اور وہ تمہارے بارے میں اس بات کے طالب ہیں کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔"(۲۰)

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری "**عزیز علیه ما عنتم**" کے تحت لکھتے ہیں:

"**عـز یعز** (بفتح عین) ہو، تب اس کے معنی شاق اور سخت ہوتے ہیں **عنت** جس سے **عنتم** بنا ہے کے معنی مشقت، فساد، ہلاکت، خطا وغیرہ ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ جو چیز تم کو مشقت میں ڈالنے والی ہے وہ نبی ﷺ کو نہایت ہی شاق و گراں گزرتی ہے، یعنی تمہاری تکلیف سے نبی ﷺ کو ضرور تکلیف ہوتی ہے ۔تمہارے درد کو وہ درد سمجھتے ہیں۔ واضح ہو کہ نبی ﷺ کی یہ صفت کفار اور مومنین دونوں کے حق میں تھی۔ نبی ﷺ جب کفار کو کفر وشرک میں دیکھتے اور خیال فرمایا کرتے کہ یہ لوگ کس انجام بد کا شکار ہونے والے ہیں ۔یہ لوگ کیوں کر اپنے ہاتھوں اپنے لیے چاہ ہلاکت کھودر ہے ہیں، تب حضور ﷺ کے دل رحم پرور کو نہایت صدمہ گزرتا تھا۔ بسا اوقات یہ کیفیت اس قدر بڑھ جاتی کہ اللہ تعالیٰ کو حضورؐ کے تسلیہ وسکینہ کے لیے اپنا کلام و پیغام بھیجنا پڑتا"۔

سورہ آل عمران میں ہے:

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ (ال عمران ۳:۱۷۶)

کفر میں بڑھ بڑھ کر حصہ لینے والوں کی حالت سے آپ اندوہ گیں نہ ہوں

اس کے بعد وہ چند واقعات درج کرتے ہیں مثلاً بدر کے قیدیوں میں آپؐ کے چچا حضرت عباس بھی تھے جن کے کراہنے کی وجہ سے آپؐ بے چین تھے۔ ایک انصاری نے چپکے سے ان کے بندھن کھول دیے تو انہیں آرام ملا آپؐ نے تمام (بدترین دشمن) قیدیوں کے بندھن کھولنے کا حکم دیا۔ اسی طرح ہجرت مدینہ کے بعد مکہ میں سخت قحط پڑ گیا۔ ابوسفیان حاضر خدمت ہوا احسان فرمانے اور قحط سے نجات حاصل کرنے کے لیے دعا کی درخواست کی ۔آپؐ نے نجد کے مسلمان سردار ثمامہ بن اثال کو حکم بھیجا کہ مکہ میں فوراً غلہ پہنچانے کا بندوبست کرو۔ حنین اور اوطاس سے شکست کھانے والے قلعہ طائف میں محصور ہوگئے۔ آپؐ کو معلوم ہوا کہ دشمن محاصرہ کی شدت سے سخت تکلیف میں ہے، بھوک نے ان کو ہلاکت کے قریب کر دیا ہے۔ حضورؐ نے

---

(۲۰) پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن (لاہور، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء) ج:۲، ص:۲۶۹

محاصرہ اٹھا دینے کا حکم دے دیا۔ چند صحابہؓ نے جنگی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض بھی کیا کہ اب تو قلعہ فتح ہونے ہی والا ہے مگر حضورؐ نے از راہ کرم جو حکم دیا تھا، اس کی تعمیل کرائی۔(۲۱)

نبی کریمؐ نے عبادات و معاملات میں بھی امت کو دشواری سے بچانے کی کوشش کی مثلا

''معراج کے موقع پر جب پچاس نمازیں فرض ہوئیں تو حضرت موسیٰ نے آپؐ سے کہا کہ **ان امتك لا تطيق** کہ آپ کی امت اتنی عبادت کی طاقت نہیں رکھتی۔ تب حضورؐ نے اللہ تعالی سے رجوع فرمایا تخفیف ہوئی موسیٰ نے پھر بھی حضورؐ کو وہی کہا جو پہلے کہا تھا اور نبیؐ ہر مرتبہ اللہ تعالی سے رجوع فرماتے رہے یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔''(۲۲)

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

اس واقعہ سے دو نتیجے صاف طور پر برآمد ہوتے ہیں:

(الف) نبی ﷺ فرمان رحمان کے کتنے منقاد مطیع تھے کہ جب پچاس نمازوں کا حکم ہوا تو حضورؐ نے اس بارہ میں ذرا بھی لب کشائی نہیں فرمائی۔

(ب) حضورؐ اپنی امت پر کس قدر مہربان تھے کہ جب موسی کلیم اللہ جیسے تجربہ کار نبی نے **ان امتك لا تطيق** کو دہرایا تو فورا اس پاک فطرت کا ظہور ہوا جو **عزيز عليه ما عنتم** کے تحت میں پنہاں تھی اور حضورؐ نے بار بار رجوع الی اللہ فرمایا۔(۲۳)

☆۔آپؐ نے اہل لشکر کی شدت تکلیف کی وجہ سے روزہ افطار کرایا۔

حَدِيْثُ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ اِلٰى مَكَّةَ فِى رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ الْكَدَيْدَ اَفْطَرَ ،فَاَفْطَرَ النَّاسُ

حضرت ابن عباس **رضی اللہ عنہما** نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ (فتح مکہ کے موقع پر) مکہ کی طرف رمضان میں چلے تو آپ روزہ سے تھے لیکن جب کدید پہنچے تو روزہ رکھنا چھوڑ دیا اور صحابہ **رضوان اللہ علیہم اجمعین** نے بھی آپ کو دیکھ کر روزہ چھوڑ دیا۔(۲۴)

☆۔آپؐ نے امت کی تکلیف کو مدنظر رکھتے ہوئے تراویح کی نماز تین دن ادا فرمائی پھر اس وجہ سے چھوڑ دی کہ کہیں امت پر فرض نہ کر دی جائے:

---

(۲۱) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمت للعالمین (لاہور: رالفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۳، ص:۷۴، ۷۵، ۷۶

(۲۲) **صحيح بخاری .كتاب الصلاة. باب كيف فرضت الصلاة فى الاسراء، رقم:٣٤٢**

(۲۳) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمت للعالمین (لاہور: رالفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۳، ص:۷۶

(۲۴) **صحيح بخاری ،كتاب الصوم، باب اذا صام اياما من رمضان ثم سافر، رقم:١٨٤٢**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت اٹھ کر مسجد میں نماز پڑھی اور چند صحابہؓ بھی آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ صبح کو ان صحابہؓ نے دوسرے لوگوں سے اس کا ذکر کیا چنانچہ (دوسرے دن) اس سے بھی زیادہ جمع ہو گئے اور آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ دوسری صبح کو اس کا چرچہ اور زیادہ ہوا۔ پھر کیا تھا' تیسری رات بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے اور جب رسول اللہ ﷺ اٹھے تو ان صحابہؓ نے آپ کے پیچھے نماز شروع کر دی۔ چوتھی رات جو آئی تو مسجد میں نمازیوں کے لیے تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ لیکن آج رات نبی کریم ﷺ نے یہ نماز نہیں پڑھائی اور فجر کی نماز کے بعد لوگوں سے خطاب کیا۔ پہلے آپ نے کلمہ شہادت پڑھا پھر فرمایا امابعد

فَاِنَّهٗ لَمْ يَخْفَ عَلَيَّ مَكَانُكُمْ لٰكِنِّي خَشِيْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ فَتَعْجِزُوْا عَنْهَا

مجھے تمہاری اس حاضری سے کوئی ڈر نہیں لیکن میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے پھر تم سے یہ ادا نہ ہو سکے۔(۲۵)

آپؐ نے امت کا مشقت میں پڑ جانے کی وجہ سے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم نہ دیا۔ ارشاد نبویؐ ہے:

لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِي لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ

اگر مجھے اپنی امت کے بارے میں مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔(۲۶)

حريص عليكم :

کے تحت قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

''جب حرص کا استعمال علی کے صلہ سے کیا جاتا ہے تو اس کے معنی شدت طلب کے ہوتے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ ہمارا نبی تم لوگوں کی نفع رسانی کا کمال درجہ طالب و شائق ہے۔ آیت بالا سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ نبی ﷺ کو بنی نوع کے مفاد اور رفاہ وصلاح کی آرزو بہ درجہ کمال تھی۔ سورہ یوسف میں ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (يوسف ۱۲:۱۰۳)

بہت لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے اگر چہ آپ کو ان سے ایمان لے آنے کی بڑی چاہت ہے۔

اس آیت سے بھی یہی استفادہ ہوا کہ حضورؐ کا منتہائے نظر اور کمال آرزو یہی تھا کہ تمام عالم کے سر ایک ہی مالک **وحده لا شريك له** کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔ رب واحد کا دین واحد ہی تمام اصناف انسانی کو متحد و متفق بنانے والا ہو۔''(۲۷)

---

(۲۵)صحيح بخاری ،كتاب الجمعه ،باب من قال فی الخطبة بعد الثناء امابعد،رقم:۸۸۲

(۲۶)سنن ترمذی،كتاب الطهارةعن رسول الله صلى الله عليه وسلم،باب ما جاء فی السواك ،رقم:۲۲

(۲۷) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمت للعالمین (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۳، ص:۷۸،۷۹

بالمومنین رؤف رحیم :

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

''وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے والا اوران پر ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔آیت کے اس حصہ میں نبی ﷺ کو رؤف اور رحیم کے اسمائے مبارکہ سے پکارا گیا ہے۔رؤف،رافت سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔جو صیغے مبالغہ کے اوزان پر آتے ہیں،وہ معنی کثرت وفراوانی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔رحیم رحم سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔جو صیغے صفت مشبہ کے اوزان پر آتے ہیں،وہ صفت لازم اور معنی ثابت کے مظہر ہوتے ہیں۔لہذا رؤف کے معنی کامل العطوف ہیں اور رحیم کے معنی دائم الرحمت ہیں۔''(۲۸)

پیر محمد کرم شاہ الازہری ان الفاظ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''رؤف مبالغہ کا صیغہ ہے رؤف کے معنی ہے بے حد مہربانی اور شفقت فرمانے والا۔حسین بن فضل نے کہا اللہ تعالی نے اپنے دو ناموں کو محمدؐ کے سوا کسی نبی میں جمع نہیں فرمایا۔عبدالعزیز بن یحیی فرماتے ہیں عزیز علیہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ کے نزدیک تمہاری فلاح و بہبود کے سوا کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔''(۲۹)

قاضی سید محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

''نبی کریمؐ کے حق میں یہ امر نہایت شرف وعزت اور غایت تکریم وحرمت کا موجب ہے کہ حضورؐ کی صفت میں دو نام بہ حالت ترکیبی تجویز فرمائے گئے جو اسی ترکیب کے ساتھ خود ذات پاک سبحانی کے لیے مستعمل ہوئے ہیں۔ہاں الہ المحمود کی رافت و رحمت کو عوام الناس پر عام فرمایا گیا ہے اور حضورؐ کی رافت ورحمت کو بالخصوص مومنین کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔''(۳۰)

وہ مزید لکھتے ہیں جس کا اختصار یہ ہے کہ:

''آپؐ وعظ فرماتے وقت اس بات کا خیال رکھتے کہ وعظ سننے والے پر گراں نہ گزرے اور آئندہ سننے کا شوق باقی رہے،حالت نماز میں کسی بچے کی آواز سن کر نماز مختصر فرما دیتے تاکہ ماں اپنے بچے کو جلدی سنبھال سکے،خود سواری فرماتے تو کسی کو ساتھ پیدل نہ چلاتے یا تو ساتھ سوار کر لیتے یا واپس کر دیتے،مقروض مسلمان کا قرض بیت المال سے قبل از تدفین ادا کر دیتے۔اپنے سامنے کسی کی غیبت کرنے سے منع فرماتے،کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ساری رات امت کے حق میں دعا کرتے ہوئے گزار دیتے،چھوٹے بچوں کو پیار کرتے،ان کو خود سلام کرتے،ان کے سر پر دست شفقت رکھتے،گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو اپنی سواری پر آگے پیچھے سوار کر لیتے،غلاموں کے ساتھ سفید زمین پر بیٹھ کھانا کھانے میں شامل ہو جاتے۔ان سب امور کا ظہور ازراہ شفقت ورافت ہوا کرتا تھا اور اس بلند ترین رافت ورحمت کا ظہور حضور پرنور کے خصائص میں سے تھا۔''(۳۱)

---

(۲۸) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری،رحمت للعالمین (لاہو: رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۳،ص:۷۸،۷۹،۸۰

(۲۹) پیر محمد کرم شاہ،ضیاءالقرآن (لاہور،ضیاءالقرآن پبلیکیشنز،۱۹۹۵ء) ج:۲،ص:۲۶۹

(۳۰) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری،رحمت للعالمین (لاہو: رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۳،ص:۸۰

(۳۱) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری،رحمت للعالمین (لاہو: رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۳،ص:۸۱،۸۲

اسی طرح قرآن مجید نے آپؐ کی نرم مزاجی کو آپ کی دعوت کی کامیابی کا سبب قرار دیا ہے۔صحابہ کرامؓ جو آپؐ سے بے حد محبت کرتے تھے، آپؐ کے وضو کے قطروں کو زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، آپ کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں یہ سب آپؐ کی نرم مزاجی کا اثر تھا ارشاد الٰہی ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ
الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡامِنۡ حَوۡلِكَ(ال عمران ۳:۱۵۹)

اللہ کی رحمت کے سبب آپؐ ان کے لیے نرم دل ہوئے اور
اگر آپؐ سخت کلام اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس
سے تتر بتر ہو جاتے۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور مسلمانوں پر اپنا احسان جتاتا ہے کہ نبی کے ماننے والوں اور ان کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لیے اللہ نے نبی کے دل کو نرم کر دیا ہے اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو اتنی نرمی اور آسانی نہ ہوتی۔حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں ماصلہ ہے جو معرفہ کے ساتھ عرب ملا دیا کرتے تھے جیسے **فبما نقضهم** میں اور نکرہ کے ساتھ ملا دیا کرتے تھے جیسے **عما قليل** میں، اسی طرح یہاں ہے، یعنی اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم دل ہوا ہے۔حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں یہ حضورؐ کے اخلاق ہیں جن پر آپ کی بعثت ہوئی یہ آیت ٹھیک اس آیت جیسی ہے۔ **لَقَدۡ جَآئَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُ وۡ فٌ رَّحِيۡمٌ (التوبة۹:۱۲۸)**
۔۔۔**فظا** سے مراد یہاں سخت کلام ہے کیونکہ اس کے بعد **غليظ القلب** کا لفظ ہے یعنی سخت دل' فرمان ہے کہ اے نبی اکرم اگر تم سخت کلام اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے اور تمہیں چھوڑ دیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ کے جاں نثار و شیدا بنا دیا ہے اور آپ کو بھی ان کے لیے محبت اور نرمی عطا فرمائی اور تا کہ ان کے دل آپ سے لگے رہیں۔''(۳۲)

حضرت مالکؓ بن حویرث جن کا تعلق بنی لیث سے تھا ایک مرتبہ اپنی قوم کے چند افراد کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیس راتوں تک آپؐ کے پاس قیام فرمایا۔وہ آپؐ کے بارے میں کہتے ہیں:

كَانَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ رَحِيۡمًا رَقِيۡقًا(۳۳)

اللہ کے رسول ﷺ رحم کرنے والے اور نرم مزاج (نرمی کرنے والے) تھے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) نے مجھے آپؐ کے پاس بھیجا اور آپؐ کے ساتھ اسامہ بن زید، سعد بن عبادہ اور ابی بن کعب تھے۔۔۔۔پھر نبی ﷺ اٹھے اور ہم بھی اٹھے پھر بچے کو حضورؐ کے سامنے لایا گیا اور وہ دم توڑ رہا تھا تو بے اختیار آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔سعدؓ نے تعجب سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

هٰذِهٖ رَحۡمَةٌ وَضَعَهَا اللّٰهُ فِى قُلُوۡبِ مَنۡ شَاءَ مِنۡ عِبَادِهٖ وَلَا يَرۡحَمَ اللّٰهُ مِنۡ عِبَادِهِ اِلَّاالرُّحَمَاءَ(۳۴)

---

(۳۲)اسماعیل بن عمر، حافظ، ابوالفداء عمادالدین، مترجم مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۱۹۹۹ء) ج:۱، ص:۴۸۱

(۳۳)صحيح مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب من احق بالامامة، رقم: ۱۰۸۶

(۳۴)صحيح بخارى، كتاب المرضى، باب عيادةا لصبيان، رقم: ۵۲۵۰

یہ رحمت ہے اسے اللہ اپنے بندوں میں سے جن کے دلوں میں چاہتا ہے رکھ
دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کی نرم مزاجی نے آپ ﷺ کو لوگوں کا اور لوگوں کو آپ کا محبوب بنا دیا تھا۔آپ ﷺ نے ایک ایسے مثالی معاشرے کو تشکیل کیا جہاں ہر شخص دوسرے کے دکھ، درد کو اپنا درد سمجھتا تھا۔ یہ معاشرہ اخوت کی عملی تصویر تھا۔آپ نے انسانوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے اور مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنے کا شعور دیا۔قرآن مجید ان کی توصیف **رحمآء بینهم** کے مقدس الفاظ سے کرتا ہے۔

رحمت للعالمین :

قرآن مجید نے آپ ﷺ کی ذات کو تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیاء۲۱:۱۰۷)

ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

قاضی سید محمد سلیمان سلمان منصور پوری ''رحمت للعالمین'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رحمت کے معنی پیار، ترس، ہمدردی، غمگساری، محبت اور خبر گیری کے ہیں۔ان الفاظ کے معانی اس لفظ کے اندر پائے جاتے ہیں۔عالم، علمیت کی صفت سے بنا ہے یعنی وہ ہر ایک شے جس میں نمودار ہونے، ظہور پکڑنے، اپنی اپنی ہستی کو نمایاں کرنے اور اپنے وجود کی نمود رکھنے کی قابلیت ہے، وہ لفظ عالم سے موسوم ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''(۳۵)

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''عالمین، عالم کی جمع ہے جس میں ساری مخلوقات انسان، جن، حیوانات، نباتات، جمادات سبھی داخل ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام کائنات کی حقیقی روح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ روح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہیں رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آ جائے گی اور جب ذکر اللہ وعبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہو گیا، کیونکہ اس دنیا میں ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے۔''(۳۶)

غرض قرآن مجید نے آپ ﷺ کو اخلاق کے بلند درجہ پر فائز کیا ہے۔اخلاقی لحاظ سے آپ ﷺ کی زندگی کو مومنوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے جس کی پیروی کر کے ہم اپنے اعمال واخلاق کو سنوار سکتے ہیں۔اس کے علاوہ قرآن مجید نے آپ ﷺ کی اخلاقی صفات کو بھی بیان کیا ہے۔مسلمانوں کی کامیابی اسی میں ہے کہ ان کی سیرت وکردار میں صفات الٰہی اور اخلاق نبوی ﷺ کا پرتو نظر آئے۔تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی اس لحاظ سے اخلاقی تربیت کی، کہ لوگ ان کو دیکھ کر مسلمان ہو جایا کرتے تھے۔آپ ﷺ کے اخلاق سے آپ ﷺ کے دشمن بھی متاثر ہو جایا کرتے تھے۔آج ضرورت اسی امر کی ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی مکمل پیروی کریں، یہی ہمارے ایمان کی دلیل اور ہماری کامیابی کی نوید ہے۔

---

(۳۵) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمت للعالمین (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۳، ص:۹۳

(۳۶) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۶ء) ج:۶، ص:۳۳۳، ۳۳۴

فصل سوم:

اردو تفسیری ادب کا مختصر تعارف و تقابل

1۔ بارہویں اور تیرھویں صدی ہجری کا اردو تفسیری ادب :

برصغیر میں اردو تفسیر نویسی کا آغاز بارہویں صدی ہجری سے ہوا۔سب سے پہلے شاہ مراد اللہ سنبھلی (م ۱۷۷۰ء) نے تفسیر مرادیہ کے نام سے ایک نامکمل تفسیر لکھی جو آخری پارہ اور سورہ بقرہ کی بیس آیات پر مشتمل تھی۔اس کے بعد ان کے شیخ نے ان کو تفسیر لکھنے سے روک دیا تھا۔

ان کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بیٹے شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ (م ۱۸۱۵ء) نے قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا اور تفسیر ''موضح القرآن'' لکھی۔ یہ ترجمہ ایک بنیادی ترجمہ تھا بعد میں آنے والے مترجمین نے اس ترجمہ سے استفادہ ضرور کیا ہے۔شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اردو زبان کی تعلیم خواجہ میر درد سے حاصل کی۔اس لیے آپ کی تفسیر زبان کے مرادی معنی کی ادائیگی کے لحاظ سے ایک معیاری تفسیر تھی۔غرض اردو زبان میں قرآن مجید کے بامحاورہ ترجمہ کی ابتدا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے اردو ترجمہ سے ہوئی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (م ۱۸۱۷ء) نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا اور ایک تفسیر ''تفسیر رفیعی'' لکھی۔آپ کے ایک شاگرد سید نجف علی روزانہ درس کے دوران ترجمہ تحریر کرتے اور بعد میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے اصلاح کرواتے۔اس طرح آپ کے شاگرد کی کاوشیں بھی اس ترجمہ میں شامل ہیں۔

ان کے بعد ایک بزرگ شاہ رؤف احمد رافت نقشبندی (م ۱۸۳۳ء) نے ''تفسیر رؤفی'' لکھی جس کا دوسرا نام ''تفسیر مجددی'' بھی ہے۔یہ تفسیر ۱۸۷۶ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔آپ ترجمہ کرتے ہوئے تشریح کی غرض سے چند الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔

نواب قطب الدین خان بہادر دہلوی (م ۱۸۷۲ء) شارح مشکوٰۃ (جن کی شرح کا نام ''مظاہر حق'' ہے) نے ''جامع التفاسیر'' کے نام سے تفسیر لکھی۔یہ تفسیر دو جلدوں اور ۱۳۹۰ صفحات اور قدیم اسلوب پر مشتمل ہے۔مظاہر حق کی فراغت کے بعد اپنے دروس کو سورہ احزاب سے لکھنا شروع کیا۔سورہ طارق پر پہنچے تو آپ کا انتقال ہو گیا۔سورہ اعلی سے والناس تک تفسیر آپ کے شاگرد مولوی عبدالقادر نے مکمل کیا۔

قاضی صبغت اللہ بدرالدولہ (م ۱۸۶۳ء) نے تفسیر ''فیض الکریم'' لکھی۔آپ بائیسویں پارہ میں سورہ فاطر کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔بعض لوگوں کے اصرار پر آپ کے دوسرے فرزند مفتی محمود نے سورہ رحمان تک تفسیر لکھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد مفتی محمود کے بھتیجے مولوی ناصرالدین نے اپنی پندرہ سالہ محنت سے اس تفسیر کو مکمل کیا۔یہ تفسیر سات ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔اس کی صرف چند جلدیں شائع ہو سکیں۔مفسرین نے کتب تفسیر کے علاوہ احادیث، فقہ اور کلام کی کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔اس تفسیر کے مقدمے میں علوم القرآن پر بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد مولانا فخر الدین احمد قادری نے ''تفسیر قادری'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔تفسیر قادری حسین بن علی واعظ کاشفی کی فارسی تفسیر ''تفسیر حسینی'' کا اردو ترجمہ ہے۔یہ مقبول تفسیر کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ترجمہ کا اسلوب بامحاورہ اور دلپذیر ہے۔ربط اور روانی ساتھ ساتھ قائم ہیں۔

2۔ چودھویں صدی ہجری (نصف اول) کا اردو تفسیری ادب:

اس دور میں سرسید احمد خان نے قرآن مجید کی ایک نامکمل تفسیر لکھی جو سات جلدوں میں شائع ہوئی۔یہ تفسیر سورہ طہ تک ہے۔انہوں نے کئی اہم تفاسیر اور لغت کی کتابوں سے استفادہ کیا۔اس تفسیر میں اسرائیلی روایات اور موضوع احادیث پر مدلل گفتگو کی ہے۔پہلی مرتبہ اس تفسیر میں حوالہ جات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

حافظ ڈپٹی نذیر احمد نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جس کا نام ''غرائب القرآن'' ہے۔انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت قرآنی متن کی

ترتیب کا خیال نہیں کیا۔اس کے صفحات کی کل تعداد ۳۲۷ ہے۔اس تفسیر میں مضامین قرآن کی مکمل فہرست ہے جو بہت مفید ہے۔

اردو تفسیری ادب کی سب سے اہم تفسیر مولانا عبدالحق حقانی (۱۹۱۶ء) کی تفسیر ''فتح المنان'' ہے جس کو عرف عام میں ''تفسیر حقانی'' کہتے ہیں۔آیات کا شان نزول بھی بیان کیا گیا ہے۔آیات احکام میں مجتہدین کے اختلافات اور دلائل کو نقل کیا گیا ہے۔متقدمین کے علوم کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔اس تفسیر کو زیادہ تر تفسیر کبیر،تفسیر بیضاوی اور تفسیر الکشاف سے اخذ کیا گیا ہے۔باطل تاویلوں سے اجتناب کیا گیا ہے اور سلف صالحین کی پیروی کی گئی ہے ۔

سید امیر علی نے تفسیر ''**مواهب الرحمان**'' لکھی۔یہ تفسیر دس جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کا مقدمہ ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے،جس میں قدیم عربی مفسرین کا ذکر موجود ہے۔مختلف مسائل پر بحث کرنے کے علاوہ احادیث کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔صحابہ کرامؓ،تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی آرا اور ان کا تعامل نقل کیا گیا ہے۔یہ عربی زبان کی مشہور تفاسیر کی جامع ہے۔اس میں چند صوفیاء کا ذکر بھی موجود ہے۔

مولانا وحید الزمان (م۱۹۲۰ء) نے ''تفسیر وحیدی'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔انہوں نے تفسیر میں محدثین کا طریقہ اختیار کیا ہے اور قدیم عربی مفسرین جیسا انداز تفسیر اختیار نہیں کیا۔تفسیر حدیث سے کی گئی ہے۔آپ صحاح ستہ کے مترجم بھی ہیں۔ترجمہ اس قدر جامع اور بامعنی ہے کہ تفسیر نہ بھی لکھتے تو ترجمہ سے فہم قرآن کا مقصد حاصل ہو جاتا۔ترجمہ بامحاورہ اور قرآنی الفاظ کی ترتیب سے آزاد ہے۔

مولوی محمد تائب لکھنوی (م۱۹۲۳ء) نے ''خلاصۃ التفاسیر'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔اس کا اسلوب بہت سلیس اور سادہ ہے۔یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔تفسیر کے اختتام پر محمد عبدالعلی آسی مدراسی کا چوبیس اشعار مشتمل قطعہ تاریخ درج ہے۔جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ تفسیر کئی مستند تفاسیر کا مجموعہ اور خلاصہ ہے۔اس تفسیر میں علمی اور ادبی مباحث نہیں ہیں۔جن تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست جلد اول میں دی گئی ہے۔

مولانا محمد احتشام الدین مراد آبادی نے تفسیر ''اکسیر اعظم'' لکھی۔اس کی پہلی جلد ۱۸۸۵ء میں مراد آباد سے شائع ہوئی۔اس ایڈیشن کی بارہویں جلد سورہ طہ پر ختم ہوئی۔اس کا ترجمہ سلیس اور پراثر ہے۔

حکیم سید محمد حسن امروہی مراد آبادی نے ترجمہ اور تفسیر ''**غاية البرهان**'' کے نام سے لکھا۔اس کا شمار انیسویں صدی کے مقبول عام تراجم اور تفاسیر میں ہوتا ہے۔یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ترجمہ معنی کے لحاظ سے درست اور مناسب ہے۔اس ترجمہ کی زبان ادبی اور متین ہے لیکن وہ روانی نہیں جو باقی تراجم کے اندر پائی جاتی ہے۔

مولوی محمد انشاءاللہ (م۱۹۲۸ء) نے بیسویں صدی کے آغاز میں ''تفسیر فرقان حمید'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔مولوی انشاءاللہ کو صحافت کے حوالے سے ایک خاص مقام حاصل تھا۔آپ ایک اخبار ''وطن'' نکالتے جس میں قرآن مجید کا ترجمہ ''فرقان حمید'' کے نام سے قسط وار شائع ہوتا۔اس کے ساتھ وہ تفسیر بھی شائع کرتے جو دراصل علامہ رشید رضا مصری کی تفسیر ''المنار'' کا اردو ترجمہ ہوتا تھا۔یہ کم تعلیم یافتہ طبقہ کے فائدے کے لیے انتہائی آسان زبان میں لکھی گئی تفسیر ہے۔یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔

نواب صدیق حسن خان (م۱۳۰۷ھ) نے اردو زبان میں تفسیر ''ترجمان القرآن'' لکھی جو پندرہ جلدوں میں ہے۔مفسر کے سامنے قرآن مجید کی قدیم اور جدید تفسیریں تھیں۔ان کی خواہش تھی کہ قدیم مفسرین کے خیالات مختصراً بیان کر دیے جائیں اور پھر اپنا مدعا بیان کیا جائے۔مفسر نے عہد نبویؐ سے لے کر اپنے عہد تک کے مفسرین کی قرآنی تشریحات بیان کی ہیں۔

3۔ چودھویں صدی ہجری (نصف آخر) کا اردو تفسیری ادب:

ڈاکٹر عبدالحکیم پٹیالوی (م۱۹۴۰ء) نے اردو اور انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔انہوں نے اپنی تفسیر کا نام ''تفسیر القرآن بالقرآن'' رکھا۔یہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا اس سے پہلے غیر مسلموں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ترجمہ کرنے میں آپ کا اسلوب نہایت شستہ،رواں اور ادبی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) نے بارہ جلدوں میں تفسیر ''بیان القرآن'' لکھی۔ یہ تفسیر ڈھائی سال میں مکمل ہوئی۔اس تفسیر میں آپ نے بامحاورہ ترجمہ کیا جس کا مقصد کئی غیر مطمئن ترجموں سے بچا کر عوام کو عام فہم ترجمہ سے روشناس کرانا تھا۔ترجمہ کے ساتھ تفسیر اور آخر میں قرآن کی لغوی تحقیق کی گئی ہے۔مسائل سلوک بھی بیان کیے گئے ہیں۔تقابل ادیان کے مباحث تفسیر حقانی سے نقل کیے گئے ہیں۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (م ۱۹۴۹ء) نے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے بامحاورہ ترجمہ میں جدت پیدا کر کے قرآن مجید کا ترجمہ لکھا،اس کے بعد انہوں نے تفسیری فوائد لکھنا شروع کر دیےلیکن ابھی سورہ نساء تک پہنچے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ان تفسیری فوائد کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیا اور بعد میں یہ تفسیر عثمانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ تفسیر مختصر اور جامع ہے اور بڑی ضخیم تفاسیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔مشکل مسائل کو انتہائی سلیس اور دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔*(۲)

اس دور کی اہم تفسیر ''تفسیر ثنائی'' ہے جو ابوالوفاء مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تصنیف ہے۔ یہ تفسیر دفاع دین کی غرض سے علمی اور دعوتی انداز میں لکھی گئی ہے۔معنی و مفہوم کو متعین کرنے کے لیے نظم کلام اور ربط آیات پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔اردو میں عام فہم اور بامحاورہ کلام کی غرض سے اختلاف قرأت اور لغوی بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے۔اس تفسیر میں مذاہب باطلہ کے ساتھ مخاصمہ کیا گیا ہے۔آپ نے آریہ سماج اور عیسائیوں کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔سرسید احمد خان ،نیچریوں اور عقلیت پرستوں کا خوب رد کیا گیا ہے۔اس تفسیر میں مخاصمہ کے علاوہ اور پہلوؤں سے بھی بحث کی گئی ہے۔(۳)

مولانا محمد علی ایم اے نے قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ''بیان القرآن'' کے نام سے لکھا۔مولوی محمد علی نے انگریزی اور مغربی تعلیم بدرجہ عالی حاصل کی۔آپ نے انگریزی زبان میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ تحریر کیا جو کافی مقبول ہے۔تفسیر بیان القرآن تین جلدوں میں ہے۔ترجمہ سلیس اور عربی متانت کا حامل ہے۔لسانی حیثیت سے فصاحت اور شستگی ہے۔قادیانی جماعت کے امیر ہونے کی وجہ سے کئی افراد کو معنوی لحاظ سے ان کے ترجمے اور تفسیر پر اعتراض ہے۔انہوں نے بہت محتاط ہو کر ترجمہ کیا ہے،یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ غلط عقائد کی ترجمانی سے تقریباً خالی ہے۔نص قرآن اور الفاظ کی ترتیب کا خیال رکھنے کے باوجود ترجمہ میں روانی اور تسلسل قائم ہے۔

ہر جلد کے شروع میں بیان القرآن کے مضامین کی فہرست دی ہے۔ترجمہ کا اسلوب یہ ہے کہ سورت کے نام کے بعد خلاصہ مضمون لکھتے ہیں ۔آیات کی ترتیب نزولی اور تاریخ نزول پر بحث کرتے ہیں۔آیات ،سورتوں اور ہر سورت کے رکوعات کے باہمی تعلق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔سورتوں کے ناموں کی حکمت اور ہر رکوع کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن مجید کے درس و مطالعہ کی تین ضرورتوں کو محسوس کیا اور اسے تین کتابوں میں تقسیم کیا۔

۱۔مقدمہ تفسیر ۲۔تفسیر البیان ۳۔ترجمان القرآن

عام تعلیم کے لیے ترجمہ،مطالعہ کے لیے تفسیر اور اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ۔تفسیر کا نام ''ترجمان القرآن'' ہے۔

مولانا کی تفسیر اٹھارہ پاروں اور دو جلدوں پر مشتمل تھی۔تیسری جلد جو یا تو مولانا نے لکھی ہی نہیں تھی یا گم ہوگئی تھی۔مولانا غلام رسول مہر نے

---

*یہ حوالہ نمبر درج بالا تمام تفاسیر کے تعارف سے متعلق ہے۔

(۲)ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین،قرآن مجید کے اردو تراجم (کراچی قدیمی کتب خانہ،۱۹۸۱ء)ص:۱۶۹-۲۶۱

ڈاکٹر محمد قاضی حبیب اللہ قاضی چترالی، برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی،زم زم پبلشرز،۲۰۱۵)ص:۲۳۱-۲۳۶

ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی،علم تفسیر اور اس کا ارتقاء۔2 (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۳)ص:۱۸۸-۲۲۶

(۳)مولانا ثناء اللہ امرتسری،مقدمہ تفسیر ثنائی (لاہور مکتبہ قدوسیہ،۲۰۰۲)ج:۱،ص ۵،۱۸

''باقیات ترجمان القرآن'' کے نام سے تیسری جلد شائع کی۔ترجمان القرآن کی تیسری جلد ایک اور شکل میں بھی سامنے آئی جسے مولانا ابومومن منصور نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین سے جمع کیا جو الہلال اور البلاغ میں شائع ہوئے تھے۔ترجمان القرآن کی خصوصیات کا اصل محل اس کا ترجمہ اور ترجمے کا اسلوب ہے کیونکہ انہوں نے عربی آیات کو اردو آیات بنا دیا ہے۔تفسیر میں تفسیر بالرائے سے اجتناب کیا۔

فقہی مسائل کو قرآنی آیات کی تشریح تک محدود رکھا۔قصہ یوسف، ذوالقرنین اور اصحاب کہف جیسے قصص جدید تحقیقات کی استدلالی روشنی میں لکھے۔ذوالقرنین سے مراد فارس کا شہنشاہ ''سائرس'' ہے اور یاجوج ماجوج سے مراد ''منگولی قبائل'' ہیں۔ہاروت اور ماروت سے مراد بابل شہر کے دو افراد لیے ہیں فرشتے مراد نہیں لیے۔ترجمان القرآن میں اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ اسلام میں اصل چیز توحید ہے۔سرسید احمد خان کے تصورات کی تردید کی گئی ہے۔اس تفسیر میں اسرائیلیات اور عقلیات کو ترک کر دیا گیا ہے۔علماء نے اس تفسیر کے ان حصوں پر اعتراض کیا ہے جن کا تعلق متحدہ قومیت اور وحدت ادیان سے ہے۔(۴)

مولانا سعید احمد دہلویؒ (۱۳۸۲ھ) نے تفسیر ''**کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن وتسهيل القرآن**'' لکھی۔یہ تفسیر آپ کی اٹھارہ سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔قرآن فہمی کے علاوہ خطابت کے زور اور اردو زبان میں مہارت نے ترجمے کو خوبصورت اور موثر کر دیا ہے۔تفسیر کے حاشیے پر پہلے مختصر تفسیر ''تیسیر القرآن'' اور مفصل تفسیر کا نام ''تسہیل القرآن'' ہے۔یہ تفسیر کئی عربی تفاسیر کے مطالعے کا حاصل ہے۔مولانا سعید احمد دہلوی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس ترجمہ اور تفسیر پر کام کرتے رہے۔یہ تفسیر کئی علماء کی پسندیدہ ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مفسر کے نام کو ان کی کتاب کی مقبولیت کے لیے کافی قرار دیا ہے۔اس کی زبان شستہ اور طرز ادا عام فہم ہے شیخ الحدیث والادب مولانا سید اعزاز علیؒ فرماتے ہیں: تفسیر و ترجمہ مختصر اور قدرے تفصیل کے ساتھ اس قدر جامع ہے کہ بہت سے شبہات جو کہ آج کل قرآنی آیات کے متعلق کیے جاتے ہیں ترجمہ ہی سے دور ہو جاتے ہیں اور تفسیر دیکھنے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے۔اس لیے میرے نزدیک یہ تفسیریں اردو داں طبقہ، طلباء اور علماء کے لیے ضروری اور مفید ہے۔(۵)

مولانا عبدالوہاب خان (م۱۳۸۴ھ) نے ''**تقریب القرآن**'' کے نام سے تفسیر لکھی۔اس تفسیر میں سے صرف سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ دوسو صفحات میں شائع ہوئی۔اس میں سرسید احمد خان کی طرح قرآن کو عقلیت سے قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔قرآنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے عربی محاورات اور الفاظ و تراکیب لے لغوی مدلولات سے تجاوز نہیں کیا گیا۔یہ ترجمہ زیادہ لفظی ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ نے تفسیر ''معارف القرآن'' تصنیف کی۔اس تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کی تسہیل کی گئی ہے۔قرآن مجید کا ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی نے کیا ہے۔مختصر تفسیر ''خلاصہ تفسیر'' کے عنوان سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن سے لی گئی ہے۔اس کے بعد مفتی صاحب نے معارف مسائل کے عنوان سے قرآنی آیات کی تشریح کی ہے جو کئی عربی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔آیات کی لغوی اور نحوی تحقیق و تشریح بھی درج کی جاتی ہے۔جمہور نے ائمہ تفسیر کے جن اقوال کو راجح قرار دیا ہے انہی اقوال کے مطابق تفسیر کی گئی ہے۔۔یہ تفسیر فقہی مسائل و احکام کا خاطر خواہ ذخیرہ ہے، جس سے مسلک احناف کی بڑھ چڑھ کر ترجمانی کی گئی ہے۔یہ تفسیر اعتدال پر مبنی ہے امت کے مختلف طبقوں کے اختلافی مسائل کا ابطال نہایت عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے اور حق بات کو محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔یہ تفسیر گیارہ سال (جولائی ۱۹۵۴ء۔جون ۱۹۶۴ء) تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہی۔

یہ ایک جامع تفسیر ہے جس میں انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، قدیم سے جدید دنیا تک کے متعلق شرعی احکام درج ہیں۔

---

(۴) ڈاکٹر محمد قاضی حبیب اللہ قاضی چترالی، برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی، زم زم پبلشرز، ۲۰۱۵) ص:۴۶۶-۴۹۵

(۵) ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی، علم تفسیر اور اس کا ارتقاء۔2 (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۱۳) ص:۲۵۴، ۲۵۶

عصر حاضر کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، سائنسی اور قانونی پہلوؤں پر گفتگو بڑے دلنشین اور شرعی نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ تفسیر کے مقدمے میں علوم القرآن، علم تفسیر اور چند عربی تفاسیر سے متعلق معلومات بیان کی گئی ہیں۔ یہ مقدمہ مفسر کی فرمائش پر ان کے فرزند مفتی محمد تقی عثمانی نے تحریر کیا ہے۔ یہ تفسیر چونکہ معلومات کا خزانہ ہے اس لیے اہل علم کے ہاں کافی مقبول ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ''تفسیر ماجدی'' لکھی جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکتب فکر سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ یہ تفسیر بالماثور کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مولانا نے قدیم تفسیری ورثہ کو سامنے رکھتے ہوئے فقہ، تصوف اور کلام آثار پر بحث کی ہے۔ مولانا مغربی علوم کے ماہر تھے، تاریخ قدیم وجدید کو جاننے والے تھے۔ بائبل کے تمام ادوار ان کے سامنے تھے۔ اس لیے اس تفسیر میں تقابل ادیان کے لحاظ سے کافی مواد موجود ہے۔

4۔ پندرھویں صدی ہجری سے عصر حاضر تک کا اردو تفسیری ادب:

''معارف القرآن'' کے نام سے ہی مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی لکھی ہوئی تفسیر ہے۔ اس تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی فکر کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بھی کئی تفاسیر کے مطالعہ کا حاصل ہے۔ اس تفسیر میں فرق باطلہ کا ردعقلی اور نقلی انداز میں کیا گیا ہے۔ کئی شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ مولانا نے یہ تفسیر سلف صالحین کے انداز میں لکھی ہے۔ یہ تفسیر بالماثور ہے۔ یہ تفسیر بھی اعتدال پر مبنی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے گا۔

مولانا عاشق الٰہی بلندشہری نے ''**انوار البیان فی کشف اسرار القرآن**'' کے نام سے تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر اردو زبان کی سلیس، عام فہم مفصل اور جامع تفسیر ہے۔ اس میں قرآن اور حدیث سے تفسیر کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ احکام اور مسائل دلنشین انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اسباب نزول کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کو تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے حوالوں سے مزین کیا گیا ہے۔ مفسر کہیں کہیں مشکل الفاظ کی تحقیق کرتے ہیں۔ سورت سے قبل اس کا تعارف بھی پیش کیا جاتا ہے۔(٦)

حضرت مولانا حسین علی الوانیؒ کے شاگرد شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان نے **بلغة الحیران** کی طرز پر تفسیر ''جواہر القرآن'' لکھی، جو آپ کے رسالہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں ایک عرصہ تک شائع ہوتی رہی بعد میں تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ تفسیر کے مقدمہ میں تفسیری اصطلاحات اور مسئلہ الہ بیان کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مولانا حسین علیؒ کے ارشادات ونکات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تفاسیر خازن، قرطبی، روح المعانی، تفسیر کبیر اور ابن کثیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ہر سورت کے آغاز میں ہر سورۃ کا دعوی، ربط مضامین، خلاصہ اور دلائل وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں سورۃ سے مستفاد توحید کے مضامین پر مشتمل آیات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے ساتھ بین السطور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور مولانا محمود الحسن دیوبندی کے فوائد کا اہتمام کیا گیا ہے۔(٧)

اس عہد میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے ایک مقبول عام تفسیر ''تفہیم القرآن'' تصنیف کی۔ اس تفسیر کا آئندہ صفحات میں تفصیل سے تعارف پیش کیا جائے گا۔

پیر کرم شاہ الازہری نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' تصنیف کی۔ یہ تفسیر پانچ جلدوں میں ہے۔ پیر کرم شاہ غیر متشدد، غیر متعصب، نرم لہجہ کے مالک مفسر ہیں۔ اپنے مسلکی افکار کو ثابت کرنے کے لیے نرم لہجہ میں استدلال کی روشنی میں بات کرتے ہیں۔ کسی پر کیچڑ نہیں اچھالتے اور مخالف نظریہ رکھنے والوں کا نام ادب سے لیتے ہیں۔ ہر سورت کے شروع میں اس کا تعارف، زمانہ نزول، اس کے مضامین کا خلاصہ وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ اس تفسیر میں مسلک صوفیا کو ترجیح حاصل ہے۔

---

(٦) ڈاکٹر محمد قاضی حبیب اللہ قاضی چترالی، برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی، زم زم پبلشرز، ۲۰۱۵) ص: ۳۱۸-۳۳۶

(٧) ڈاکٹر محمد قاضی حبیب اللہ قاضی چترالی، برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی، زم زم پبلشرز، ۲۰۱۵) ص: ۴۰۲-۴۰۸

برصغیر میں مولانا حمید الدین فراہی نے قرآن کے بارے میں گہرے غور وفکر کا شعور دلایا۔انہوں نے صرف چند سورتوں کی تفسیر لکھی ہے۔اسے ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نے ''مجموعہ تفسیر فراہی'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کرایا۔تفسیر قرآن میں ان کا خاص نقطہ نظر ہے جو قرآن کے داخلی نظم سے متعلق ہے۔(۸)

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے استاد کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق تفسیر لکھی ہے۔یہ تفسیر ''تدبر قرآن'' کے نام سے ۹ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔یہ تفسیر اہل علم کے ہاں کافی مقبول ہے۔آئندہ صفحات میں اس تفسیر کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے گا۔

اس عہد کی ایک اور اہم تفسیر علامہ غلام رسول سعیدی کی ''تبیان القرآن'' ہے۔یہ تفسیر کئی تفسیروں کا خلاصہ معلوم ہوتی ہے۔اس تفسیر میں اسلام کے مسلمہ عقائد کو دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔آیات احکام میں تمام فقہی مسالک کا دلائل کے ساتھ ذکر ہے۔تفسیر باحوالہ ہے اور تاریخ اسلام سے بھی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔اکثر حوالہ جات البیان از احمد سعید کاظمی،احکام القرآن،تفسیر قرطبی،تفسیر البحر المحیط،تفسیر کبیر،درمنثور کے علاوہ تفسیر المراغی، تفسیر قاسمی اور فی ظلال القرآن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔اصول تفسیر کی روشنی میں آیات پر فنی گفتگو کی گئی ہے نیز اصول تفسیر سے متعلق نکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔فقہ حنفی پر قرآن وحدیث سے استدلال اور اس کی ترجیح کے دلائل دیے گئے ہیں۔اختلافی مسائل میں علمی انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔کئی جدید مسائل جیسے فوٹو گرافی،انتقال خون،ضبط تولید،ٹیلیفون پر نکاح وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔تفسیر میں کسی کے خلاف غیر سنجیدہ لہجہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔(۹)

اردو میں کئی گمراہ کن تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں۔یہ تفسیر بالرائے المذموم کی نمائندہ ہیں۔ان میں غلام احمد پرویز کی تفسیر ''مطالب الفرقان'' سر فہرست ہے۔اس قسم کی تفاسیر میں روایت اور سلف صالحین کے انداز تفسیر سے بغاوت کی راہ اختیار کی گئی ہے اور محض اپنی عقل سے قرآن کی تفسیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے علاوہ قادیانیوں نے بھی اپنی خواہشات سے قرآن کی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

(۸) ڈاکٹر خالد علوی،سید مودودی بحیثیت مفسر(لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،س ن)ص:۱۷

(۹) ڈاکٹر محمد قاضی حبیب اللہ قاضی چترالی،برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ(کراچی،زم زم پبلشرز،۲۰۱۵)ص:۵۲۶-۵۶۰

ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی،علم تفسیر اور اس کا ارتقاء۔2(اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۳)ص:۳۱۰

اردو تفسیری ادب کا تقابل

عربی زبان کے بعد قرآن مجید کی سب سے زیادہ تفاسیر اردو زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔اردو تفسیری ادب کا آغاز ایک نامکمل تفسیر سے ہوا۔ابتدا میں قرآن مجید کے ترجمہ کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن مجید کے ترجمہ کی ابتدا کی۔آپ نے فتح الرحمان کے نام سے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔اردو ترجمہ اور تفسیر میں آپ کے بیٹے شاہ عبدالقادر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کا پہلا بامحاورہ ترجمہ کیا۔اردو زبان کی خوبیوں سے مالا مال یہ ترجمہ بعد میں آنے والے تراجم کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے بعد جس نے بھی اردو ترجمہ کیا ہے،اس نے اس ترجمہ سے رہنمائی ضرور حاصل کی ہے۔اسی طرح اردو زبان میں لفظی ترجمہ کی ابتدا کرنے کا اعزاز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کو حاصل ہے۔غرض برصغیر میں قرآن مجید کے اردو ترجمہ اور تفسیر کی ابتدا کرنے کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندوں کے سر ہے۔

اردو تفسیری ادب تفسیر کے وسیع سرمائے پر مشتمل ہے۔یہ تفسیری ادب کئی قدیم وجدید عربی تفاسیر،احادیث مبارکہ،اقوال صحابہ وتابعین،فقہی آرا،ربط آیات اور بعض تفسیری تفردات پر محیط ہے۔اس طرح اردو تفسیری ادب تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔لیکن اردو زبان میں لکھی جانے والی اکثر تفاسیر تفسیر بالرائے المحمود کی نمائندہ ہیں۔کچھ تفاسیر طویل اور نامکمل ہونے کی وجہ سے زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں۔

زبان چونکہ تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے اس لیے اردو میں بھی کافی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔پرانی اردو اور اس کے بعض الفاظ اب قابل فہم نہیں رہے۔کئی قدیم اردو تفاسیر آج کے دور میں اس لیے شائع نہیں ہوسکتیں کہ اب وہ قابل فہم نہیں رہیں۔اس لیے ہر دور کے مفسرین لسانی تبدیلیوں کا لحاظ رکھ کر تفسیر لکھتے ہیں۔اس لیے وہ تفاسیر زیادہ مطالعہ کی جاتی ہیں جو عام فہم ہوں اور عالمانہ مباحثوں کی بجائے سادہ اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہوں۔کئی تفاسیر کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے آج ہم ان تفاسیر سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔

اردو تفسیری ادب کے دوسرے دور میں بعض ایسی تفاسیر سامنے آئیں جن میں تجدد پسند نظریات کی ترجمانی کی گئی۔اس سلسلے میں نمایاں نام سر سید احمد خان کی تفسیر کا ہے۔جنکی تفسیر سے عقائد امت پر زد پڑی اور نئی نسل کے سامنے بے حقیقت نظریات پیش کیے گئے۔نبوت کو وہبی کی بجائے کسبی قرار دیا گیا۔معجزات،جنت ودوزخ،فرشتوں اور شیاطین کے وجود سے انکار کیا گیا۔قرآنی صداقت کے لئے جدید اصول تجویز کیے گئے۔ ہندوستان کے مشہور مفسر مولانا عبدالحق حقانیؒ نے اسے تحریف قرار دیا۔ڈاکٹر خالد علوی اس طرز تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''برطانوی تسلط کے زیر اثر جو معذرت خواہانہ انداز پیدا ہوا،اس کی نمایاں شخصیت سر سید احمد خان کی ہے۔جنہوں نے اعتزال کو نئے لباس اور نئے اضافوں کے ساتھ پیش کیا۔سر سید نے راسخ العقیدہ لوگوں کے بارے میں تضحیک آمیز رویہ اختیار کیا۔انہوں نے علماء سے نفرت کا ایسا اسلوب اختیار کیا جو بالآخر اسلام کی نفرت پر منتج ہوا۔۔۔سر سید نے تہذیب الاخلاق میں جس نئے فکر کی بنیاد ڈالی تھی اس کی وجہ سے وہ نیچری اور کرسٹان کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔حالی نے حیات جاوید میں تفسیر القرآن کے باون ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں سر سید نے عام نہج سے ہٹ کر بات کی ہے''۔(۱)

تجدد پسندانہ تفسیر کے سلسلے میں دوسرا نمایاں نام حافظ ڈپٹی نظیر احمد کی ''غرائب القرآن'' کا ہے۔اس ترجمہ کو علماء نے پسند نہیں کیا اور اس پر تنقید کی گئی ہے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''اصلاح ترجمہ دہلویہ'' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔دوسرا رسالہ ابو محمد عبداللہ محدث چھپراوی نے ''**رفع الغواشی عن وجوه الترجمة والحواشی** ''لکھا۔

---

(۱) ڈاکٹر خالد علوی،سید مودودی بحیثیت مفسر(لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،س ن)ص:۱۱،۱۲

اردو زبان میں سب سے پہلے جو ضخیم، بسیط، مفصل اور مدلل تفسیر سامنے آئی وہ مولانا عبدالحق حقانیؒ کی تفسیر ''فتح المنان'' ہے۔ یہ تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تفسیر روایت اور درایت کا حسین امتزاج ہے۔ باطل مذاہب اور باطل شکوک وشبہات کی تردید مدلل انداز میں کی گئی ہے۔ سرسید احمد خان کی اغلاط کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کا مقدمہ علوم القرآن کے حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ تفسیر کا مقدمہ ''**البیان فی علوم القرآن**'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ بے مثال مقدمہ برصغیر پاک وہند میں علوم القرآن کی اساس سمجھا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ کئی تفاسیر سلیس اردو زبان میں، مختصر اور جامع انداز میں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ کئی تفاسیر ایسی ہیں جو پہلے کسی دینی رسالے یا اخبار کے اندر قسط وار شائع ہوتی رہیں بعد میں ان کو ایک کتاب کی شکل مل گئی۔ اس طرح جو تفسیر لکھی جاتی رہی وہ ساتھ ساتھ شائع بھی ہوتی رہی۔ بالآخر وہ ایک جامع اور ضخیم تفسیر کی صورت میں منظر عام پر آئی۔

بعض تفاسیر فقہی انداز میں لکھی گئی ہیں اور فقہ حنفی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بعض تفاسیر میں تقابل ادیان کا رنگ غالب ہے۔ بعض تفاسیر میں فرق باطلہ کا رد احسن انداز میں کیا گیا ہے۔ کسی تفسیر میں آیات قرآنی کے ربط اور نظم پر زیادہ توجہ دی گئی ہیں۔ بعض تفاسیر میں صوفیانہ تفسیر کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ کئی تفاسیر مسلکی انداز میں بھی لکھی گئی ہیں۔ یہ تفاسیر دیوبندی، بریلوی، اور غیر تقلیدی رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان تفاسیر کا منفی پہلو یہ ہے کہ دوسرے مسلک کی مخالفت میں غلو سے کام لیا گیا ہے۔ بعض تفاسیر میں جدید فقہی مسائل کا حل پیش کرنا قابل تعریف ہے۔

غرض اردو زبان میں بہت زیادہ تفاسیر لکھی گئی ہیں کئی ایسی تفاسیر بھی ہیں جن کا ذکر نہیں کیا جا سکا کیونکہ تمام تفاسیر کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اردو میں تفاسیر لکھنے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور عصر حاضر میں بھی کئی علماء تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں۔ کئی عربی تفاسیر کے اردو تراجم بھی کیے جا رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو تفسیری ادب وسیع سرمائے پر مشتمل ہے۔ تمام تفاسیر مختلف افکار کی نمائندہ ہیں اور ابھی تک تفسیر کے کسی نہ کسی پہلو پر تشنگی محسوس کی جاتی ہے۔

یونیورسٹیز کی سطح پر تفسیر کو باقاعدہ ایک مضمون اور میدان کی حیثیت حاصل ہے اور اس فن پر عبور حاصل کرنے کے لیے کئی طلبہ تحقیق میں مصروف ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور کئی دیگر یونیورسٹیز میں تفسیر میں تخصص ایم اے اور ایم فل کی سطح پر کرایا جا رہا ہے۔ کئی طلبہ اس حوالے سے تحقیقی مقالات لکھ چکے ہیں اور بعض لکھنے میں مصروف ہیں۔ اب اردو زبان میں کافی حد تک یہ اہلیت ہے کہ اس کے ذریعے اردو جاننے والے افراد کتاب اللہ کے معنی اور مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔

کچھ مفسرین نے روایتی تفسیری انداز سے ہٹ کر تفسیر میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن کی یہ کوشش قرآن وسنت کے مطابق محمود رائے پر مشتمل ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ لیکن جن کی یہ کوشش قرآن وسنت سے ہٹ کر روایت سے بغاوت پر مشتمل ہے ان کی تفسیری کاوش قابل مذمت ہے کیونکہ وہ شیطانی اغراض کی تکمیل تو ہو سکتی ہے کتاب اللہ کی تفسیر نہیں۔ اس لیے اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن مجید کی صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

فصل چہارم:

منتخب اردو تفاسیر کا تعارف

1۔ تفسیر بیان القرآن

1۔ مفسر کا تعارف:

یہ تفسیر حکیم الامت، مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر ہے۔ آپ کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۹ ستمبر ۱۸۶۳ء میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر۔ یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام کرم عظیم (عبدالغنی بھی) تھا۔ پانچ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد نے تربیت و پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ ذکاوت و ذہانت کے آثار بچپن ہی میں نمایاں تھے۔ بچپن ہی سے نماز روزے کا شوق تھا۔ مولانا شیخ محمد محدث تھانوی جو میاں جی نور **محمد جھنجھالوی** کے اجل خلفاء میں تھے، انہوں نے اشرف علی کو بچپن میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ لے گا۔

قرآن شریف حافظ حسین علی سے حفظ کیا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے وطن میں ہی حضرت مولانا فتح محمد تھانوی سے پڑھیں جو دارالعلوم کے ابتدائی فارغین میں سے تھے۔ فارسی کی کچھ اعلیٰ کتابیں اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد دیوبند آگئے۔ نومبر ۱۸۷۸ء بمطابق ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ کے اواخر میں تکمیل علوم کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ یہاں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید احمد صاحب، مولانا عبدالعلی صاحب اور ملا محمود وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ تجوید وقرأ ت کی مشق مکہ مکرمہ میں قاری عبداللہ مہاجر مکی سے کی۔

۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خط کے ذریعہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی غائبانہ بیعت کی ۔۱۳۰۱ھ کے آخر میں فریضہ حج ادا کرنے کے بعد حضرت حاجی صاحب سے باقاعدہ اخذ فیض فرمایا۔ ۱۳۱۰ھ میں دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا اور چھ ماہ تک استفادہ فرمایا۔ حضرت تھانوی شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مجاز خلیفہ تھے۔

۱۳۰۱ھ میں اولا مدرسہ فیض عام کان پور میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مدرسہ جامع العلوم کی مسند صدارت کو زینت بخشی۔ کان پور میں آپ کے درس حدیث کی شہرت سن کر دور دور سے طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ میں ملازمت ترک کر کے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں متوکلا علی اللہ قیام فرمایا، جہاں تادم واپسیں ۴۷ سال تک تبلیغ دین، تزکیہ نفس اور تصنیف و تالیف کی ایسی عظیم الشان اور گراں قدر خدمات انجام دیں جن کی مثال اس دور کی کسی دوسری شخصیت میں نہیں ملتی۔

آپ کا علم نہایت وسیع اور گہرا تھا جس کا ثبوت آپ کی تصانیف کا ہر صفحہ دے سکتا ہے۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تصانیف موجود نہ ہوں۔ وہ اپنی تصانیف کی کثرت اور افادیت کے لحاظ سے ہندوستانی مصنفین میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد 350 کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ تین سو کے قریب وہ مواعظ ہیں جو چھپ چکے ہوں۔ بہشتی زیور آپ کی مقبول عام کتاب ہے جو ہر سال مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

آپ کی بیعت وارشاد کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ برصغیر اور اس کے باہر بھی ہزاروں اشخاص نے ان سے اصلاح و تربیت حاصل کی چنانچہ حکیم الامت کے لقب سے آپ کی زبردست شہرت تھی۔ ان کی رفعت و بلندی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے بڑے صاحب علم وفضل اور اہل کمال ان کے حلقہ بیعت میں شامل تھے۔ ان کی ذات والا صفات علم و حکمت اور معرفت و طریقت کا ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی تک برصغیر کے مسلمان سیراب ہوتے رہے۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ان کی عظیم خدمات تقریری اور تصنیفی صورت میں نمایاں نہ ہوں۔

رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراط مستقیم کی راہ دکھائی ۔تبلیغ ،تعلیم ،سیاست ،معاشرت ،اخلاق وعبادات اورعقائد میں دین خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی ،فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ احسان وسلوک جس کا مشہور نام ''تصوف'' ہے،تجدید فرمائی ۔آپ نے متحدہ قومیت کی مخالفت کی اور جہاد کی اہمیت پر زور دیا۔مسلم لیگ کی حمایت کی اور اس کی خامیوں اور خرابیوں پر تنقید بھی کی ۔مسلمانوں کی موجودہ زندگی میں موجود نقائص کو درست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی بڑی منظّم تھی کاموں کے اوقات مقرر تھے اور ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا تھا۔متوسلین کے بہت سے خطوط آتے تھے مگر بغیر وقت ہر ایک کا جواب خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے ۔۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ بمطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی رات کو آپ کا ۸۲ سال تین ماہ کی عمر میں انتقال ہوا۔نماز جنازہ مولانا ظفر احمدؒ عثمانی صاحب نے پڑھائی ۔تھانہ بھون میں حافظ ضامن شہید کے مزار کے قریب انہی کے باغ میں جسے انہوں نے خانقاہ امدادیہ کے نام سے وقف کر دیا تھا،دفن کیا گیا۔(۱)

تفسیر ''بیان القرآن'' کا سبب تالیف:

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار سے بھی کبھی کبھی خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن لکھی جائے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو مگر تفاسیر وتراجم کی کثرت دیکھ کر اس کو امر زائد سمجھا جاتا تھا۔اسی اثناء میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمہ شائع کرنا شروع کئے،جن میں بکثرت مضامین خلاف قواعد شرعیہ بھر دیے جن سے عام مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔

آپ نے یہ ترجمہ اس ضرورت کے تحت لکھا کہ قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا جائے جو قابل فہم ہونے کے ساتھ تحت اللفظ بھی ہو اور اسے ہندوستان کے تمام لوگ سمجھ سکیں ،نیز کوئی ضروری مضمون جو قرآن مجید کا حصہ یا اس کے ترجمہ سے متعلق ہو رہ نہ جائے ۔آپ نے اس ترجمہ میں محاورات کو استعمال نہیں کیا کیونکہ آپ نے کہا کہ میں گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں اور دوسرا یہ کہ ہر جگہ کے محاورے مختلف ہوتے ہیں اور ایک جگہ کے محاورے دوسری جگہ پر سمجھ میں نہیں آتے ۔(۲)

ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں آپ نے ترجمہ لکھنا شروع کیا ۔یہ ترجمہ مولانا نے ۱۳۲۳ھ بمطابق ۱۹۰۵ء میں مکمل کیا تھا۔یہ تفسیر ڈھائی سال میں مکمل ہوئی ۔۱۳۲۶ھ بمطابق ۱۹۰۸ء میں مطبعہ مجتبائی دہلی سے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی ۔(۳)

تفسیر ''بیان القرآن'' کا منہج واسلوب:

تفسیر ''بیان القرآن'' میں ہر آیت کے نیچے اس کا بامحاورہ ترجمہ لکھا گیا ہے ۔اس کے بعد ''**مسائل السلوك من كلام ملك الملوك**'' عربی زبان میں لکھے تھے اب ان کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے ۔تفسیر کو اردو زبان میں بعنوان ''**رفع الشكوك فى ترجمة مسائل السلوك**'' لکھا۔اس کے بعد ''**وجوه المثانى فى توجيه الكلمات والمعانى**'' عربی زبان میں لکھے جن میں لغت،نحو اور قرأت سبعہ پر بحث فرمائی ہے۔

---

(۱) سید محبوب رضوی،تاریخ دار العلوم دیوبند(لاہور:المیزان ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۵ء)ج:۲،ص:۵۱-۵۴

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی ،تاریخ دعوت وجہاد(لاہور،ادارہ معارف اسلامی،۲۰۰۰ء)ص:۲۸۸

ڈاکٹر عبد الحمید خان عباسی،علم تفسیر اور اس کا ارتقاء۔2(اسلام آباد:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۳)ص:۲۳۷

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی،مقدمہ تفسیر بیان القرآن(ملتان:ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ)ج:۱،ص:۲۱

(۳) ڈاکٹر صالحہ عبد الحکیم،قرآن حکیم کے اردو تراجم(کراچی:قدیمی کتب خانہ،۱۹۸۱ء)ص:۲۷۸

حکیم عبدالقوی صاحب دریا آبادی تفسیر بیان القرآن کا منہج واسلوب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی تفسیر کا انداز خاص یہ ہے کہ اولاً آیات قرآنی کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے۔ پھر تفسیر بایں طور کہ پہلے مشکل الفاظ کی شرح وتوضیح اور اس کی ترکیب نحوی۔ اس کے بعد یہ تفصیل بتائی جاتی ہے کہ دوسرے مفسروں نے اس کی کیا تفسیر کی ہے اور پھر ان مختلف اقوال تفسیری میں کسی ایک قول کو مولانا تھانوی ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت اہم نکات بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کی آیات میں ربط کی وضاحت بھی کرتے جاتے ہیں اور جابجا تصوف ومعرفت کے نفیس نکات بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ کم استعداد کے لیے بھی مولانا تھانوی کا ترجمہ از حد نافع ہے، لیکن تفسیر اہل علم ہی کے کام کی ہے۔ امید ہے وہ اس تحفہ نایاب کی قدر کریں گے۔''(۴)

تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات:

۱۔ یہ تفسیر اردو زبان میں اعلیٰ پائے کی تحقیقات پر مشتمل ہے۔
۲۔ اس تفسیر کو افادیت، جامعیت اور مقبولیت میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔
۳۔ یہ مختصر اور جامع تفسیر ہے۔ یہ قدیم عربی تفاسیر کا مجموعہ ہے۔ اس نے کئی تفاسیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔
۴۔ اس تفسیر میں بڑے بڑے اشکالات کو چند الفاظ میں حل کیا گیا ہے۔
۵۔ قرآن مجید کا ترجمہ سلیس، آسان اور دلنشین ہے۔
۶۔ یہ تفسیر عقائد، احکام، علم الکلام اور اعجاز القرآن سے متعلق وسیع معلومات کا ذخیرہ ہے۔
۷۔ اس تفسیر میں سورتوں اور آیات کا ربط انتہائی آسان انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
۸۔ مفسر نے صحیح روایات کو درج کیا ہے، نیز یونانی افکار اور اسرائیلیات سے اجتناب کیا ہے۔
۹۔ صرف ان شبہات کا جواب دیا ہے جن کا منشاء کوئی صحیح دلیل تھی، جیسے کوئی آیت، حدیث یا عقل یا حس سے ثابت کوئی حکم۔
۱۰۔ مفسر نے سابقہ آسمانی کتابوں کے مباحث تفسیر حقانی سے نقل کیے ہیں۔
۱۱۔ فقہی اور کلامی مسائل کو طول دینے سے اجتناب کیا گیا ہے۔
۱۲۔ حدیث مرفوع کے مقابلے میں کسی کا قول نقل نہیں کیا گیا۔
۱۳۔ مختلف مقامات پر بیان ہونے والے تفصیلی اور تحقیقی مضامین کو ایک ہی جگہ تفصیل سے بیان کر کے باقی مقامات پر ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔
۱۴۔ راجح اقوال کو اختیار کیا گیا ہے۔

غرض یہ تفسیر اپنے دور کی عظیم تفسیر ہے اور ایک تفسیری فکر کی امام ہے اور علماء نے اس تفسیر کو سامنے رکھ کر تفسیر لکھنے کی کوشش کی ہے۔

---

(۴) ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم، قرآن حکیم کے اردو تراجم (کراچی: قدیمی کتب خانہ، ۱۹۸۱ء) ص:۲۸۹

2۔معارف القرآن

مفسر کا تعارف:

یہ تفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تصنیف ہے۔آپ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ بمطابق ۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو بھوپال شہر میں پیدا ہوئے۔آپ کا آبائی وطن کاندھلہ تھا۔آپ کا سلسلہ نسب خلیفۃ المسلمین،امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔آپ مثنوی مولانا روم کے ساتویں دفتر کے مؤلف مفتی الٰہی بخش کی اولاد میں سے ہیں۔آپ کے والد کا نام مولانا حافظ محمد اسماعیل کاندھلویؒ تھا۔

آپ نے اپنے آبائی گاؤں کاندھلہ میں قرآن مجید کو حفظ کیا۔اس کے بعد آپ کے والد آپ کو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مدرسہ اشرفیہ تھانہ بھون لے گئے جہاں آپ نے درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علاوہ مولوی عبداللہ (مولف تیسیر المنطق) سے بھی آپ نے تعلیم حاصل کی۔اس مدرسہ میں صرف ابتدائی تعلیم کا انتظام تھا۔اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آپ کو سہارنپور لائے اور مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم میں داخل کرایا۔مظاہر العلوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ،مولانا حافظ عبداللطیف،مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے تعلیم حاصل کی اور انیس برس کی عمر میں سند فراغ حاصل کی۔اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں دوبارہ دورہ حدیث میں داخلہ لیا اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ،علامہ شبیر احمد عثمانیؒ،میاں اصغر حسین دیوبندیؒ اور مفتی عزیز الرحمان جیسے جلیل القدر محدثین سے تعلیم حاصل کی۔

آپ نے تدریس کا آغاز مدرسہ امینیہ دہلی سے کیا جو مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے قائم کیا تھا۔مدرسہ امینیہ میں ایک سال پڑھانے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا اعزاز حاصل ہوا جہاں آپ نو سال تک پڑھاتے رہے۔اس کے بعد آپ حیدرآباد دکن تشریف لائے جہاں آپ نے ۹ سالہ قیام کے دوران ''**التعليق الصبيح على مشكٰوة المصابيح**'' تصنیف کی۔یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔

اس کے بعد دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں (مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کی دعوت پر) شیخ التفسیر کی حیثیت سے دس سال تک خدمات سرانجام دیں۔یہاں تفسیر بیضاوی،تفسیر ابن کثیر،سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الآثار جیسی امہات الکتب پڑھائیں۔

آپ دوقومی نظریہ کے زبردست حامی تھے۔مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا ادریس کاندھلوی نے پاکستان کی طرف ہجرت کی اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کے طور پر تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔۱۹۵۱ء میں مولانا ادریس کاندھلوی جامعہ اشرفیہ لاہور کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔مفتی محمد حسن صاحب نے آپ کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کیا۔آپ ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء سے تادم زندگی جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

آپ نے **الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی**،مقدمہ تفسیر،**تحفة القاری بحل مشكلات البخاری**، **احسن الحديث فی ابطال التثليث**،حجیت حدیث،سیرۃ المصطفیٰ،خلافت راشدہ،عقائد اسلام وغیرہ جیسی نادر کتب تصنیف کیں۔کہتے ہیں آپ کی جملہ تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے۔

آپ کا انتقال ۸ رجب ۱۳۹۴ھ بمطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کو طلوع آفتاب سے قبل ہوا۔آپ کی نماز جنازہ آپ کے بیٹے مولانا محمد مالک کاندھلوی نے پڑھائی۔(۱)

سید محبوب رضوی ''مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابت،۱۴۳۴ھ) ج:۱ص:۳-۸

سید محبوب رضوی،تاریخ دارالعلوم دیوبند (لاہور: المیزان ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۵ء) ج:۲ص:۱۳۷،۱۳۸

''صلاح وتقوی کے آثار شروع ہی سے نمایاں تھے۔حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔تفسیر ،حدیث ،کلام اور عربی ادب میں انھیں خاص شغف تھا۔عربی اور فارسی میں برجستہ اشعار لکھنے کا انہیں اچھا ملکہ حاصل تھا ۔علم وفضل ،زہد وتقوی اور اتباع سلف میں ان کا بڑا مقام تھا۔تقوی اور خشیت الٰہی کے آثار نمایاں طور پر ان کے چہرے سے محسوس ہوتے تھے۔نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔حق گوئی میں نہایت جری اور بے باک تھے، سچی بات بلاخوف لومۃ لائم برملا کہنے میں کبھی تامل نہیں ہوتا تھااوراس میں کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے۔علم وعمل میں سلف صالح کا نمونہ تھے۔علم سے ان کے اشغال کا یہ عالم تھا کہ تمام علوم میں استحضار تام رکھتے تھے۔ممتاز عالم دین اور بلند پایہ ارباب تدریس میں ان کا شمار تھا۔''(۲)

علم میں تھے شاہ انورؒ فکر میں اشرف علی　　　　اللہ اللہ کیا شئوں تھے حضرت ادریسؒ میں

تفسیر معارف القرآن کا سبب تالیف:

مفسر نے یہ ضرورت محسوس کی کہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ایک تفسیر تحریر کی جائے۔یہ تفسیر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کی طرز پر تحریر کی جائے۔اس تفسیر میں قرآنی آیات کی توضیح اور ربط آیات کے علاوہ صحیح احادیث اور اقوال صحابہ وتابعین کو درج کیا جائے۔مشکل مسائل کی تحقیق کی جائے۔باطل فرقوں کے شبہات واعتراضات کے مدلل جواب تحریر کیے جائیں۔علمی نکات کو بیان کیا جائے۔تفسیر کو پوری امانت داری کے ساتھ صحیح انداز میں مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے۔کچھ آزاد خیال مفسرین تفسیر قرآن کے نام پر اپنی رائے ،خیال اور نظریہ سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔وہ تحریف اور تاویل کے ذریعے قرآن عظیم کی تعلیمات کو مغرب کے مطابق بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔یہ الحاد ہے اور مسلمانوں کو اسی الحاد سے بچانے کے لیے اس تفسیر کو تحریر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اس تفسیر کی تالیف کا آغاز ۲۴ شوال المکرّم ۱۳۸۲ھ بمطابق ۱۹۶۲ء میں ہوا۔مفسر نے سورہ صافات کے اختتام تک تفسیر لکھی تھی کہ ان کی وفات ہوگئی۔سورہ صٓ سے آگے آپ کے فرزند مولانا محمد مالک کاندھلویؒ نے اس تفسیر کو مکمل کیا۔مولانا محمد مالک کاندھلویؒ نے تفسیر کی تالیف میں اپنے والدگرامی کے منہج واسلوب کی پیروی کی۔

تفسیر ''معارف القرآن'' کی خصوصیات:

۱۔یہ تفسیر متقدمین اور متاخرین کے علوم ومعارف کا خزانہ ہے۔
۲۔سورتوں اور آیات کے ربط کو بیان کیا گیا ہے۔
۳۔صحیح احادیث اور صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال سے تفسیر کی گئی ہے۔
۴۔ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے شبہات کا مدلل اور مفصل جواب دیا گیا ہے۔
۵۔فرق باطلہ کا رد علمی اور تحقیقی انداز میں کیا گیا ہے۔
۶۔بامحاورہ ترجمہ کے ساتھ ضروری تشریحات درج کی گئی ہیں۔
۷۔فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔
۸۔شیخ محی الدین ابن عربیؒ، حضرت حسن بصریؒ اور مولانا روم کے صوفیانہ اور ذوقی معارف بیان کیے گئے ہیں۔

---

(۲) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند(لاہور:المیزان ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۵ء) ج:۲:ص:۱۳۷

۹۔مختلف تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد قول راجح بیان کرتے ہیں۔
۱۰۔ماخذ میں سب سے زیادہ امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر ''مفاتیح الغیب'' اور علامہ محمود آلوسی کی تفسیر ''روح المعانی'' پر بھروسہ کرتے ہیں۔
۱۱۔تفسیر میں آپ کا محدثانہ اور متکلمانہ رنگ غالب ہے۔بعض مقامات پر حدیث کی سند کو زیر بحث لاتے ہیں۔یہ خصوصیت آپ کے ہم عصر مفسرین میں بہت کم نظر آتی ہے۔
۱۲۔اس تفسیر میں معجزات کی صحیح حقیقت اور حقانیت پر بھرپور بحث موجود ہے۔
۱۳۔بعض موضوعات پر انتہائی تفصیل سے لکھتے ہیں اور بڑے علمی نکات بیان کرتے ہوئے دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔مثلا

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (البقرہ ۲:۳۷)

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لیے (جن کے ذریعے انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے توبہ قبول کی۔بے شک وہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کی تفسیر مولانا نے بیس صفحات پر لکھی ہے۔انبیاء کی معصومیت کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے عصمت کے معنی ،معصیت کے معنی ،متعلقات عصمت کی چار اقسام، ولی اور رسول میں فرق بیان کرنے کے بعد عصمت انبیاء پر سترہ دلائل دیے ہیں۔اس سلسلے میں آپ نے علماء اسلام کے مسلک کو خوب واضح کیا ہے۔(۳)

☆۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّا رٍ وَخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۷:۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ نے شیطان کے اس دعوی کو غلط قرار دیا ہے اور نو دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عنصر ترابی ،عنصر ناری سے بہتر ہے۔مثلا وہ لکھتے ہیں:

آگ بالطبع مفسد اور مہلک ہے،احراق اور اتلاف اس کا خاصہ ہے بخلاف تراب کے کہ وہ نہ مہلک ہے نہ محرق۔
اسی طرح زمین میں اگر کوئی بیج رکھا جائے تو وہ اسے کئی گنا بڑھاتی ہے جبکہ آگ میں جو کچھ رکھا جائے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔(۴)

غرض تفسیر معارف القرآن مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیری فکر کی نمائندہ تفسیر ہے۔مفسر اسے کئی تفاسیر کے مطالعے اور تفسیر کی تدریس کے بعد تفسیر لکھتے ہیں تو اس لحاظ سے یہ قرآن مجید کی ایک جامع تفسیر ہے۔

---

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابت، ۱۴۳۴ھ) ج:۱ص:۱۳۳-۱۵۲

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابت، ۱۴۳۴ھ) ج:۱ص:۱۲۶-۱۲۸

3۔ تفسیر تفہیم القرآن

مفسر کا تعارف:

اس تفسیر کے مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔سید ابوالاعلیٰ کا تعلق سادات اہل بیت کی معروف شاخ سلسلہ مودودیہ سے تھا۔ان کے جد امجد خواجہ قطب الدین مودود چشتی ،حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے دادا پیر تھے۔خواجہ اجمیری کے شیخ حضرت عثمان ہارونی،ان کے شیخ حضرت جامی شریف زندانی اوران کے شیخ قطب الدین مودود چشتیؒ تھے۔اس طرح خواجہ مودود برعظیم میں سلسلہ چشتیہ میں خاندان مودودیہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

حضرت خواجہ مودودی کی اولاد میں سے خواجہ ابوالاعلیٰ مودودی چشتی نے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں کرنال میں سلسلہ رشد وہدایت کو منظم کیا ۔۱۸۵۵ء میں اسی خاندان میں سید حسن کے ہاں احمد حسن کی پیدائش ہوئی جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کے والد گرامی ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ولادت ۳ رجب المرجب ۱۳۲۱ھ بمطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد دکن میں ہوئی۔والد ماجد نے آپ کا نام اپنے ایک خاندانی بزرگ کے نام پر ’’ابوالاعلیٰ‘‘ رکھا۔

ابوالاعلیٰ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔۱۹۱۴ء میں انہوں نے مولوی کا امتحان ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں پاس کیا۔اس کے بعد ان کے والد خرابی صحت کی وجہ سے حیدرآباد آگئے جہاں آپ نے دارالعلوم حیدرآباد کی جماعت مولوی عالم (انٹرمیڈیٹ سال اول) میں داخلہ لیا ۔چھ ماہ کے بعد آپ کے والد بیمار ہوگئے اور علاج معالجہ کے لیے بھوپال تشریف لائے ،جس سے آپ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

دہلی میں قیام کے دوران انہوں نے ایک استاد مولوی محمد فاضل سے پانچ ماہ تک انگریزی سیکھتے رہے۔اس دوران انہوں نے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ انگریزی میں اخبارات رسائل اور کتب کا مطالعہ از خود کرنے لگے۔اس کے بعد انہوں نے دارالعلوم فتح پوری دہلی میں داخلہ لیا اور باقاعدہ تکمیل درس کی سند حاصل کی۔اسی زمانے میں انہوں نے مشہور عالم دین مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی سے حدیث فقہ اورادب میں سند فراغت وتدریس حاصل کی۔مولانا شریف اللہ صاحب سے دو علوم ’’عقلیہ وادبیہ وبلاغت‘‘ اور ’’علوم اصلیہ وفروعیہ‘‘ میں سند فراغت حاصل کی۔قیام دہلی کے دوران ہی ابوالاعلیٰ نے نحو،معقولات اور معانی وبلاغت کی تعلیم خیرآبادی خاندان کے علمی وارث مولانا عبدالسلام نیازی سے حاصل کی۔اپنے تبحر علمی اور درویشی کی وجہ سے مولانا نیازی علمائے سلف کے یادگار تھے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۱۸ء میں ۱۵ برس کی عمر میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔آپ کا پہلا مضمون ’’برق یا کہربا‘‘ ۱۹۱۸ء میں معارف ،اعظم گڑھ کے اکتوبر کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔آپ نے اپنے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی کے ساتھ اخبار ’’مدینہ‘‘ بجنور میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔۱۹۱۹ء میں جبل پور سے ہفتہ وار ’’تاج‘‘ شائع ہوا اس کی ارادت بھی انہی دونوں بھائیوں کے سپرد کی گئی۔۱۹۲۱ء میں جمیعت علمائے ہند کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے زیر اہتمام اخبار ’’مسلم‘‘ جاری ہوا اور اس کی ادارت ابوالاعلیٰ کے سپرد کی گئی۔لیکن یہ اخبار ۱۹۲۳ء میں بند ہوگیا ۔۱۹۲۵ء میں جمیعت علمائے ہند کے صدر احمد سعید نے ’’الجمیعت‘‘ جاری کیا اور قدیم تعلقات کی بنیاد پر انہوں نے مولانا مودودی کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔

ادارہ عالمگیر تحریک قرآن کی طرف سے ماہنامہ ترجمان القرآن ۱۳۵۱ھ بمطابق ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن سے مولانا ابومحمد مصلح صاحب نے جاری کیا۔یہ رسالہ چھ شماروں تک مولانا موصوف کی ادارت میں نکلتا رہا۔اس کے بعد ابوالاعلیٰ مودودی نے اس رسالہ کو خرید لیا اور تادم زندگی اس کی ادارت کرتے رہے۔اس کے علاوہ آپ دیگر موقر جریدوں صدق ،رہبر،طلوع اسلام ،معارف ،نگار، ہمایوں ،مخزن اور ساقی وغیرہ میں مضامین اور مقالے شائع کرتے رہے۔

آپ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی دعوت پر مارچ ۱۹۳۸ء میں دارالاسلام ٹرسٹ پٹھان کوٹ تشریف لے گئے ۔۱۹۳۹ء میں آپ لاہور منتقل ہوگئے۔یہاں ایک سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے اعزازی پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیں ،جس سے دینیات کے مضمون میں

نئی زندگی پیدا ہوگئی ۔۱۹۴۲ء میں چودھری نیاز علی (بانی دارالاسلام ٹرسٹ) کی دعوت پر دوبارہ پٹھان کوٹ تشریف لے گئے اور تقسیم ہند تک وہیں اشاعت دین کا کام کرتے رہے۔

۱۹۴۰ء میں یو پی پراونشل مسلم لیگ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ پارک پونچھ روڈ میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔

۱۹۵۳ء میں پمفلٹ ''قادیانی مسئلہ'' شائع کرنے کی پاداش میں سزائے موت ہوئی جو بعد میں ۱۴ سال قید بامشقت میں تبدیل ہوگئی۔لیکن ڈھائی سال بعد ہائی کورٹ نے بری کردیا۔

۱۹۵۶ء میں حج وزیارت کے لیے ارض مقدس کا سفر کیا۔آپ کی خواہش تھی کہ قرآن مجید کے بیان کردہ تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا جائے لیکن خرابی صحت کی وجہ سے یہ نہ ہوسکا۔اس کے بعد تفہیم القرآن کی تیسری جلد کی تیاری کے دوران ۳ نومبر ۱۹۵۹ء سے ۵ فروری ۱۹۶۰ء تک عرب ممالک (بحرین،سعودی عرب،اردن، فلسطین،شام،کویت اور مصر) کا طویل سفر اختیار کیا۔اس سفر کے دوران چودھری غلام محمد اور عاصم الحداد ان کے ہمراہ تھے۔اس دوران انہوں نے تمام آثار ومقامات کی سیر کی جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ان کی تصویریں اتاریں، نقشے تیار کیے اور تحقیقی مطالعہ کیا تاکہ تفہیم القرآن کو ان تحقیقات کی روشنی میں پیش کیا جاسکے اور قاری قرآنی پس منظر کا صحیح ادراک کرسکے۔اس سفر کے دوران ہی انہوں نے عالم اسلام کی بہت سی اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں۔

۱۹۷۲ء میں جماعت اسلامی کی امارت سے دست بردار ہوگئے اور باقی زندگی ایک رکن کی حیثیت سے گزاری۔

۱۹۷۹ء میں آپ کی اسلامی خدمات کے صلے میں سعودی حکومت نے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا۔

آپ نے کل ۷۵ کتابیں تصنیف کیں۔جن میں سیرت سرور عالم،الجہاد فی الاسلام،سیرت سرور عالم،تجدید واحیائے دین،پردہ،اسلامی ریاست،سنت کی آئینی حیثیت،اسلام اور جدید معاشی نظریات،سود،معاشیات اسلام وغیرہ مشہور ہیں۔آپ کی تحریروں میں ہمیں استدلال،اعتدال،سلاست،ادبی محاسن اور منظر نگاری نظر آتی ہے۔

عمر کے آخری حصے میں آپ گردوں کے عارضے اور جوڑوں کے درد کا شکار ہوگئے۔۲۹ جون ۱۹۷۹ء کو علاج کے لیے امریکہ کی بفیلو ہسپتال میں لے جایا گیا۔امریکہ میں دوران علاج ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو دل کا تیسرا دورہ پڑا اور شام کے وقت پونے چھ بجے آپ کا انتقال ہوا۔

رحلت کی صبح آپ کی نماز جنازہ بفیلو اور پھر نیویارک کے کینیڈی ایئرپورٹ پر ادا کی گئی۔۲۴ ستمبر ساڑھے دس بجے کراچی ایئرپورٹ پر آپ کی نماز جنازہ میاں طفیل احمد امیر جماعت اسلامی نے پڑھائی۔اس کے بعد آپ کی میت کو لاہور لایا گیا۔۲۶ ستمبر کو لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں ساڑھے دس بجے صبح آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔نماز جنازہ عالم اسلام کے عظیم مفکر علامہ یوسف قرضاوی نے پڑھائی۔آپ کو اپنے مکان واقع ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں دفن کیا گیا۔(۱)

تفسیر کا سبب تالیف:

مولانا مودودی پٹھان کوٹ میں قرآن عظیم کا درس دیتے تھے۔یہ درس آسان الفاظ میں اور عام آدمی کی سمجھ میں آنے والا ہوتا۔چنانچہ سامعین کے مطالبے پر اس تفسیر کو تالیف کیا گیا۔مفسر کے پیش نظر وہ درمیانے درجے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے جو عربی زبان میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ایسے لوگوں کے لیے علوم القرآن میں مہارت حاصل کرنا اور تفسیر کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا ناممکن تھا۔لہذا ان کے لیے تفسیر لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

عصر حاضر میں عالم اسلام کو لادینی افکار ونظریات کے غلبے اور سائنسی ایجادات سے ہونے والی ترقی کے نتیجے میں مشکلات کا سامنا ہے۔اس

---

(۱) ڈاکٹر امتیاز احمد،مولانا مودودی کی نثر نگاری (لاہور:ادارہ معارف اسلامی،۲۰۰۷ء) ص:۲۱-۴۵

لیے ایسی تفسیر لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی جو ان مشکلات کا اسلامی حل پیش کرے اور مسلم نوجوانوں کو لادین اور گمراہ کن نظریات سے بچا سکے۔ مولانا مودودی نے انہی عظیم مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تفہیم القرآن تصنیف کی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قرآن حکیم کی تفسیر و ترجمانی کا آغاز فروری ۱۹۴۲ء میں کیا۔ اس تفسیر کے اجزا رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں لگاتار شائع ہوتے رہے۔ مفسر کی تیس برس کی مسلسل محنت اور کوشش سے یہ تفسیر مکمل ہوئی۔

تفسیر تفہیم القرآن کی خصوصیات:

۱۔ یہ تفسیر مفسر کے پچپن سال کے مطالعہ کا حاصل ہے۔

۲۔ دلکش انداز تحریر سے گہری علمی بحثیں اور خشک موضوعات دلچسپ اور آسان معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ مفسر نے قرآن مجید کے تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا۔ ان کی تصاویر اور نقشوں سے اپنی تفسیر کو مزین کیا۔

۴۔ یہ ایک مقبول عام تفسیر ہے۔ صرف اردو زبان میں اس کے چھ لاکھ سے زائد نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

۵۔ اس تفسیر کا انگریزی، ترکی، بنگالی، روسی، فارسی، پشتو جرمن اور سندھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۶۔ ہندی، کشمیری چینی، جاپانی، انڈونیشی، ہسپانوی اور عربی زبان میں اس کا ترجمہ زیر تکمیل ہے۔

۷۔ قرآن عظیم کی تفسیر قرآن سے ہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۸۔ مشکلات قرآن کا حل قرآن سے ہی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۹۔ تفسیر میں اردو زبان کی روانی نظر آتی ہے۔ مترادفات اور محاورات، نادر تشبیہات اور تمثیلات کا استعمال کیا گیا ہے۔

۱۰۔ سورتوں کی تفسیر سے قبل وجہ تسمیہ، زمانۂ نزول، پس منظر، مرکزی موضوع اور مباحث کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح قاری کے سامنے پوری سورت کا خلاصہ آجاتا ہے اور اس کے لیے سورۃ کا مطالعہ آسان ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ احکام کے باب میں مسلکی تعصب سے بالاتر ہو کر فقہائے کرام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر میں فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اوزاعی اور اہل حدیث کے حوالے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہر قاری کو اس کے مسلک کے مطابق مسئلے کا حل مل جاتا ہے۔ مسلکی اعتبار سے یہ تفسیر اعتدال کی راہ ہموار اور وسعت پیدا کرتی ہے۔ مفسر مسلکا حنفی ہونے کے باوجود بعض اوقات حنفی مسلک سے اختلاف کرتے ہیں۔

۱۲۔ اس تفسیر میں روایات پر نقد موجود ہے۔

۱۳۔ تفسیر میں تقابل ادیان کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔ مفسر نے اہل کتاب کے مآخذ سے ان پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے جو عقائد اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ یہود کی نسل پرستی، عیسائیت کے عقیدہ کفارہ و تثلیث اور مصلوبیت مسیح وغیرہ جیسے موضوعات پر تحقیقی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۱۴۔ فقہی مسائل کی طرح کلامی مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہے۔ کلامی مسائل قرآن وسنت کی نصوص پر مبنی تشریحات کے اسلوب کو اپنایا گیا ہے۔ قادیانیوں نے ختم نبوت اور وفات مسیح کی بحث چھیڑی۔ مناظرانہ انداز کی بجائے مفسر نے ان کے افکار کا علمی انداز میں رد پیش کیا ہے۔

۱۵۔ تفسیر کے مطالعہ سے قاری روایات سے متعلق ایک فیصلہ کن نکتہ نگاہ حاصل کر لیتا ہے۔

۱۶۔ یہ ایک دعوتی تفسیر ہے۔ مفسر اسلامی احکامات و تعلیمات کو سچا ثابت کرتے ہوئے دین اسلام کی دعوۃ دیتے ہیں۔

۱۷۔ تفسیر میں اسلام کے سیاسی، عمرانی اور اقتصادی نظام کی وضاحت کی گئی ہے۔ مفسر دین کی بنیاد پر اسلامی حکومت کا قیام لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی احکام کی بالادستی چاہتے ہیں۔

۱۸۔ مفسر جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی کی نت نئی تحقیقات و ایجادات سے مرعوب نہیں ہوتے۔ مفتی محمد عبدہ اور سرسید احمد خان کی طرح اسلام سے بیزار اور شرمسار نظر نہیں آتے۔ مفسر نے مغربی تہذیب و افکار کی یلغار، موجودہ نظام تعلیم و تربیت، اخلاق و معاشرت اور معاشرے میں رائج اوہام و

خرافات کا رد دلائل وشواہد کے ساتھ کیا ہے۔

۱۹۔اس تفسیر کا امتیازی وصف اس کا انڈکس ہے۔جس سے تفسیر علوم اسلامیہ کا انسائیکلو پیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ ہر موضوع کے تحت سینکڑوں ذیلی عنوانات فراہم کردیے گئے ہیں جس سے کسی بھی موضوع پر آسانی سے مواد مل جاتا ہے۔

۲۰۔تفسیر میں شان نزول کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔بعض آیات اوراحکام کو شان نزول کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ مدنی سورتوں کا زمانہ نزول معروف ہے۔ لیکن مکی سورتوں کے زمانہ نزول کی تعیین بڑی مشکل ہے۔مفسر نے مکی سورتوں کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔اس تقسیم کی بنیاد دو اصولوں پر رکھی ہے۔ ایک داخلی شہادت جو سورتوں میں پائی جاتی ہے۔دوسری خارجی شہادت جو معتبر روایات سے حاصل ہوتی ہے۔

مفسر شان نزول اور تکرار نزول کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کسی سورۃ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اسی موقع پر نازل ہوئی تھی ، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورہ یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی ہے اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورت حال پیش آنے پر اللہ تعالی کی طرف سے اسی کی طرف دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار حضورؐ کو توجہ دلائی جاتی تھی۔''(۲)

ڈاکٹر امتیاز احمد اس تفسیر کی مجموعی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تفہیم القرآن میں قدیم وجدید علوم کا حسین امتزاج ہے۔اس میں علمائے سلف کی تفاسیر کے حوالے موجود ہیں۔ یہ تفسیر جدید ترین سائنسی تحقیقات ،عمرانیات ولسانیات ،فلسفہ وحکمت ،سماجیات وسیاسیات اور تاریخ وجغرافیہ جیسے علوم کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔اکتساب واستفادے کے معاملے میں مولانا مودودی کہیں بھی متعصب و متفکر نظر نہیں آتے۔انہوں نے نہایت فروتنی اور فراخ دلی سے علوم قدیم وجدید سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔''(۳)

غرض پاکستان میں تعلیم یافتہ اور عام اردو جاننے والے طبقہ کے ہاں یہ تفسیر کافی مقبول ہے۔جامعات میں اس تفسیر پر بہت زیادہ تحقیقی کام ہوا ہے۔عصر حاضر میں مغرب کے کئی جدید معاشرتی ،معاشی اور سیاسی افکار کا مدلل جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفسر نے اپنی تفسیر کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔عالمی سطح پر اسلام کے فکری غلبے کی کوشش اور اس کے لیے جا بجا تجاویز بھی نظر آتی ہیں ۔اسلام سے متعلق غیر مسلموں کے کئی اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔غرض تفہیم القرآن اردو کی عام فہم اور جامع تفسیر ہے۔اردو زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے بعض سکالرز عصر حاضر میں اس طرح کی آسان اور عام فہم تفسیر لکھنے کی ضرورت آج بھی محسوس کر رہے ہیں۔

---

(۲) سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور: ترجمان القرآن،۱۹۸۴ء) ج:۶،ص:۵۴۷

(۳) ڈاکٹر امتیاز احمد، مولانا مودودی کی نثر نگاری (لاہور: ادارہ معارف اسلامی،۲۰۰۷ء) ص:۱۱۶

4۔تفسیر تدبر قرآن

مفسر کا تعارف:

اس تفسیر کے مصنف مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہیں۔امین احسن ۱۹۰۴ء میں ''بمہور'' اعظم گڑھ (یو پی) ہندوستان میں پیدا ہوئے ۔آپ کے والد حافظ محمد مرتضی ولد وزیر علی ایک متدین، نیک سیرت اور معزز آدمی تھے، جوار دو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور فارسی کی شد بد رکھتے تھے۔آپ کا خاندان متوسط درجے کا زمیندار خاندان تھا۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مقامی دو مکاتب سے حاصل کی ۔سرکاری مکتب میں مولوی بشیر احمد جب کہ دینی مکتب میں مولوی فصیح احمد ان کے استاد تھے۔یہاں سے انہوں نے قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ۔مولانا شبلی متکلم ندوی کی ایماء پر آپ کے والد نے ۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تیسرے درجے داخل کروایا۔اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی ۔ابتدا میں یہ مدرسہ معمولی نوعیت کا تھا، بعد میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے اس میں دلچسپی لی اور اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے ۔مولانا حمید الدین فراہی نے اس کے لیے نصاب تعلیم مرتب کیا۔ یوں یہ مدرسہ ترقی کر گیا۔آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری قابل ذکر ہیں۔

مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا اصلاحی ۱۹۲۲ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور کے نائب مدیر مقرر ہوئے ۔ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ کہا ''مدینہ اخبار کو نابالغ مدیر میسر آ گیا ہے''۔اخبار کے مالک مجید حسن نے بچوں کے ایک ہفت روزہ رسالہ ''غنچہ'' کی ادارت بھی مولانا کے سپرد کر دی۔مولانا اصلاحی ''مدینہ'' سے دو اڑھائی سال وابستہ رہے۔اسی زمانے میں انہوں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی زیر نگرانی شائع ہونے والے ہفت روزہ ''سچ'' میں بھی کام کیا۔اخبار مدینہ کی ادارت کے دوران انہوں نے ایک عربی ناول (مصطفیٰ الصغیر) کا ''ہندوستانی جاسوس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔اسی طرح مشہور مورخ محی الدین الخیاط کی ''تاریخ اسلام کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۹۲۵ء میں مولانا اصلاحی صحافت کو خیر باد کہہ کر اپنے استاد علامہ حمید الدین فراہی کی خواہش پر علوم القرآن میں تخصص کی غرض سے ہمہ وقت مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہو گئے ۔(پانچ برس یعنی مولانا حمید الدین فراہی کی وفات تک ان کے پاس رہے)اس دوران انہوں نے مولانا فراہی سے صرف علوم تفسیر ہی نہیں پڑھے بلکہ استاد کے طریقہ تفسیر میں مہارت بھی حاصل کی ،علاوہ ازیں عربی شاعری کی مشکلات میں ان سے مدد لی۔سیاسیات کی ایک اہم کتاب ''تھیوری آف سٹیٹ'' سبقا سبقا پڑھی۔فلسفہ کی بعض چیزیں مولانا کی نگرانی میں پڑھیں ۔آپ کے ایک ہم جماعت مولانا اختر احسن اصلاحی نے (بقول آپ کے) آپ کی علمی خامیاں دور کرنے میں نہایت فیاضی سے کام لیا۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں مولانا حمید الدین فراہی کی وفات کے بعد اپنے والد کی خواہش پر علم حدیث سیکھنے کے لیے مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ان سے انہوں نے ''نخبۃ الفکر'' اور جامع ترمذی کی تعلیم حاصل کی۔محدث مبارکپوری نے اپنی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' کے لیے رجال حدیث کی تحقیق کا کام مولانا اصلاحی کے ذمے لگایا۔اس طرح آپ فن حدیث کے اصول، سند کی تحقیق اور رجال کی جرح و تعدیل کے طریق کار سے آشنا ہو گئے ۔

۱۹۳۵ء میں مولانا حمید الدین فراہی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی تصحیح و طباعت، ان کی عربی کتب کے تراجم اور ان کے قرآنی افکار کی اشاعت کے لیے مدرسۃ الاصلاح میں ''دائرہ حمیدیہ'' کا قیام عمل میں آیا۔مطبوعات کے اردو تراجم اور دائرہ کے امور کی عمومی نگرانی مولانا اصلاحی کی ذمہ داری قرار پائی۔اس ادارہ کے ترجمان کے طور پر جب جنوری ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ ''الاصلاح'' کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت بھی مولانا اصلاحی کے سپرد ہوئی۔ یہ رسالہ صرف چار سال تک شائع ہوا۔دائرہ حمیدیہ کے تحت آپ نے مولانا فراہی کی عربی مطبوعات ''**تفسیر نظام القرآن** ''(مجموعہ تفسیر فراہی) ''**الامعان فی اقسام القرآن**'' اور'' **الرای الصحیح فی من ھو ذبیح**'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

مولانا اصلاحی سترہ سال (۱۹۴۲-۱۹۵۸) تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ مولانا مودودی کے اصرار پر مارچ ۱۹۴۴ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ آپ کا علمی مقام و مرتبہ ایسا تھا کہ انہیں مولانا مودودی کے نائب اور جانشین کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا مودودی کی علالت کے دوران مرکزی شوریٰ نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو انہیں جماعت اسلامی کا امیر مقرر کیا۔ آپ نے قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کی طرف سے مطالبہ نظام اسلامی مہم میں بھر پور حصہ لیا۔ اس جرم کی پاداش میں ۵۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت (مولانا مودودی اور میاں طفیل کو) آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ تینوں اکابر اپنی رہائی (۲۸ مئی ۱۹۵۰ء) تک ملتان جیل میں رہے۔ اسی دوران آپ نے اپنی کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' مدون کی۔

قادیانیوں کے خلاف جاری تحریک کے دوران مارچ ۱۹۵۳ء کو مارشل لاء کے تحت گرفتار ہوئے۔ اس فراغت کے دوران مولانا نے تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھنے کا نقشہ ترتیب دیا اور مرکزی مضمون کے اساسی کام کا تعین کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت نے اسلامک لاء کمیشن قائم کیا تو مولانا کو بطور ممبر شامل کیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان امیر اور شوریٰ کے اختیارات کے مسئلے پر اختلافات کا آغاز ہو گیا۔ پروفیسر خورشید احمد نے اختلافات دور کرنے کی کوشش کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ چنانچہ ۱۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کو ایک مکتوب کے ذریعے جماعت سے اپنی علیحدگی کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

جماعت سے علیحدگی کے بعد مولانا نے تفسیر تدبر قرآن لکھنے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس کی اقساط ماہنامہ ''المنبر'' لائل پور میں اسی سال شائع ہونے لگیں۔ اسی سال حج پر بھی گئے اور ''مشاہدات حرم'' کے عنوان سے اس سفر نامہ کی روداد کئی قسطوں میں اسی رسالہ میں شائع ہوئیں۔ جون ۱۹۵۹ء میں اپنا ذاتی رسالہ ''میثاق'' جاری کیا جس میں مولانا کی تمام تحقیقات شائع ہونے لگیں۔

۱۹۶۲ء میں علوم قرآنی کے خواہشمند چند طلباء سے ''حلقہ تدبر قرآن'' کا آغاز ہوا۔ مولانا نے طلبہ کو عربی گرامر، عربی ادب، صحیح مسلم اور تفسیر قرآن کا تحقیقی درس دیا۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کے صاحب زادے کی حادثاتی موت نے آپ کی گھریلو ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا۔ ۱۹۶۴ء میں مولانا نے ''میثاق'' کی ادارت ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے کر دی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے مکان پر مولانا اصلاحی کے ہفتہ وار درس قرآن کی نشست کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر اسرار احمد کی انجمن خدام القرآن کی دستوری شقوں اور ''میثاق'' میں شائع ہونے والی ان کی بعض تحریروں سے مولانا اصلاحی کو سخت اختلاف ہوا چنانچہ ۱۹۷۴ء میں ''میثاق'' میں تدبر قرآن کی اشاعت روک کر مولانا نے اپنی قطع تعلقی کا اظہار کیا۔

۱۹۷۱ء میں مولانا مرض نسیان اور دوران سر کے علاج کے لیے کراچی گئے۔ مئی ۱۹۷۲ء میں صحت یاب ہو کر لاہور آ گئے، لیکن معاشی تنگی اور بیماری کے اخراجات کی وجہ سے رحمان آباد (خانقاہ ڈوگراں ضلع شیخوپورہ) میں رہائش پذیر ہو گئے اور وہیں تفسیر قرآن لکھنے کا کام جاری رکھا۔ ۱۹۷۹ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ اگست ۱۹۸۰ء میں تفسیر تدبر قرآن مکمل ہوئی۔

تکمیل تفسیر کے بعد مولانا نے حدیث کی خدمت کی غرض سے ''ادارہ تدبر قرآن وحدیث'' قائم کیا۔ ادارہ کی تحقیقات اور مولانا کے دروس کی اشاعت کے لیے ۱۹۸۱ء میں مجلّہ تدبر کا اجرا ہوا۔ ادارہ میں درس قرآن اور اصول حدیث پر ''مبادی تدبر حدیث'' کے عنوان سے لیکچر دیئے۔ کتب حدیث کے درس میں پہلے موطا امام مالک اور پھر صحیح بخاری کا درس ہوا۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے رفقا نے ان دروس کو مرتب کیا اور ''تدبر حدیث'' کے نام سے شائع کیا۔ ''تدبر حدیث'' علمی نکات سے بھری پڑی ہے۔ فلسفہ کے بنیادی مسائل پر قرآن کے نقطہ نظر سے بحث ہوئی۔ ۱۹۹۳ء میں پیرانہ سالی اور نقاہت کے باعث سلسلہ درس منقطع ہو گیا۔

مولانا اصلاحی نے قرآنیات، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، فلسفہ وکلام، تعلیم اور تزکیہ اور سیاسیات غرض ہر موضوع پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے قرآن کو اساس بنا کر لکھا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بائیس ہے، جن میں سے حقیقت توحید وشرک، حقیقت تقویٰ، توضیحات، مبادی تدبر

قرآن، تزکیہ نفس، فلسفے کے بنیادی مسائل، دعوت دین اور اس کا طریق کار مشہور ہیں۔ ان کی تمام کتابیں خیال آفریں اور خیال افروز ہیں جو نئی نسل کے دل و دماغ کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کی کتابوں کے مطالعے سے قرآن فہمی اور حکمت قرآن کی راہیں کھلتی ہیں، مولانا کی فقہی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا اصلاحی کا اسلوب تحریر اور فکر اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصر حاضر کے عقلیت پسند اور جدت طلب حلقوں میں اپنا لوہا منوا رہا ہے۔ ہندو پاک کے دینی اور علمی حلقوں میں فکر اصلاحی کو خاصی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے جس کا اندازہ اندرون ملک اور بیرون ملک پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کے لیے لکھے گئے مقالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۳ء میں مولانا عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۹۹۵ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ بیماری پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا کے ورثا کی خواہش پر نماز جنازہ اس وقت کے امیر جماعت اسلامی، قاضی حسین احمد نے پڑھائی۔ (۱)

تفسیر ''تدبر قرآن'' کی خصوصیات:

تفسیر تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے استاد مولانا حمید الدین فراہی کی فکر کی ترجمان ہے۔ ابتدا میں یہ آٹھ اور اب نو جلدوں میں شائع ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں قرآن مجید پر غور اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے براہ راست رسائی (Direct Approach) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

تفسیر کا سبب تصنیف:

مولانا امین احسن اصلاحی تفسیر لکھنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے لکھنے سے میرے پیش نظر قرآن حکیم کی ایسی تفسیر لکھنا ہے جس میں میری دلی آرزو اور میری پوری کوشش اس امر کے لیے ہے کہ میں ہر قسم کے بیرونی لوث اور لگاؤ اور ہر قسم کے تعصب و تحزب سے آزاد اور پاک ہو کر ہر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اور فی الحقیقت اس آیت سے نکلتا ہے۔'' (۲)

تفسیر کے ماخذ:

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر کی بنیاد مروجہ تفسیری اصولوں پر نہیں رکھی۔ انہوں نے فہم قرآن کے ان وسائل اور ذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو قرآن کے اندر موجود ہیں۔ ان کے نزدیک تفسیری وسائل دو طرح کے ہیں۔

(۱) قرآن کے داخلی وسائل :

انہیں بنیادی ماخذ بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ وسائل اور ذرائع ہیں جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں، مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر و شواہد۔

(۲) قرآن کے بیرونی وسائل :

انہیں ظنی ماخذ بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ مسائل ہیں جو قرآن سے باہر کے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے سنت متواترہ، احادیث، آثار صحابہ ؓ، شان نزول، دیگر کتب تفسیر، قدیم آسمانی صحائف، تاریخ عرب وغیرہ کو تفسیر قرآن کے خارجی ماخذ قرار دیا ہے۔ (۳)

---

(۱) ڈاکٹر اختر حسین عزمی، مولانا امین احسن اصلاحی (حیات وافکار) (لاہور: نشریات، ۲۰۰۸ء) ص: ۵۵-۶۱/ روزنامہ ''دنیا'' سرگودھا (۱۵ دسمبر، ۲۰۱۵ء) ص: ۱۱

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، مقدمہ تفسیر تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج: ۱ ص: ۱۲

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج: ۱ ص: ۱۳ تا ۴۲

مفسر تفسیری سرمائے سے غیر مطمئن ہے۔ مآخذ تفسیر کا تعین مفسر کے استاد حمید الدین فراہی نے کیا تھا۔ مفسر کے نزدیک صحیح تفسیر کے چار اصول ہیں ۔ یہ اصول سلف صالحین نے تاویل قرآن میں پیش نظر رکھے۔ وہ چار اصول درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر کا ماخذ اول وہ عربی زبان ہے جو عصر جاہلی کے خطباء اور شعرا کی زبان تھی، اسی میں قرآن مجید نازل ہوا۔
(۲) قرآن مجید کے سمجھنے میں فیصلہ کن عامل نظم کلام ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورۃ کا خاص عمود یا موضوع ہوتا ہے۔ اس سورۃ کی تمام آیات نہایت حکیمانہ مناسبت اور ترتیب کے ساتھ اس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں ۔ سورۃ کے بار بار مطالعہ سے سورۃ کا عمود واضح ہو جاتا ہے۔ عمود کے سامنے آنے سے پوری سورت ایک حسین وحدت بن جاتی ہے۔
(۳) قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے قرآن مجید اپنے آپ کو ''کتا با متشابھا '' کہتا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اس کا ہر حصہ دوسرے سے ملتا جلتا ہے ۔ ایک بات اگر ایک جگہ سمجھ نہیں آتی تو دوسری یا تیسری جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔
(۴) تفسیر کا چوتھا ماخذ ''سنت متواترۃ'' مشہور ہے ۔ جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے مثلاً حج ،صلوۃ ،صوم وغیرہ ان سب کی تفسیر سنت متواترہ کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ ان اصطلاحات کا معنی بیان کرنے کا حق حضورؐ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ۔ (۴)

یہ وہ اصول ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر اکثر تفاسیر لکھی جا چکی ہیں ۔ البتہ دوسرا اصول ''نظم فی القرآن'' اس تفسیر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ تفسیری خصوصیت اکثر اردو تفاسیر میں نظر نہیں آتی ۔ قرآن فہمی کے لیے مفسر نے اکثر داخلی وسائل میں غور وفکر کر کے تفسیر کی ہے۔ لیکن جب داخلی وسائل سے بات واضح نہ ہو سکی تو خارجی وسائل کی طرف رجوع کیا۔

سورتوں کی گروپ بندی :

مفسر نے قرآن عظیم کی سورتوں کی گروپ بندی کی ہے۔ مفسر کے نزدیک نظم قرآن کے ظاہری پہلو سے قرآن مجید کے سات گروپ بن گئے ہیں۔ ہر گروپ میں مکی اور مدنی سورتیں شامل ہیں ۔ ہر گروپ مکی سورۃ سے شروع ہوتا ہے اور مدنی سورۃ پر ختم ہوتا ہے۔

پہلا گروپ : سورہ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے اور مائدہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں سورہ فاتحہ مکی اور باقی چار سورتیں مدنی ہیں۔
دوسرا گروپ : سورہ انعام اور سورہ اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور سورہ انفال اور سورہ التوبہ، دو مدنی سورتوں پہ ختم ہوتا ہے۔
تیسرا گروپ : اس میں چودہ سورتیں ہیں۔ سورہ یونس تا سورہ مومنون مکی سورتیں ہیں آخر میں مدنی سورۃ سورہ نور ہے۔
چوتھا گروپ : سورہ فرقان سے سورہ احزاب تک آٹھ مکی سورتیں اور آخری احزاب مدنی ہے۔
پانچواں گروپ : سورہ سبا سے سورہ حجرات تک ۱۳ مکی آخر میں تین مدنی۔
چھٹا گروپ : سورہ ق سے سورہ تحریم تک پہلی سات مکی ہیں اور باقی دس مدنی ہیں۔
ساتواں گروپ : سورہ ملک سے سورہ الناس پر مشتمل ہے۔

سورتوں کی گروپ بندی کی حکمت یہ ہے کہ اصلی حسن و جمال مخفی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس اخفا کی طرف ان نکات میں اشارہ کیا ہے:
۱۔ ہر سورۃ کی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود (مرکزی مضمون) ہوتا ہے۔ اس طرح جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔
۲۔ ہر گروپ میں شامل مدنی سورتیں اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، مبادی تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء) ص: ۱۹۱-۲۰۰

۳۔ ہر سورۃ زوج زوج ہے۔ ان کی مناسبت زوجین کی طرح ہے کہ ایک کا خلا دوسری پر کرتی ہے۔ اس طرح دونوں مل کر سورج اور چاند کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اس ترتیب میں قانون وشریعت کے گروپ کو تمام گروپوں پر مقدم اور نذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ (۵)

تفسیر ''تدبر قرآن کی خصوصیات :

ا۔ تفسیر بالرائے:

تفسیر کا عمومی انداز پیش نظر رکھا جائے تو اسے ہم تفسیر بالرائے ہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ بالماثور کی صرف ایک ہی خاصیت اس میں موجود ہے، اس کے علاوہ اس میں کوئی بھی ایسی خصوصیت نہیں کہ اسے تفسیر بالماثور کہہ سکیں۔ سلف کے ہاں مسلمہ اصول تفسیر سے مکمل طور پر اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ زیادہ دارومدار عربی لغت پر ہے۔ مسلمہ اصول تفسیر میں اصل ماخذ قرآن مجید اور حدیث نبوی ہیں۔ لغت اسی صورت میں معتبر ہوتی ہے جب یہ حدیث سے متصادم نہ ہو، لیکن اس تفسیر میں لغت کو اولیت اور حدیث کو بہت ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

۲۔ تفسیر میں لغت کا استعمال:

تفسیر میں لغت کی جس کتاب پر سب سے زیادہ اعتماد کیا گیا وہ ''اللسان العرب'' ہے۔ مولانا لغت کی دوسری کتابوں کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان سے قرآن کے معنی ومفہوم کو اخذ کیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ امام راغب کی مفردات القرآن کو بھی ناکافی سمجھتے ہیں۔
مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''میں نے جس لغت (کی کتاب) سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہ ''لسان العرب'' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب لسان استعمالات، شواہد ونظائر کے ذریعہ سے اکثر لفظ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں۔ (باقی) امام راغب کی مفردات کو بعض لوگ بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے فی الواقع بڑا درجہ ہے کہ وہ خالص قرآن کی لغت ہے۔ لیکن حل مشکلات کے سلسلے میں جب کبھی میں نے اس کی طرف مراجعت کی تو مجھے اس سے مایوسی ہوئی۔'' (۶)

۳۔ شان نزول :

مفسر شان نزول کو خود سورہ ہی سے معلوم کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے استاد حمید الدین فراہی رقمطراز ہیں:

> ''شان نزول کو خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنا چاہیے اور احادیث وروایت کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں۔'' (۷)

اس تفسیری فکر کے نزدیک شان نزول آیات کے مطالب اور ان کی باہمی ترتیب وترکیب میں غور وفکر سے معلوم ہوگا۔ اگر کسی خارجی مدد کے بغیر تاویل بالکل بے نقاب ہوگئی، نظم کی شرائط پوری ہوگئیں تو شان نزول کے لیے صحیح روایات کی طرف رجوع کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر روایات سے ایسی تاویل کی تائید یا کسی مخفی پہلو کی وضاحت ہو رہی ہو تو مزید اطمینان کے لیے ایسی روایات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

---

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۲۵،۲۶

(۶) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۱۷

(۷) حمید الدین فراہی، مرتب ومترجم خالد مسعود، تفسیر قرآن کے اصول (لاہور: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، ۱۹۹۹ء) ص:۹۸

۴۔اقوال صحابہؓ کا فقدان:

صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال کے متعلق مفسر کا نقطہ نظریہ ہے کہ اگر ان کی صحت پر اعتماد ہو تو انہیں قرآن مجید کی تفسیر میں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر میں اقوال صحابہ بہت کم نقل کیے گئے ہیں۔

۵۔فقہی مسائل کا فقدان:

مفسر کسی خاص فقہی یا کلامی مسلک یا امام کے پیروکار نہیں ہیں۔وہ فقہی مسلک کے لحاظ سے آزاد خیال نظر آتے ہیں۔فقہی مسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔پوری تفسیر میں غالباً ایک بھی فقہی مسئلہ نہیں۔

۶۔اسرائیلیات کی بھرمار:

مولانا امین احسن اصلاحی نے تورات وانجیل کے حوالے لاتعداد مواقع پر پیش کیے ہیں،مثلاً سورہ البقرہ،سورہ ال عمران۔یہاں بظاہر مولانا کے طرزِ عمل میں تضاد نظر آتا ہے۔تحریف شدہ کتب سے تو استفادہ کرتے ہیں لیکن اقوال صحابہ وتابعین کو نا قابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر قاضی حبیب اللہ لکھتے ہیں:

> اس تفسیر کے مصنف منطقی وکلامی مسائل سے عموماً پرہیز کرتے ہیں اور گزشتہ
> انبیاء کے صحائف اور کتب سے کچھ زیادہ ہی استدلال کرتے ہیں۔(۸)

۷۔ادبی ذوق کا اظہار:

تفسیر میں مولانا اصلاحی کا مخصوص ادبی ذوق بھی پایا جاتا ہے۔عبارات بڑی نپی تلی پُرمغز اور پُرمعنی ہیں۔آپ کے بعض محاورات آپ کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً بازیچہ اطفال۔آپ تشبیہات واستعارات کا بروقت استعمال بھی کرتے ہیں جو مفسر کی عربی فارسی اور اردو میں خاصی دسترس پر شاہد ہے۔آپ عربی اور اردو اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔عبارات میں زورِ بیان بھی پایا جاتا ہے۔موقع محل کی مناسبت سے انداز بیان اختیار کرنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔

۸۔ضمنی مباحث سے اجتناب:

دورانِ تفسیر ہر آیت کے تحت صرف اسی حد تک بحث کی گئی ہے جس سے اس کا اصل مدعا واضح ہو جائے۔آیت سے متعلق ضمنی مباحث میں پڑنے سے احتراز کیا گیا ہے۔

۹۔کتب تفسیر کی تفصیل:

مولانا اصلاحی نے تفسیر کی صرف تین کتابوں پر اعتماد کیا ہے۔ان میں ابوجعفر محمد ابن جریر طبری کی ''**جامع البیان فی تفسیر القرآن**''،امام فخر الدین رازی کی ''**مفاتیح الغیب**''،جاراللہ علامہ محمود بن عمر زمخشری کی ''**الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل**'' شامل ہیں۔کیونکہ تفسیر طبری اقوال سلف کا مجموعہ ہے۔مفاتیح الغیب میں متکلمین کی قیل وقال اور عقلی موشگافیاں ہیں۔الکشاف میں نحو واعراب کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔اس لیے مفسران تینوں تفاسیر کو کافی سمجھتے ہیں۔

تفسیر تدبر قرآن میں دیگر تفاسیر کے حوالے کم ملتے ہیں۔تفسیر کا منہج واسلوب مروجہ تفاسیر سے مختلف ہے۔اس تفسیر میں براہ راست فہم قرآن کے اصلی وسائل کو منہج تفسیر قرار دیا گیا ہے۔مخصوص اہم مباحث میں تفاسیر اور اہل تاویل کے حوالہ جات دیے گئے ہیں۔ان حوالہ جات کی حیثیت تائیدی

---

(۸)ڈاکٹر محمد حبیب اللہ قاضی چترالی،برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ(کراچی:زم زم پبلشرز،۲۰۱۵ء)ص:۵۹۶

ہے۔

۱۰۔اندازِ تفسیر:

مفسر نے ''تدبر قرآن'' میں سورت کی تفسیر میں عموماً درج ذیل ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے:

سابقہ سورہ کے ساتھ ربط اور تعلق کو بیان کرتے ہوئے سورہ کا عمود بیان کیا گیا ہے۔پھر سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد ترتیب سے چند آیات کا ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔پھر ان چند آیات میں شامل الفاظ کی لغوی تحقیق پیش کی گئی ہے۔آخر میں آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

۱۱۔تفسیری ادب سے بے اطمینانی:

مولانا امین احسن اصلاحی قدیم تفسیری ادب سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔وہ سابقہ تفاسیر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دور اول میں تفسیر قرآن کی راہ میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا۔ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔اہل بدعت اور اہل باطل کی مطلق العنانیوں اور فتنہ آرائیوں سے بچنے کے لیے روایات وآثار کو اہمیت دی گئی۔لیکن پھر روایات میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ ان کے بارے میں نقد وتمیز کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آہستہ آہستہ صحیح روایات کے ساتھ قصوں اور اسرائیلیات کا ایک بڑا حصہ بھی تفسیر کی کتابوں میں داخل کر دیا گیا۔''(۹)

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس اقتباس کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی پورے تفسیری لٹریچر سے مطمئن نہیں۔وہ اپنی کسی تحریر میں کسی ایک تفسیر کی نشاندہی نہیں کر سکے جو ان کے ذوق قرآن فہمی پر پوری اترتی ہو۔عقل سلیم یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ پورے چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں ایک مفسر بھی قرآن کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکا۔''(۱۰)

۱۲۔تفسیری تفردات:

بعض پہلوؤں پر مولانا نے عام مفسرین کے نقطہ نگاہ سے ہٹ کر الگ موقف اختیار کیا ہے۔ایسے مقامات ''تفردات اصلاحی'' کہلاتے ہیں۔

(ا) ''رجم'' ایک شرعی سزا ہے۔اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کریں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا۔صحیح احادیث اور اکثر صحابہ کی شہادت سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریمؐ نے ایک مرد حضرت ماعز اسلمیؓ اور ایک عورت غامدیہ کا رجم فرمایا۔لیکن مفسر نے رجم کا واضح اقرار اور انکار نہ کر کے اسے مشکوک بنا دیا ہے۔ڈاکٹر محمد حبیب اللہ قاضی چترالی لکھتے ہیں:

> ''مولانا امین احسن اصلاحی نے اس تسلیم شدہ مسئلہ کو مشکوک بنا دیا ہے۔نہ صحیح طریقہ سے مانا ہے اور نہ سیدھا انکار کیا ہے۔ایک طرف وہ انکار کر کے خوارج میں سے نہیں ہونا چاہتے۔لیکن دوسری طرف ادھر ادھر کی بات کر کے اسے مشکوک بنا دیتے ہیں۔''(۱۱)

---

(۹)امین احسن اصلاحی،مبادی تدبر قرآن(لاہور:فاران فاؤنڈیشن،۱۹۹۱ء)ص:۷۹،۸۰

(۱۰)ڈاکٹر عبدالرشید رحمت،قرآن فہمی کے اصول علمی کام کا جائزہ(اسلام آباد:فکر ونظر(اشاعت خصوصی)ادارہ تحقیقات اسلامی،۱۹۹۹ء)ص:۶۴

(۱۱)ڈاکٹر محمد حبیب اللہ قاضی چترالی،برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ(کراچی:زم زم پبلشرز،۲۰۱۵ء)ص:۵۹۸

(۲) سورہ فیل کی تشریح میں مفسر ''ابابیل'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ابابیل کا لفظ گھوڑوں کی جماعت اور چڑیوں کے جھنڈ کے لیے آتا ہے۔ بعض ماہرین لغت کے نزدیک یہ لفظ جمع ہے۔ بعض کے نزدیک یہ ابالۃ کی جمع ہے۔ یہ ان چڑیوں کے لیے آتا ہے جو مقتولوں کی لاشیں کھانے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں۔'' (۱۲)

مولانا امین احسن اصلاحی ''مفسرین کی ایک عام غلط فہمی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

قریش نے ابرہہ کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ ان کے سردار عبدالمطلب قوم کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ خانہ کعبہ کو خدا کے سپرد کر دیا کہ جس کا یہ گھر ہے خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ان کے نزدیک ترمی کا فاعل **طیرا ابابیل** ہے۔ یعنی چڑیوں نے ابرہہ کی فوج پر سنگ باری کر کے ان کو پامال کر دیا۔ اگرچہ اس قول پر تمام مفسرین متفق ہیں، لیکن مختلف وجوہ کی بنیاد سے یہ بالکل غلط ہے۔ (ان وجوہات کا خلاصہ درج ذیل ہے)

۱۔ قریش کے پہاڑوں میں چلے جانے کے یہ معنی نہیں کہ انہوں نے مدافعت چھوڑ دی۔ بلکہ اس بڑے لشکر کی مدافعت میں یہی وہ ممکن شکل تھی جو انہوں نے اختیار کی۔ اللہ کی سنت یہی ہے کہ وہ اپنے بندے کی مدد تب کرتا ہے جب وہ ممکنہ حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گوریلا فوج کا طریقہ ہے۔ اسی طرح کی تدبیر غزوہ احزاب میں اختیار کی گئی۔

۲۔ قریش کا مزاحمت نہ کرنا قریش کی غیرت وحمیت اور واقعات کے خلاف ہے۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابرہہ کی فوجیں جن راستوں سے گزریں انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ صرف بنوثقیف نے اس حمیت کا مظاہرہ نہ کیا۔ اسی طرح ابرہہ کی فوج کو راستہ بتانے والے ابورغال کی قبر پر عربوں نے سنگ باری کی۔

۳۔ مفسرین کے نزدیک اس سورہ کا درس یہی ہے کہ کعبۃ اللہ کے پاسبان دشمن سے ڈر کر بھاگ جائیں تو بھی اللہ ان کی حفاظت کرے گا۔ یہ درس اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالی کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم اور وسائل کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں۔ بنی اسرائیل نے راہ خدا میں قتال کرنے سے انکار کر دیا تو سزا کے طور پر چالیس سال تک صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔

۴۔ عبدالمطلب کا اپنے رب سے استغاثہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس طرح کی دعا میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں کرتا، بلکہ وہ شخص کرتا ہے جو حالات کی نزاکت سے پریشان تو ہوتا ہے لیکن اپنے رب کی قدرت سے مایوس نہیں ہوتا۔

بہرحال یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے کہ قریش میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ چڑیوں نے سنگباری کر کے ابرہہ کی فوج کو پامال کیا۔ ترمی کا فاعل قریش ہیں جو ''**الم تر**'' کے مخاطب ہیں۔ فعل ترمی چڑیوں کے لیے کسی طرح موزوں ہے بھی نہیں۔ رمی صرف اس صورت میں ہوگی جب بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تیز تھپیڑے ان کے ساتھ ہوں۔ (۱۳)

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت مولانا امین احسن اصلاحی کی بیان کردہ اس آیت کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۹، ص:۵۶۱

(۱۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۹، ص:۵۶۱-۵۶۴

''اس آیت کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے جمہور سے اختلاف کیا ہے تقریبا تمام مفسرین ترمی کی ضمیر طیر کی طرف راجع کرتے ہیں۔اس آیت کی تفسیر پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اس فعل کو معجزہ خداوندی کی بجائے ایک عام فعل قرار دے رہے ہیں کہ قریش ان پر سنگ باری کر رہے تھے اور ابرہہ کی فوج اس سنگ باری کی وجہ سے بھس بن گئی۔''(۱۴)

۱۳۔ایک صدی کا قرآنی فکر:

مولانا نے تفسیر کو کافی غور وفکر کے بعد تصنیف کیا۔تیئیس سالوں میں کتاب کی تحریر وتسوید ہوئی۔تفسیر کی تصنیف میں پچپن سالوں میں مکمل ہوئی۔ ان پچپن سالوں کے ساتھ اگر مولانا فراہی کے قرآنی تفکر وتدبر کا عرصہ بھی شامل ہو جائے، تو یہ کم وبیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے۔

۱۴۔خود اعتمادی :

ان کا نقطہ نگاہ اگر چہ اسلاف سے بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے تاہم اپنے موقف کے بارے میں بے تحاشا اعتماد پایا جاتا ہے۔اپنے موقف کے علاوہ کسی نقطہ نگاہ کا نہ تو ذکر کرتے ہیں نہ اس کی پرواہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر قاضی محمد حبیب اللہ چترالی اس تفسیر میں لغت کی اہمیت کا جائزہ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

''مولانا فراہی اور ان کے ترجمان مولانا اصلاحی عربیت کے ماہر تھے۔عربی لغات پر ان کو عبور حاصل تھا۔وہ احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہؓ و تابعینؒ اور امت مسلمہ کے ہزاروں محدثین، مفسرین اور فقہاء کے تدبر وتفقہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یا ان پر صرف طائرانہ نظر کر کے خالص اپنی عربی دانی کی بنیاد پر تفسیر کرتے ہیں۔اسلاف کے تدبر کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے اور اپنے شیخ کے تدبر پر اعتماد کرتے ہیں، جو بہت بڑی خود اعتمادی اور بے احتیاطی ہے۔یہ کبھی خطرناک بھی ہوسکتی ہے ۔میں مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کو منکرین سنت میں شمار نہیں کرتا۔لیکن وہ احادیث وآثار کو اتنی اہمیت نہیں دیتے، جتنی اپنی عربی دانی اور اپنے تفکر وتعقل کو دیتے تھے۔''(۱۵)

غرض مفسر نے روایتی تفسیری انداز سے ہٹ کر تفسیر لکھنے کی کوشش کی ہے اور تفسیر کو ایک نئی جہت دے کر اس میں جدت پیدا کی ہے۔

---

(۱۴)ڈاکٹر عبدالرشید رحمت، قرآن فہمی کے اصول علمی کام کا جائزہ (اسلام آباد: فکر ونظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۹۹ء)ص:۷۱،۷۲

(۱۵)ڈاکٹر محمد حبیب اللہ قاضی چترالی، برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی: زم زم پبلشرز، ۲۰۱۵ء)ص:۵۹۶

باب دوم :

منتخب اردو تفاسیر سے اخلاقی احکام کی تشریح و توضیح

فصل اول:

اخلاق حسنہ سے متعلق احکام کی تشریح و توضیح

1۔صدق

صدق کے لفظی معنی سچ بولنا کے ہیں۔صدق میں صرف زبان سے سچ بولنا نہیں بلکہ نیت اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے۔اللہ رب العزت سب سے زیادہ صادق ہیں۔اس کے بعد ہمارے نبی مکرم ﷺ کو دشمن بھی صادق کہتے ہیں۔اسی لیے اللہ تعالی نے تمام مومنوں کو بھی سچ بولنے کا حکم دیا ہے۔صدق سے متعلق ارشاد باری تعالی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبة ٩:١١٩)

اے ایمان والو! اللہ تعالی سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی ''صدق'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''صدق سے مراد صرف حقیقت کے مطابق سچی بات نہیں ہے۔صدق کا اطلاق اس سچے قول پر ہوتا ہے جس کا قائل اپنی زبان سے بیان ہونے والی حقیقت کو سچے دل سے تسلیم کرے۔مثلا ایک شخص کہتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔یہ بات عین حقیقت کے مطابق ہے کیونکہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔لیکن وہ شخص اپنے اس قول میں صادق صرف اسی وقت کہا جائے گا جبکہ اس کا اپنا عقیدہ بھی یہی ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔لہذا صدق کے لیے ضروری ہے کہ قول کی مطابقت حقیقت کے ساتھ بھی ہو اور قائل کے ضمیر کے ساتھ بھی۔اسی طرح صدق کے مفہوم میں وفا، خلوص اور عملی راستبازی بھی شامل ہے۔

صادق الوعد (وعدے کا سچا) اس شخص کو کہیں گے جو عملا اپنا وعدہ پورا کرتا ہو اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا ہو۔صدیق (سچا دوست) اسی کو کہا جائے گا جس نے آزمائش کے موقع پر دوستی کا حق ادا کیا ہو اور کبھی آدمی کو اس سے بے وفائی کا تجربہ نہ ہوا ہو۔جنگ میں **صادق فی القتال** (سچا سپاہی) صرف وہی شخص کہلائے گا جو جان توڑ کر لڑا ہو اور جس نے اپنے عمل سے بہادری ثابت کر دی ہو۔پس صدق کی حقیقت میں یہ بات شامل ہے کہ قائل کا عمل اس کے قول سے مطابقت رکھتا ہو قول کے خلاف عمل کرنے والا صادق قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس بنا پر تو آپ اس شخص کو جھوٹا واعظ کہتے ہیں جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔''(۱)

اس تفسیر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدق سے مراد یہ ہے کہ بات سچی ہو اور کہنے والے کے ضمیر کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔صدق کے لیے بات کہنے والی کی بات اور عمل میں مطابقت لازمی ہے۔

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج:۵، ص:۳۱۶

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''صدق قول، فعل، ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ **صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب ۳۳:۲۳)** کے پہلو سے یہ نفاق کے بالکل متضاد کردار کی تعبیر ہے۔ ہمارے ہاں قول مرداں جاں وارد اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔'' (۲)

قرآن مجید میں اسلامی تعلیمات کے لیے بھی صدق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر:۳۳)

اور جو سچی بات لے کر آیا، جس نے اس کو سچ مانا، وہی لوگ ڈرنے والے ہیں

مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''صدق سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ خواہ وہ قرآن ہو یا قرآن کے علاوہ دوسری تعلیمات احادیث وغیرہ۔ ''**صدق بہ**'' میں سب مومنین داخل ہیں جو اس کی تصدیق کرنے والے ہیں''۔ (۳)

قرآن مجید میں صدیقین کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ لہذا یہ جاننا ضروری ہے کہ صدیق، صادقین اور صادقات سے کون مراد ہیں؟

صادق سچے آدمی کو کہا جاتا ہے۔ صدیق، صدق سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی نہایت سچے کے ہیں۔ ایسے سچے آدمی کو صدیق کہا جائے گا جو حق بات کو خلوص دل سے تسلیم کرے۔ حق کے ساتھ وفاداری کا عہد نبھائے۔ جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ اس نے حق اور سچائی کے راستے کو کبھی ترک نہ کیا ہو۔ وہ اپنے مذہب وملت کے دیگر پیروکاروں کے لیے ایک مثال ہو۔

سید ابوالاعلی مودودی ''صدیق'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صدیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راستباز ہو۔ جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو۔ جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے۔ جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے۔ جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا سی کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔'' (۴)

مولانا اشرف علی تھانویؒ ''صادقین اور صادقات'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

صادقین کے قول، عمل، نیت اور ایمان میں صدق پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ نہ کلام میں جھوٹ بولنے والے ہیں، نہ عمل میں کم ہمت اور سست ہیں، نہ نیت میں ریاکار ہیں اور نہ منافق ہیں۔'' (۵)

---

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۶ ص:۲۲۵

(۳) محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۷، ص:۵۵۷

(۴) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج:۱ ص:۳۷۰

(۵) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۱ص:۱۷۴

مولانا امین احسن اصلاحی ''صدیق'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صدیق کی اصل روح قول وعمل کی کامل مطابقت اوراس کی پختگی ہے۔عربی میں اس نیزے کو **صادق الکمدب** کہیں گے جس کی گرہیں تجربہ سے بھی ویسے ہی محکم ثابت ہوں جیسے وہ دیکھنے میں نظر آتی ہیں۔صادق اور صدیق اس شخص کو کہیں گے جو اپنے قول کا پکا ہو۔اس پختگی کی اولین شہادت یہ ہے کہ وہ اس مقصد حق کی خاطر اپنی محنت کی کمائی قربان کرنے والا ہو،جس کا اس نے اقرار واعلان کیا ہے۔اسی قربانی سے وہ اس مقصد حق کی شہادت دینے والا بنتا ہے اور ایسے ہی مرد حق سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کو امتحان پیش آیا تو وہ اپنی جان دے کر بھی اس حق کی شہادت دے گا۔اسلام میں اس وصف کے نمایاں مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔انہوں نے اپنے اقرار ایمان کی صداقت نازک سے نازک زمانے میں اپنے انفاق سے جس طرح ثابت کی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے روشن باب ہے''۔(۶)

غرض صدیق اسے ہی کہا جائے گا جو انتہائی درجے کا سچ بولنے والا ہو۔اس کے قول،عمل اور نیت میں سچ پایا جاتا ہو۔وہ جھوٹ نہ بولتا ہو۔اس کا عمل منافقت سے پاک ہو۔وہ فطرتاً حق اور باطل میں فرق کرسکتا ہو۔حق کو قبول اور باطل کو چھوڑ دیتا ہو۔اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں میں صدیق بھی شامل ہوگا۔اس لحاظ سے یہ قرب الٰہی کے ایک مقام کا نام بھی ہوا۔تمام صحابہ کرامؓ صدیق تھے لیکن جس کو صدیق اکبر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔

حکم الٰہی میں یہ ارشاد ہوا کہ ''**کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ**'' سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔مفتی محمد شفیعؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ : میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ صفت تقوی حاصل ہونے کا طریقہ صالحین وصادقین کی صحبت اور عمل میں ان کی موافقت ہے۔اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے (غزوہ تبوک میں) یہ لغزش ہوئی اس میں منافقین کی صحبت ومجالست اور ان کے مشورہ کو بھی دخل تھا۔اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہیے اور صادقین کی صحبت کو اختیار کرنا چاہیے۔اس جگہ قرآن حکیم نے علماء وصلحاء کی بجائے صادقین کا لفظ اختیار فرما کر عالم وصالح کی پہچان بھی بتلا دی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو،نیت وارادے کا بھی سچا ہو،قول کا بھی سچا ہو،عمل کا بھی سچا ہو۔''(۷)

غرض آیت کے اس مختصر سے حصے میں تقوی حاصل کرنے کا طریقہ،اللہ کے نافرمانوں اور منافقین کی صحبت سے اجتناب،اور علماء وصلحاء کی پہچان بتادی گئی ہے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ صدق کا حکم دیتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا (الاحزاب ۳۳:۷۰)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اس کی تفسیر فرماتے ہیں:

---

(۶) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۸،ص:۲۱۹

(۷) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۴،ص:۴۸۵

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور بالخصوص (کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کرنا ہو) راستی کی بات کہو (جس میں عدل اور اعتدال سے تجاوز نہ ہو)۔(۸)

ابن کثیرؒ کے بیان کردہ اقوال کے مطابق قول سدید کی تفسیر صدق، مستقیم اور صواب کے ساتھ کی گئی ہے۔حضرت خبابؓ فرماتے ہیں سچی بات قول سدید ہے۔قرآن کریم نے اس جگہ صادق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا ہے، کیونکہ لفظ سدید ان تمام اوصاف کا جامع ہے ۔اسی لیے کاشفی نے ''روح البیان'' میں فرمایا کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطاء کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو ہزل یعنی مذاق و دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو دلخراش نہ ہو۔(۹)
پیر محمد کرم شاہ ''قول سدید'' کی وضاحت کرتے ہیں:

جب بات کرو تو سچی اور درست بات کرو، کوئی جھوٹی بات تمہارے منہ سے نہ نکلے۔(۱۰)

مولانا امین احسن اصلاحی '**قُوْلُوْا قُوْلًا سَدِیْدًا** ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ایمان لانے کے مدعی بنے ہو تو وہ بات کہو جو اس ایمان کا براہ راست تقاضا ہے اور اسکا سیدھا سادھا لازمی مطالبہ ہے۔ یہ اشارہ **سمعنا واطعنا** کے اعتراف و اقرار کی طرف ہے۔اس اقرار سے ایمان کی تصدیق ہوتی ہے اور آگے کے لیے ہدایت کی راہیں کھلتی ہیں۔''(۱۱)

یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ:

اعمال صالحہ میں ثواب بھی ہے اور دیگر اعمال کو درست کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔لہذا بعض اوقات مشائخ ایک عمل کا حکم کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد کسی دوسرے عمل کی اصلاح ہوتا ہے۔اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالی تمہارے اعمال صالحہ کو قبول فرماتے ہوئے تمہیں مزید نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے گا۔
مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں سیدھی بات کا عادی ہونے پر اصلاح اعمال کا وعدہ ہے، اس میں دینی اور دنیاوی اعمال شامل ہیں۔ جو شخص قول سدید کا عادی ہو جائے یعنی کبھی جھوٹ نہ بولے، سوچ سمجھ کر کلام کرے جو خطاء و لغزش سے پاک ہو، کسی کو فریب نہ دے ، دلخراش بات نہ کرے، اس کے اعمال آخرت میں بھی درست ہو جائیں گے اور دنیا کے کام بھی بن جائیں گے۔''(۱۲)

غرض آیت کے اس حصے میں سچی بات کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے اعمال درست اور نیک ہو جائیں گے اور گناہ معاف ہو جائیں گے۔قول و عمل کے تضاد کو دور کرنے سے انسان کا ہر قدم صحیح راستے کی طرف اٹھے گا۔اس صورت میں اس کے گناہوں سے اللہ تعالی درگزر فرمائیں گے۔

---

(۸) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۲، ص:۱۹۲
(۹) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۷، ص:۲۴۰
(۱۰) پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن (لاہور: ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۴۰۲ھ) ج:۴، ص:۱۰۱
(۱۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۶، ص:۲۷۸
(۱۲) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۷، ص:۲۴۲

۲۔ صبر

صبر سے مراد ہے اپنے نفس کو قابو میں رکھنا۔ انسان کا مشکل حالات میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ خوف، بھوک، جانی، مالی یا پھلوں کے نقصان پر انسان کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ صبر سے متعلق حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۲:۱۵۳)

اے ایمان والو! نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صبر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔ ارشاد الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ اس اخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کے لیے نماز کی پابندی کرو۔''(۱)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ''صبر'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبر کا مفہوم ضبط نفس ہے، جو استقامت اور پابندی کے معنی کو متضمن ہے۔ نفس کو خواہشات سے روکنا اور فرائض دین کا پابند بنانا اتباع شریعت کی روح ہے۔ لفظ صبر کا استعمال علی اور عن دونوں صلوں کے ساتھ کلام میں پایا گیا ہے۔ ائمہ لغت فرماتے ہیں علی کے ساتھ استعمال کسی چیز پر پختگی استقامت اور دوام ہوتا ہے یا کسی چیز کا برداشت کرنا۔ مثلاً کہا جائے **صبرت علی الفرائض** یعنی میں نے فرائض کی پابندی کی اور کہا جاتا ہے **فلان صبر علی البلایا** کہ فلاں شخص نے مصائب وتکالیف کا تحمل کیا۔ اور عن کے ساتھ استعمال مثلاً **صبرت عن المعاصی** تو مراد یہ ہوگی کہ گناہوں اور نافرمانیوں سے صبر اور پرہیز کیا۔ **صبرت عن الشھوات** یعنی نفس کی خواہشات سے بچا۔ تو اس طرح صبر کی عملی شکل انسانی حیات میں فرائض کی پابندی مشقتوں کی برداشت، گناہوں سے پرہیز اور خواہشات نفس سے اجتناب کی صورت میں رونما ہوگی اور ظاہر ہے کہ انسان کی عملی زندگی میں ان چار پہلوؤں کی تکمیل کمال سعادت اور ایمانی زندگی کا پیکر ہے اور ان بنیادی بنیادی عملی پہلوؤں کی دوسروں کو تلقین اصلاح معاشرہ کی ضامن اور اجتماعی زندگی کو اعلیٰ وارفع بنانے والی ہے۔''(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی صبر کے مفہوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کر لی ہے۔ قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے۔ اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔ صبر کا مفہوم لوگ عام طور پر عجز ومسکنت سمجھتے ہیں۔ لیکن لغت عرب اور

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج:۱، ص:۱۳۷

(۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۸، ص:۴۵۹

استعمالات قرآن میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے ۔۔عربوں کے نزدیک صبر عجز وتذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔

صبر کے اصل معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیے ہیں۔چنانچہ فرمایا ہے:

وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ (البقرہ ۲:۱۷۷)

اور ثابت قدمی دکھانے والے سختی میں تکلیف میں اور لڑائی کے وقت

اس آیت میں صبر کے تین مواقع ذکر کیے گئے ہیں: غربت، بیماری، جنگ۔غور کیجیے کہ تمام مصائب وشدائد کے سرچشمے یہ تین ہیں۔(۳)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی ''**اھل البر**'' میں صابرین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیک لوگوں میں ان کا شمار خاص طور پر ہوتا ہے جو تنگ دستی، بھوک کی شدت، لڑائی کے وقت اور بیماری کی حالت میں صبر وتحمل کرنے والے ہیں۔انسان پر تین قسم کی مصیبتیں آتی ہیں، مالی، بدنی اور روحانی۔فقر مالی مصیبت ہے، مرض بدنی مصیبت ہے اور لڑائی میں چونکہ جان کا خطرہ ہے تو وہ روحانی مصیبت ہے۔صابر کامل وہ ہے جو تینوں مصیبتوں میں صبر کرے۔بعض مصائب پر صبر کرنے اور بعض مصائب پر صبر نہ کرنے والا صابر کامل نہیں۔''(۴)

صبر کے مفہوم میں ثابت قدمی بھی شامل ہے۔اللہ کی راہ اور اس کے دین پر ثابت قدم رہنا صبر کہلاتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی ''صابرین'' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(صابرین وہ ہیں جو) ''اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے اور خدا کے دین کو قائم کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں اور جن نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑے ،ان کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشات نفس کا کوئی تقاضا ان کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔''(۵)

سورہ العصر میں مومن معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ (صبر) کو استعمال کرتا ہے اس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔خدا کی فرض کی ہوئی عبادتوں کے انجام دینے میں

---

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۱۸۸، ۱۸۹

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۲۴ھ) ج:۱،ص:۳۵۳

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج۴،ص:۹۶

صبر درکار ہے۔خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔اخلاقی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہوسکتا ہے۔

زندگی میں بے شمار مواقع ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات ،تکالیف ،مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدہ اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا، پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل وعیال ،اپنے خاندان ،اپنے معاشرے ،اپنے ملک وقوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن وانس کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔حتی کہ راہ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی۔بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی ،انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔(۶)

قرآن عظیم نے نماز اور صبر سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔اس حکم کی وضاحت میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''صبر اللہ کی طرف سے ایک خاص ہتھیار ہے جو خاص انسان کو عطا کیا گیا ہے، تاکہ مشکلات میں اس کا معین اور مددگار رہو۔صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج وغم ہلکا کر دیتا ہے۔حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں ۔انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔اس لیے انسان کو شہوت اور غضب کا وار روکنے کے لیے صبر کا ہتھیار دیا گیا اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے اشارہ پر چلنا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنے کا نام صبر ہے۔اخلاق جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔حق جل شانہ نے قرآن کریم میں صبر کو ستر یا پچھتر جگہ ذکر فرمایا ہے ۔آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے۔مگر صبر کا اجر بے حساب ہے۔پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو ان کے آسان ہونے کا ایک علاج تو صبر ہے اور دوسرا علاج نماز ہے۔اس لیے کہ نماز ایک تریاق مجرب ہے جو ذکر ،شکر ،خشوع وخضوع اور اس قسم کے مختلف اجزا سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا علاج ہے۔''(۷)

غرض قوت غضب اور قوت شہوت کا غلبہ انسان کو گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔صبر سے انسان نفس کی ان دونوں قوتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے ۔صبر سے ہی وہ تمام گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔مصائب کو برداشت کرنے اور اللہ تعالی کے احکامات کی پابندی سے وہ اعلی مقام حاصل کرسکتا ہے۔

---

(۶) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج:۶ ص:۳۴۴

(۷) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۳۲۱

مولانا امین احسن اصلاحی سورہ بقرہ کی آیت ۴۵ میں بنی اسرائیل کو صبر اور نماز سے متعلق دیے جانے والے حکم کے متعلق لکھتے ہیں:

''عہد الٰہی کو از سر نو استوار کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کرنے یا جن باتوں سے روکا ہے ان سے بچنا نفس کے لیے نہایت مشکل ہے۔ اس مشکل کو صبر اور نماز آسان بنا سکتے ہیں۔ صبر کا تعلق اخلاق و کردار سے جبکہ نماز کا تعلق عبادات سے ہے۔ دنیا میں کسی اعلیٰ کام کی تکمیل مشکلات وموانع کے باوجود حق پر ثابت قدم رہنے سے ہے۔ حق پر ثابت قدمی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے، جس کا طریقہ نماز ہے۔ آدمی اگر ایک صحیح راہ پر چلنے کا ارادہ کرے اور اس پر چل پڑے ۔ اس کے ساتھ وہ اپنے رب کو یاد کرے اور اس سے مدد مانگے تو اس کے عزم کی قوت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے۔ انتہائی مشکل حالات بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اگر حالات کی نزاکت سے اس کے پاؤں لڑکھڑائیں تو نماز کے ذریعے قائم تعلق باللہ اسے گرنے نہیں دیتا۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا جو حکم دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ اس وصف کو پیدا کیے بغیر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی اور نماز کا حکم اس لیے دیا کہ یہی چیز صبر پیدا کرنے، اس کو ترقی دینے اور اس کو درجہ کمال تک پہنچانے کا وسیلہ وذریعہ ہے۔''(۸)

اللہ رب العزت نے صبر کی تلقین کرنے والوں کا ذکر ان لوگوں میں فرمایا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ نقصان سے بچنے والے ہیں:

وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ (العصر ۱۰۳:۳)

اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

مولانا حمید الدین فراہی حق اور صبر کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل محبوب ومطلوب ہے اور صبر اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔'' اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جمے رہنا ہے۔ اب غور کرو دو لفظوں -------- حق وصبر -------- کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کسی خوبی واختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں اور ان کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔''(۹)

مولانا امین احسن اصلاحی سورہ **البلد** میں ''**تواصی بالصبر**'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں۔ اس وجہ سے ان کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت مستحکم ہو۔ صبر کا اصل مفہوم عزیمت واستقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے ان کو ساتھ ہی صبر واستقامت کی بھی تلقین کی جائے''۔(۱۰)

---

(۸) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱، ص:۱۸۹، ۱۹۰

(۹) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۹، ص:۵۳۸

(۱۰) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۹، ص:۳۷۷

ان تشریحات سے یہ بات واضح ہوئی کہ حق اور صبر کا گہرا تعلق ہے۔حق بات کہنے پر انسان کو تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان مصائب کے مقابلے کے لیے، بہترین ہتھیار صبر ہے۔انبیاء کرام نے حق کی تلقین کی تو ان پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیے گئے لیکن انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ختم الرسلؐ کے اصحاب نے بھی صبر کا مثالی مظاہرہ پیش کیا۔انسانی کامیابی اسی سے وابستہ ہے کہ انسان خود بھی صبر سے کام لے اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرے۔تا کہ اسلامی معاشرہ صبر کی عملی مثال پیش کرے۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''صبر کی حقیقت'' بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبر کی حقیقت نرم وگرم ہر طرح کے حالات میں حق پر حزم واستقامت ہے۔غربت، بیماری، مصیبت، مخالفت، جنگ، غرض جس قسم کے بھی حالات سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے عزم وہمت کے ساتھ اس کو برداشت کرے، ان کا مقابلہ کرے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کی حد تک موقف حق پر جما رہے۔دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوہ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے۔دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمائش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر سکتی ہے۔جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے اور اس پر چل کے استوار رہنے کا آرزومند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔مزاحمتوں سے مقابلے کے لیے (اور اس راہ میں ہر قدم پر مزاحمتوں سے مقابلہ ہے) اصلی ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔فلسفہ دین کے نقطہ نظر سے دین نصف شکر ہے اور نصف صبر۔عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہوسکتا۔''(۱۱)

قرآن عظیم اور احادیث نبویہ میں صبر کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔اللہ تعالی صابرین کا بدلہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَجَزٰهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا (الدھر۷۶:۱۲)

اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہاں صبر بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتی کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اس نقصان اور رنج اور اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ تعالی کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔''(۱۲)

---

(۱۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲، ص:۴۳

(۱۲) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۶ء) ج:۶، ص:۱۹۸

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی واحد چیز یہی ہے کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کو خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔(۱۳)

مفتی محمد شفیعؒ صبر کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبر کے اصل معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں۔قرآن وسنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں۔ (۱) اپنے نفس کو حرام وناجائز چیزوں سے روکنا (۲) طاعات وعبادات کی پابندی پر مجبور کرنا (۳) مصائب وآفات پر صبر کرنا۔ یعنی جو مصیبت آ گئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف وپریشانی کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں۔ ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں عام طور پر ان کو صبر میں داخل نہیں سمجھا جاتا۔قرآن وحدیث میں صابرین انہی لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی گزارتے ہوں۔ روز محشر پکارا جائے گا کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی زندگی میں تینوں طرح کا صبر موجود ہوگا انہیں جنت میں داخلے کی اجازت دے دی جائے گی۔مفسر ابن کثیرؒ کے نزدیک درج ذیل ارشاد الٰہی سے بھی اسی طرف اشارہ ہوتا ہے۔''(۱۴)

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ۳۹:۱۰)

اس کے سوا نہیں کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب پورا پورا دیا جائے گا

غرض تکالیف پر صبر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔صبر حوصلے والے رسولوں کی سنت ہے۔خصوصا ہمارے نبی مکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں صبر کا بہترین نمونہ فراہم کیا۔صبر ہی آپ کی چادر تھی۔شعب ابی طالب ہو یا طائف کا واقعہ آپؐ صبر کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔صبر آپؐ کی سنت بھی ہے۔صبر کی مختلف شکلیں ہیں۔صبر روزے کی شکل میں بھی کیا جاتا ہے۔اس لیے اللہ کے رسولؐ نے رمضان کو صبر کا مہینہ قرار دیا تھا اور صبر کا بدلہ جنت بتایا تھا۔جنگ کے مواقع پر صبر کا معنی ثابت قدمی ہے۔جنگ کی صورت میں ثابت قدمی دکھانا بھی مسلمانوں پر فرض ہے۔

---

(۱۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۹،ص ۱۱۲

(۱۴) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۱،ص:۳۹۴

۳۔ایفائے عہد

عہد سے مراد وعدہ ہے۔ایفائے عہد سے مراد وعدے کا پورا کرنا ہے۔قرآن مجید نے وعدے کے لیے عقد،عہد، میثاق کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اللہ تعالی نے مومنوں کو وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔اس سلسلے میں ارشاد الہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ(المائدہ ۵:۱)

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''عقد'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عقد کا لفظ عہد و میثاق کے الفاظ کے مقابل میں عام ہے۔اس میں قول،قرار،قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے سب آ گیا، چنانچہ اس سورہ میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج وعواقب کے ساتھ بیان ہوئی ہے،قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔''(۱)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:*

مفسرین صحابہ وتابعین کا اس پر اجماع ہے کہ عقود،عقد کی جمع ہے،عقد کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔

امام جصاص کے نزدیک عقد،عہد یا معاہدہ کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریقوں نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے۔(۲)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''عقود،عقد کی جمع ہے،جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا کر خوب باندھ دیا جائے۔اس جگہ عقود سے تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ مراد ہیں۔جن میں اللہ نے بندوں کو باندھ دیا ہے اور بندہ ان میں جکڑا ہوا ہے۔بندہ پر ان کی پابندی اور التزام ضروری ہے۔(۳)

''**عقود**'' اتنا جامع لفظ ہے کہ اس میں ہر طرح کے معاہدات آ جاتے ہیں۔جس معاہدے کی جائز شرائط طے ہو جائیں اس کی پابندی کرنا ایک مسلمان پر لازم ہے۔معاہدات میں خلاف شرع یا ناجائز شرائط کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۴۵۲

* عقود کی بہترین عصری اور مفصل تشریح مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں بیان کی ہے لہذا وہاں سے ساری تفصیل نقل کر دی ہے۔

(۲) مفتی محمد شفیع،معارف القرآن (کراچی،ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء) ج:۳،ص:۱۲،۱۳

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۴۲۵

قرآن حکیم میں دوسری جگہ ایفائے عہد کا حکم دیتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴)

اور وعدوں کو پورا کرو بے شک وعدوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا

مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کی مختصر تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور عہد (مشروع) کو پورا کیا کرو۔ بے شک (ایسے) عہد کی (قیامت میں) باز پرس ہونے والی ہے۔ عہد میں تمام احکام الٰہی اور تمام عقود جو بندوں کے درمیان ہیں داخل ہو گئے۔ عہد کی تعریف یہ ہے کہ

كُلُّ عَقۡدٍ تَقَدَّمَ لِاَجۡلِ تُوۡثِيۡقِ الۡاَمۡرِ وَتُوۡكِيۡدِهٖ فَهُوَ عَهۡدٌ

ہر وہ معاہدہ جو پہلے سے کسی معاملے کو پختہ کرنے اور اس کی مضبوطی کے لیے کیا جائے وہ عہد کہلائے گا۔

عہد کی دوسری تعریف یہ ہے کہ :

قِيۡلَ اَرَادَ بِالۡعَهۡدِ مَا يَلۡتَزِ مَهٗ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ

کہا گیا ہے کہ عہد سے مراد وہ کام ہے جو انسان اپنی ذات پر لازم کر لیتا ہے۔ (۴)

معاہدات کی تین بنیادی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ وہ معاہدات جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے۔ اس میں ایمان اور اطاعت کا عہد شامل ہے۔ نیز احکامات الٰہی کی پیروی کا عہد بھی شامل ہے۔

۲۔ وہ معاہدات جو ایک انسان اپنے آپ سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی چیز کی نذر ماننا، قسم اٹھانا یا کوئی چیز اپنے اوپر لازم کر لینا وغیرہ۔

۳۔ وہ معاہدات جو ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ یا ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً نکاح، تجارت، شراکت وغیرہ کے معاہدات یا ملکوں اور قوموں کے ساتھ بین الاقوامی معاہدات شامل ہیں۔

مفتی محمد شفیعؒ ان معاہدات کو پورا کرنے سے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب ہے اور جو خلاف شرع ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم کر دینا واجب ہے۔ جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت سے رجوع کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرے۔ معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یک طرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپ کو فلاں چیز دوں گا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کر دوں گا اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے۔ بعض حضرات نے اس کو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدہ فریقین کی صورت میں اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو دوسرا فریق اس کو بذریعہ عدالت تکمیل معاہدہ پر مجبور کر سکتا ہے۔ مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعے جبرا پورا نہیں کرا سکتا۔ بلا عذر شرعی کے کسی سے وعدہ کر کے جو خلاف ورزی کرے گا وہ شرعاً گناہگار ہوگا۔ حدیث میں اس کو عملی نفاق قرار دیا گیا ہے۔'' (۵)

---

(۴) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۱ص:۳۷۴

(۵) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵ص:۴۶۷، ۴۶۸

درج بالاتفسیر سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں ہر قسم کا وعدہ شامل ہے۔ وعدے کو پورا کرنا واجب ہے۔ دیگر فرائض اور واجبات کی طرح قیامت کے دن وعدوں سے متعلق سوال کیا جائے گا کہ کیا وعدہ پورا کیا تھا یا نہیں۔ اگر عہد خلاف شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگر وعدہ شریعت کے خلاف ہے تو دوسرے گروہ کو اطلاع کر کے اسے ختم کر دینا چاہیے۔

عہد کرتے وقت ایفا (پورا کرنا) کی نیت رکھنا واجب ہے۔ اگر وعدے کے وقت وعدہ پورا کرنے کی نیت کی تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وعدہ پورا کرنے والوں میں شامل ہوگا۔ اگرچہ بعد میں کسی مجبوری کی وجہ سے وعدہ پورا نہ کر سکے۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت نہیں کرتا اور بعد میں شرمندگی کے ڈر سے اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے تو اس وعدے کا پورا کرنا قابل اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ نیت اور ارادہ عمل کی بنیاد ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے وعدے کو پورا کرنے سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَبِعَهْدِاللّٰهِ اَوْفُوْا،ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الانعام ۶:۱۵۲)

اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو یہ حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تصریح فرمائی ہے:

اللہ تعالیٰ کے عہد کو پوار کرنے سے مراد جائز قسم یا نذر کو پورا کرنا ہے اور اس کا پورا نہ کرنا حرام ہے۔(۶)

اللہ تعالیٰ کے عہد سے مراد عہد الست بھی لیا گیا ہے۔ وہ عہد جس میں ہر انسان کی روح نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب تسلیم کیا تھا۔ اس عہد سے مقصود یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ اس کے معروف احکام کو اہمیت اور اولیت دیں۔ غرض اس عہد میں اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان و اطاعت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں مذکور بعض خاص عہد بھی اللہ تعالیٰ کے عہد میں شامل ہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیات ۱۵۱،۱۵۲،۱۵۳ بھی شامل ہیں، جن میں دس احکام تاکید کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نذر اور منت کا پورا کرنا بھی عہد الٰہی میں شامل ہے۔ ایک انسان اپنے رب سے یہ عہد کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے نذر کو پورا کرنے والوں کے بارے میں فرمایا: **يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (الدهر ۷۶:۷)** کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اپنی منتوں کو پورا کیا کرتے ہیں۔

مفتی محمد شفیعؒ عہد کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عہد ایک تو معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملے کے سلسلے میں لازم قرار دیا جائے۔ اس کا پورا کرنا فرض ہے اور اس کے خلاف کرنا غدر اور دھوکا ہے جو حرام ہے۔ دوسرا وہ عہد جسے وعدہ کہتے ہیں یعنی ایک طرف سے کوئی شخص کسی شخص سے کسی چیز کے دینے کا یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کر لے۔ اس کا پورا کرنا شرعی طور پر لازم اور واجب ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے وعدے کو قرض قرار دیا۔ جیسے قرض کی ادائیگی واجب ہے ایسے ہی وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے کسی شرعی عذر کے بغیر اس کے خلاف کرنا گناہ ہے۔''(۷)

غرض مفسرین نے عہد کی تعریف اور اقسام کے بعد شرعی لحاظ سے ہر قسم کے جائز عہد کو پورا کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اس لیے اس نے اپنے بندوں کو بھی عہد پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیز قیامت کے دن وعدہ پورا کرنے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

---

(۶) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۲۹ھ) ج:۱،ص:۶۰۱

(۷) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء) ج:۶،ص:۲۹۸

۴۔عدل

عدل کے لفظی معنی کسی چیز کو اس کے مقام پر رکھنا اور دو برابر حصوں میں تقسیم کرنے کے آتے ہیں ۔اللہ تعالی عادل ہیں ۔اللہ تعالی نے اس کائنات کے نظام کو عدل کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالی قرآن مجید میں عدل سے متعلق حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاۗئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْہٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔(النحل ۱۶:۹۰)

بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا اور روکتا ہے بے حیائی اور نامعقول کام اور سرکشی سے ،تم کو سمجھاتا ہے شاید تم یاد رکھو۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''عدل سے مراد بلاکم وبیش سب کے حقوق ادا کرو اور سب چیزوں میں خواہ وہ اعتقاد سے متعلق ہوں اعتدال،توسط اور میانہ روی کو ملحوظ رکھو۔ٹھیک افراط اور تفریط کے درمیان چلو۔ترازو کا کوئی پلہ ادھر ادھر جھکنے نہ پائے اور نہ اٹھنے پائے۔عدل کے معنی لغت میں توسط کے ہیں یعنی دونوں جانبین برابر ہیں نہ حد سے بڑھے اور نہ گھٹے اور آیت میں عدل سے اعتدال کے معنی مراد ہیں۔یعنی اعتقاد اور اقوال وافعال سب میں درجہ اعتدال پر قائم رہو،یعنی ہر ایک چیز کو اس کی حد پر رکھو اور اس سے تجاوز نہ کرو۔توحید عدل ہے اور شرک ظلم ہے۔عبادت خالق کا حق ہے نہ کہ مخلوق کا ،کسی کا حق ادا کرنا یہ عدل ہے اور کسی کا حق دوسرے کو دے دینا یہ ظلم ہے۔''(۱)

سید ابوالاعلی مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو ۔دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ''انصاف'' سے ادا کیا جاتا ہے،مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔۔۔دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری ۔بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے،مثلاً حقوق شہریت میں۔مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے،مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی واخلاقی مساوات اور اعلی درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔پس اللہ تعالی نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن وتناسب ہے،اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی ،معاشرتی،قانونی اور سیاسی وتمدنی حقوق پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔''(۲)

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۴،ص:۳۹۶

(۲) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۲،ص:۵۶۵

حق دار کو اس کا حق دینا بھی عدل ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی ''عدل'' کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عدل یہ ہے کہ جس کا جو حق واجب ہم پر عائد ہوتا ہے ہم بے کم و کاست اس کو ادا کر دیں، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقتور اور خواہ ہم کو مبغوض ہو یا محبوب۔(۳)

غرض عدل کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ عدل کے لغوی معنی برابری کے ہیں۔ سید ابوالاعلی مودودی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے توازن اور تناسب کو عدل کا صحیح مفہوم قرار دیا ہے۔ لوگوں کے مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ بھی عدل کہلاتا ہے۔ دو فریقوں کے درمیان کسی کی طرف جھکے بغیر حق کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی عدل ہے۔ افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنے کو بھی عدل کہا جاتا ہے۔ ظاہر و باطن میں ایک ہونے کو بھی عدل کہا گیا ہے۔ پھر مختلف نسبتوں سے عدل کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔ انسان کا اپنے رب اور اپنے نفس کے درمیان عدل یہ ہے کہ اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنے کو اپنی خواہشات پر ترجیح دے۔ اللہ تعالی کے احکامات کی مکمل پیروی کرے۔ اپنے نفس کے ساتھ عدل یہ ہے کہ نفس کو جسمانی یا روحانی طور پر ہلاک کرنے والی چیزوں سے روکے۔ نیز نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ اپنے اور دیگر مخلوقات کے درمیان عدل یہ ہے کہ وہ دیگر مخلوقات کے ساتھ اچھائی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، کسی معاملے میں بھی خیانت نہ کرے۔ اس کی کسی بات یا عمل سے کسی دوسرے کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔

عدل و انصاف کے متعلق ایک جامع حکم سورہ نسآء میں بیان ہوا ہے ارشاد الہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۚ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (النسآء ۴:۱۳۵)

اس آیت کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کرتے ہوئے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

اے ایمان والو! (تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی) انصاف پر خوب قائم رہنے والے (اور اقرار و شہادت کی نوبت آئے تو) اللہ (کی خوشنودی) کے لئے (سچی) گواہی دینے والے رہو، اگر چہ (وہ گواہی اور اظہار) اپنی ہی ذات کے خلاف ہو (جسکو اقرار کہتے ہیں) یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو (اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچنا چاہئے تا کہ اس سے بے مروتی نہ ہو یا یہ کہ یہ غریب ہے، اس کا کیسے نقصان کر دیں، تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع نقصان کو نہ دیکھو کیونکہ) وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی) اگر امیر ہے تو غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالی کو زیادہ تعلق ہے (اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالی کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر جب باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالی نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی کہ اظہار حق کیا جائے یعنی گواہی میں حق بات کہی جائے خواہ اس سے وقتی طور پر کچھ نقصان بھی پہنچ جائے تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو) سو تم (اس شہادت میں) خواہش نفس کا اتباع مت کرنا، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اور تم کج بیانی کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا پہلو تہی کرو گے (یعنی شہادت کو ٹال و گے) تو (یاد رکھنا) بلا شبہ اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔(۴)

---

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۴۳۹

(۴) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۱، ص:۴۱۴

عدل اور انصاف کا تقاضا ہے کہ کسی کی رعایت کیے بغیر مقدمات کا فیصلہ کیا جائے۔گواہوں کے لیے حکم ہے کہ حق اور سچ کا ساتھ دیتے ہوئے گواہی دیں ۔گواہی دینے میں رشتہ داری کا خیال بھی نہ کریں۔اس آیت میں انصاف کی روش پر چلنے کا نہیں بلکہ انصاف کا علمبردار بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ظلم کو مٹانے کے لیے عدل کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی جامع تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاکُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ :

اس سے مراد حق وعدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالی نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے بنو۔
اس قیام بالقسط کے لیے ہی اس نے مکافات عمل کا قانون رکھا ہے۔اسی کے لیے اس نے انبیا و شرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا۔اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں،اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزان عدل نصب ہوگی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے کون سا نہیں اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔(۵)

شُھَدَآءَ لِلّٰہِ :

یعنی مجرد اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اس کے داعی اور گواہ بھی ہو،جیسا کہ فرمایا:

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًالِّتَکُوْنُوْاشُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا(البقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں معتدل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

ولوْعَلٰی اَنفُسَکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبَیْنَ:

یعنی یہ میزان عدل صرف لینے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ دینے کے لیے بھی ہے۔اگر اس کا فیصلہ کسی معاملے میں تمہارے ،تمہارے والدین کے اور تمہارے اقربا کے خلاف ہو جب بھی تمہیں اس پر قائم رہنا اور اس کی گواہی دینا ہے۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہود کو جو کتاب دی گئی تو وہ اس کی وہ باتیں تو مانتے تھے جو اپنی خواہش کے مطابق پاتے لیکن جو باتیں ان کی خواہشوں کے خلاف پڑتیں ان سے کنی کاٹ جاتے۔

---

(۵)مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۵۰،۵۱

اِنۡ یَکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًافَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِھِما:

یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے اور باٹ سے تولو غریب کے لیے اور باٹ سے ،قوی اور بااثر کے لیے الگ قانون شریعت ہو کمزور اور بااثر کے لیے الگ حکم وفتوی بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانون عدل کے ماتحت ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے اگر کوئی شخص امیر اور بااثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا کے قانون کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کے تحت معاملہ کیا جائے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضورؐ کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں:

جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کرے بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ بن زید کر سکتے ہیں وہ رسولؐ کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہ نے حضورؐ سے اس کی سفارش کی۔ حضورؐ نے فرمایا :اسامہ تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتیں تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔*

فَلَاتَتَّبِعُوْاالْھَوٰٓی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا:

ھوی ۔ ھدی اللہ کی ضد ہے یعنی اگر تم نے اللہ کی یہ ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں اور بدعتوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر اللہ نے تم کو قائم کیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور کیے گئے ہو۔

وَاِنۡ تَلۡوٗٓااَوۡتُعۡرِضُوۡا:

اس میں اس نظام قسط کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے ایک تو یہ کہ اس کو کج کرنے ،بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر **یَلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَھُمۡ بِالۡکِتٰبِ (آل عمران ۳:۷۸)** میں ہوا ہے ۔دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے ،اس کی شکل باقی رہے ،لیکن زندگی کے معاملات میں اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے ۔فرمایا کہ ان میں جو ظلم بھی کرو گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا اور جب بے خبر نہیں رہے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس جرم عظیم کی سزا دے کر چھوڑے گا۔(٦)

---

*مولانا امین احسن اصلاحی نے صرف متفق علیہ لکھا ہے تاہم میں نے اس کا اصل حوالہ لکھ دیا ہے:

صحیح مسلم ،کتاب الحدود،باب قطع السارق الشریف وغیرہ و النھی عن الشفاعۃ فی الحدود،رقم:۳۲۰۲

(٦) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۴۰۷

ولو علی انفسکم:

فرما کراس طرف ہدایت فرمادی کہ انصاف کا مطالبہ صرف دوسروں ہی سے نہ ہو، بلکہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہیے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا اظہار کرنا پڑے تو بھی حق وانصاف کے خلاف کچھ نہ بولے اگر چہ اس کا نقصان اس کی ذات پر ہی پڑتا ہو، کیونکہ یہ نقصان حقیر وقلیل وعارضی ہے اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچالی گئی تو قیامت کا شدید عذاب اپنی جان کے لیے خرید لیا۔(۷)

عدل سے متعلق دوسری جگہ اللہ تعالی کا حکم ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاكُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوااللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ۵:۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے ہو جاؤ انصاف کی گواہی دینے کو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو، تم انصاف کرو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرو بے شک تم جو کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔

قرآن مجید نے عدل وانصاف کے لیے قسط کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اسلام کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ اس نے اس آیت میں دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیز ایسے عدل کو تقوی کے زیادہ قریب بتایا ہے۔ انصاف کے قیام سے مراد یہ ہے کہ حقدار کو اس کا حق ادا کیا جائے۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی شامل ہے۔ ظالم کو ظلم سے روکنا، مظلوم کی حمایت کرنا، مظلوم کو حق دلوانے کے لیے سچی گواہی دینا اور کسی پر ظلم نہ کرنا دراصل انصاف کو قائم کرنا ہے۔ منصف کو بھی چاہیے کہ وہ فریقین کے ساتھ برابری کا سلوک کرے۔ گواہوں کے بیانات کو غور سے سنیں۔ معاملے کی حقیقت جاننے کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ آخر میں فیصلہ مکمل انصاف کے ساتھ کریں۔ اس طرح ہر شخص اپنے تک انصاف کو قائم کرنے کی کوشش کرے۔

اس آیت کا ابتدائی مضمون الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ سورہ نساء کی ۱۳۵ نمبر آیت میں گزر چکا ہے۔ ان دونوں آیات میں عدل وانصاف سے روکنے والے دو اسباب کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک تو انسان کی اپنے نفس، عزیز رشتہ دار اور دوست احباب کی طرف داری اور دوسرا سبب کسی فرد یا قوم سے دشمنی ہے۔ * لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔

کسی قوم کی دشمنی عدل کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

یہ حق وعدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی ہمیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیطان نے راہ حق سے گمراہ کرنے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے۔ یہود نے محض بنی اسماعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس تمام عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا، جس کے وہ گواہ اور ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کے رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو ہو۔

---

(۷) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۲، ص:۵۷۷

یہی عدل تقویٰ سے اقرب ہے یعنی تقویٰ جو تمام دین و شریعت کی روح اور اور اہل ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے ۔اس سے موافقت رکھنے والا طرز عمل یہی ہے کہ دشمن کی دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے اس سے دین میں تقویٰ کا مقام واضح ہوا کہ تمام نیکیاں درحقیقت اسی کی جڑ سے ہے۔(۸)

کفار کے ساتھ انصاف کا حکم سورہ الممتحنہ میں بھی دیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنه۶۰:۸)

اللہ تمہیں منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو تم سے دین (کے بارے) میں نہیں لڑے اور انہوں نے تمہیں نہیں نکالا تمہارے گھروں سے، کہ تم ان سے نیکی (دوستی) کرو اور ان سے انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ دشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیک برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے ،مگر کیا انصاف بھی صرف انہی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سیاق وسباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت نہیں برتتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دشمن اور غیر دشمن کو ایک درجے میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سلوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حق ہے جنھوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظلم توڑے اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا اور نکالنے کے بعد بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اس ظلم میں کوئی حصہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتے اور برادری کے لحاظ سے ان کے جو حقوق تم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔''(۹)

ایسے کافر جو مسلمانوں کے ساتھ قلبی دشمنی رکھتے ہیں۔ انہیں ہجرت پر مجبور کرتے اور ان سے جنگیں لڑتے ہیں۔ان کے ساتھ باطنی اور ظاہری کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسے کافر جو مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کرتے، نہ ان کے ساتھ لڑتے ہیں اور نہ انہیں ہجرت کرنے پر مجبور کرتے ہیں ایسے کفار کے ساتھ ظاہری تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کا حکم دیا گیا۔اس سے اسلام کی وسعت نظری کا بھی ثبوت ملتا ہے جو اپنے پیروکاروں کو دشمنوں کے ساتھ معاملات اور مقدمات میں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔

آیت میں بر اور عدل کا حکم دیا گیا ہے۔لیکن صرف انصاف کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بر کی تعریف میں آنے والی نیکیوں پر عمل کرنا عدل کی نسبت آسان ہے۔ جبکہ عدل کو قائم کرنا مشکل ہے۔ خاص کر دشمنوں کے مقابلے میں عدل کا قیام اور مشکل ہے۔اس لیے اللہ رب العزت نے عدل کرنے والوں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔

سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کو بھیجنے، کتب اور صحائف کو نازل کرنے کا مقصد دنیا میں انصاف اور اس کے ذریعے امن وامان

---

(۸) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۴۷۱

(۹) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵،ص:۴۳۳

قائم کرنا تھا۔ ہر انسان اپنے دائرہ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے اور جو سرکش لوگ تعلیم تبلیغ یا نصیحت کے ذریعے عدل وانصاف پر نہ آئیں انہیں قانونی سیاست اور تعزیر و سزا کے ذریعے انصاف پر قائم رہنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

مفتی محمد شفیعؒ اس آیت میں قیام عدل کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس آیت میں بنیادی چیز یہ ہے کہ عدل وانصاف کے قیام کی ذمہ داری تمام انسانوں پر ڈال دی گئی ہے۔ سورہ نساء اور مائدہ میں تو اس کا مخاطب **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** فرما کر پوری امت مسلمہ کو بنادیا گیا ہے اور سورہ حدید میں **لِیَقُوْمَ النَّاسَ بالقسط** فرما کر اس فریضہ کو تمام افراد انسانی پر عائد کر دیا گیا ہے۔ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلّف ومخاطب ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لیے کوشش کرے۔ ہاں انصاف کا صرف ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں نہ دوسروں کو عدل وانصاف کرنے دیں تو حاکمانہ تعزیر اور سزا کی ضرورت ہے، یہ اقامت عدل وانصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کرسکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔(۱۰)

مفتی محمد شفیعؒ شہادت کے وسیع مفہوم کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسی طرح شہادت سے مراد صرف مقدمات میں کسی منصف کے سامنے گواہی دینے کے ساتھ خاص سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں شہادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ کسی کو میڈیکل سٹرٹیفکیٹ دینا (کہ نوکری کے لیے اہل ہے یا نہیں، یا چھٹی وغیرہ کے لیے) بھی ایک شہادت ہے۔ اگر اس میں حقیقت کے خلاف لکھا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہوگیا۔ اسی طرح امتحانات کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے، ارادے کے ساتھ یا لاپروائی سے نمبروں میں کمی بیشی کی گئی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے جو کہ حرام اور سخت گناہ ہے۔ اسی طرح نااہل شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے، بری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے اعمال نامہ میں لکھے جائیں گے۔(۱۱)

غرض آپؐ کی آمد سے قبل آنے والے تمام انبیاء اور اسلام کے ظہور سے قبل نازل ہونے والی تمام کتابوں نے انسانوں کو عدل کا حکم ربانی دیا۔ اب یہ تمام انسانوں کی عمومی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مذہب اور ملک کی تفریق کے بغیر عدل کو قائم کریں۔ بدقسمتی سے اس وقت مقتدر قوموں نے عدل کے حوالے سے دوہرا معیار اپنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ کوئی ظلم ہوتا ہے تو خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کسی کافر کے ساتھ زیادتی ہو جائے تو چیخنے اور چلانے لگتے ہیں۔ مسلمان معاشروں میں بھی عدل کا فقدان نظر آتا ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعلی پنجاب ایک بس میں سفر کر رہے تھے۔ اس بس میں عام آدمی بھی سفر کر رہے تھے۔ صحافی نے ایک عام آدمی سے سوال کیا کہ ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے۔ اس نے جواب دیا عدل کی کمی ہے۔ وزیر اعلی پنجاب نے اس کی تائید کی کہ واقعی ہمارے معاشرے میں عدل نہیں ہے۔ اس لیے مسلمان حکمرانوں کی خاص کر یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عدل کو قائم کریں۔

---

(۱۰) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۲، ص:۵۷۲، ۵۷۷

(۱۱) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۳، ص:۷۰-۷۲

۵۔احسان

احسان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔اسلامی عبادات میں خوبصورتی احسان کہلاتی ہے۔عدل کے مقابلے میں احسان معاف کرنے کو کہتے ہیں۔
اللہ تعالی احسان کرنے والے ہیں۔اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔اللہ تعالی احسان سے متعلق حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔(النحل ۱۶:۹۰)
بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا اور روکتا
ہے بے حیائی اور نامعقول کام اور سرکشی سے ہتم کو سمجھاتا ہے شاید تم یاد رکھو۔

احسان کے لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں۔احسان کی دو اقسام ہیں۔ایک یہ کہ اپنی ذات میں عمل،اخلاق یا عبادات کو اچھا اور مکمل کرے۔دوسرا یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے۔عربی زبان میں دوسرے معنی کے لیے احسان کے ساتھ حرف الی استعمال ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ایک آیت میں ارشاد ہے: **وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص ۲۸:۷۷)**
اللہ تعالی کی پیدا کی ہوئی تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی احسان میں شامل ہے۔ اگر ایک شخص پالتو جانور کی خوراک اور ضروریات کا خیال نہیں رکھتا وہ جتنی بھی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔احسان عدل سے بڑھ کر ہے۔کسی کو اس کا پورا حق دینا عدل ہے جبکہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینا،اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لینا یا کم لینا احسان ہے۔کسی کی تکلیف کے جواب میں اسے اتنی ہی تکلیف پہنچانا عدل ہے جبکہ انتقام لینے کی بجائے معاف کر دینا احسان ہے۔عدل کا حکم فرض اور واجب کے درجے میں ہے جبکہ احسان کا حکم نفل کے درجے میں ہے۔
سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

> ''احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے،جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو،اسے بس کر دے اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے،اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل وجان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض اطاعت کا درجہ ہے،جس کے لیے صرف تقوی اور خوف کافی ہو جاتا ہے اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے،جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔''(۱)

اللہ رب العزت احسان کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاَنْفِقُوْا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ
وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ ۲:۱۹۵)
اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو
بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۱۵۳

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

واحسنوا کا عطف **انفقوا** پر ہے۔ یہاں احسان کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اور وہ مال خرچ کرو جو تمہیں عزیز و محبوب ہو۔ انفاق کے معاملہ میں احسان کی تاکید اللہ نے جگہ جگہ فرمائی ہے۔۔۔

انفاق میں جب تک اللہ تعالی کے لیے جوش جذبہ اور یہ احتیاط شامل نہ ہو اس وقت تک اس کو احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالی ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہے۔ البتہ ہم خود اس کے جود و کرم کے ہر وقت محتاج ہیں۔ وہ اگر ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ خود ہمارے لیے کرتا ہے تا کہ اس طرح وہ ہمارے خلوص کا امتحان کرے اور ہمارے خزف ریزوں کو قبول فرما کر ان کو ایک ابدی اور لازوال خزانے کی شکل میں ہمیں ایک دن واپس لوٹائے۔ (۲)

غرض اس آیت میں اپنے اقوال اور اعمال کو خوبصورت بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے انسان اپنے اوپر احسان کرتا ہے ۔عبادات میں حسن اخلاص سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر عبادت کے اندر بھی خوبصورتی اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (العلق ۹۶:۱۴)

کیا انسان کو یہ علم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی مختصر تفسیر اس طرح فرمائی ہے:

''اور جو کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلا اس موقع پر خرچ کرنا ہے دل کھول کر، خوشی سے، اچھی نیت کے ساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالی پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔'' (۳)

احسان کا وسیع مفہوم ہے۔ کہیں اس کے معنی خوبصورتی کے آتے ہیں۔ کہیں اس کے معنی اخلاص کے آتے ہیں۔ عدل کے مقابلے میں اس کے اندر معافی کا معنی پایا جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ بغیر کسی لالچ کے بھلائی کر دینے کو بھی احسان کہا جاتا ہے۔ احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں ملتا ہے ۔والدین، انسانوں حتی کہ جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی احسان کہلاتا ہے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ نے قتل کرنے اور جانور کو ذبح کرنے میں بھی احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ تعالی کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں جن کا ہم بدلہ نہیں چکا سکتے۔ ان احسانات کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کا بے حد شکر ادا کیا جائے۔ اللہ تعالی کے بعد حضرت محمد ﷺ کے احسانات بہت زیادہ ہیں۔ آپ ؐ کو آپ کے احسانات کی وجہ سے محسن انسانیت کا لقب عطا کیا گیا ہے۔ دین پہنچانے کے حوالے سے صحابہ کرامؓ اور علماء امت کے ہم پر بہت زیادہ احسانات ہیں۔ احسان ان صفات میں بھی شامل ہے جن کو اختیار کر کے ہم اللہ تعالی کی محبت حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی عبادات اور معاملات میں احسان پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

---

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۴۸۱

(۳) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۱،ص:۱۲۵

۶۔عفو

کسی کی زیادتی پر انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے اسے معاف کر دینا بہت بڑی اخلاقی خوبی ہے۔اللہ رب العزت مشرک کے سوا ہر ایک کے لیے معافی کا اعلان کر چکے ہیں۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ نے طائف اور فتح مکہ کے موقع پر انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے معاف کرنے کی اعلیٰ مثال قائم کی۔غصہ جو انتقام کی بنیاد بنتا ہے، اسے حرام قرار دیا گیا۔اللہ رب العزت نے انسانوں کو ایک حد تک معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔
اللہ رب العزت نے عفو کے متعلق مسلمانوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (البقرہ ۲:۱۰۹)

ترجمہ: درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک اللہ اپنا حکم بھیجے

عفو کے ایک معنی تو دل سے معاف کر دینے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی کو نظر انداز کر دینے کے بھی ہیں۔مثلاً

یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتَابِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (مائدہ ۵:۱۵)

تمہارے لیے بیان کرتا ہے بہت سی وہ چیزیں جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے۔

صفح: کا معنی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہیں کسی حماسی کا شعر ہے:

صفحنا عن بنی ذھل　　　　وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنی ذھل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ یہ لوگ بھائی ہیں۔(۱)

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عفو کے معنی دل سے معاف کر دینا اور نظر انداز کر دینے کے ہیں۔صفح کے معنی بھی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کر دینے کے آتے ہیں۔اسلام کے ابتدائی زمانہ میں کفار کے لیے عفو سے مراد تھا کہ ابھی انہیں مہلت دیں اور ان کی شرارتوں کو نظر انداز کریں۔معاف کرنے کے تین درجے ہیں۔ادنیٰ درجہ یہ کہ دل کی ناراضگی سے معاف کیا جائے۔درمیانہ درجہ یہ ہے کہ دل کی خوشی سے معاف کیا جائے۔اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ معاف کرنے کے ساتھ احسان بھی کیا جائے۔

اللہ کے خاص بندوں کی صفات میں غصے پر قابو پانا اور لوگوں کو معاف کرنا شامل ہے۔مومن غصے سے بے قابو ہو کر انتقام نہیں لیتے۔وہ دل سے معاف کر کے تکلیف دینے والوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ان تینوں صفات کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (آل عمران ۳:۱۳۴)

جو خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔

(تفاسیر میں) اس آیت کی تفسیر میں ایک عجیب واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک کنیز حضرت سیدنا علی بن حسینؓ کو وضو کرا رہی تھی کہ اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت علی بن حسینؓ کے اوپر گرا، تمام کپڑے بھیگ گئے۔غصہ آنا طبعی امر تھا۔کنیز کو خطرہ ہوا تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی۔یہ سنتے ہی خاندان نبوت کے اس بزرگ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، بالکل خاموش ہو گئے۔اس کے بعد کنیز نے آیت کا دوسرا جملہ **والعافین عن الناس** پڑھ دیا، تو فرمایا کہ میں نے تجھے دل سے بھی معاف کر دیا، کنیز بھی ہوشیار تھی اس نے تیسرا جملہ بھی سنا دیا، **واللہ یحب المحسنین** جس میں احسان

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۲۹۹

اور حسن سلوک کی ہدایت ہے، حضرت علی بن حسینؓ نے یہ سن کر فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔*(۲)

لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کر دینا انسانی اخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس کا ثواب آخرت نہایت اعلی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ سَرَّهُ اَنْ يُشْرَفَ لَهُ الْبُنْيَانُ وَ تَرْفَعَ لَهُ الدَّرَجٰتُ
فَلْيَعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَهُ وَلْيُعْطِ مَنْ حَرَمَهُ وَلْيَصِلْ مَنْ قَطَعَهُ

جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اونچے ہوں اور اس کے
درجات بلند ہوں اس کو چاہیے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس کو معاف
کر دے اور جس نے اس کو کبھی کچھ نہ دیا ہو اس کو بخشش و ہدیہ دیا کرے،
اور جس نے اس سے ترک تعلق کیا ہو یا اس سے ملنے میں پرہیز نہ کرے۔(۳)

قرآن کریم نے دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت سے برائی کرنے والوں کے ساتھ احسان کرنے کا خلق عظیم سکھلایا اور بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں، ارشاد فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَاالَّذِی بَیْنَكَ وَ
بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌكَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (فصّلٰت ۴۱:۳۴)

یعنی برائی کی مدافعت بھلائی اور احسان کے ساتھ کرو،
تو جس کے ساتھ دشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن جائے گا۔

اللہ تعالی کے احکامات اور رسول اکرمؐ کی احادیث وسنت نے انسانوں کو معاف کرنے کا درس دیا۔ اہل ایمان کی تاریخ معاف کرنے سے بھری پڑی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کو ایک شخص نے بھرے بازار میں گالیاں دیں۔ امام صاحب نے غصہ پر قابو پایا اور اسے جواب میں کچھ نہ کہا۔ گھر واپس آئے اور ایک برتن میں درہم و دینار رکھ کر اس شخص کے گھر چلے گئے۔ اس شخص کے دروازے پر دستک دی اور اسے درہم و دینار دیتے ہوئے فرمایا کہ آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنی نیکیاں مجھے دے دیں۔ میں احسان کے بدلے میں یہ تحفہ پیش کرتا ہوں۔ امام صاحب کے اس حسن سلوک کا اثر اس شخص کے دل پر ہوا۔ اس نے آپ سے نہ صرف معافی مانگی بلکہ آپ کے پاس علم حاصل کرنے لگ گیا اور بڑا عالم بن گیا۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور ۲۴:۲۲)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور ورحیم ہے۔

---

*مفتی محمد شفیعؒ نے یہ واقعہ تفسیر روح المعانی سے امام بیہقیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے بھی اسی طرح کی ایک حکایت بیان کی ہے۔

(۲) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۲، ص:۱۸۸-۱۹۰

(۳) مکارم الاخلاق للطبرانی، باب فضل العفو عن الناس، رقم: ۵۷

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مذکورہ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالی نے میری برأت نازل فرمادی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کے لیے مسطح بن اثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ کیونکہ انہوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ ان احسانات کی ہی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر ان پر اور ان کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کو سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فورا کہا: **بلٰی واللّٰہ انا نحب ان تغفرلنا یا ربنا** ''واللہ !ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب !تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔ چنانچہ آپ نے پھر مسطحؓ کی مدد دشروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ بعض اور صحابہ نے بھی کھالی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصہ لیا ہے،ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔اس آیت کے نزول کے بعد ان سب نے اپنے عہد سے رجوع کر لیا۔اس طرح وہ تلخی آنا فانا دور ہو گئی جو اس فتنے نے پھیلا دی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کر لے جس میں بھلائی ہے،تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں۔فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کفارہ ہے،اس کے سوا کسی اور کفارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نےحضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالی قرآن مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے(**البقرہ ۲:۲۵۵۔المائدہ ۸۹:۵**) جسے اس آیت نے نہ تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر ترمیم ہی کی ہے۔اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفارہ اور چیز۔ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔(۴)

بعض آیات میں کفار سے درگزر کرنے کی نصیحت ہے۔عام مفسرین کا نظریہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد کے حکم نے کفار کے حق میں عفوودرگزر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔لیکن بعض کے نزدیک کفار کے ساتھ عفوودرگزر کا حکم منسوخ نہیں ہوا۔

سید سلیمان ندوی اس کی تصریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک مسلمانوں کو کافروں،مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے انہی قصوروں کو معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق العباد ہیں،یعنی مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر شرک اور اللہ تعالی کی نافرمانی جیسے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے،جن کے معاف کرنے کا حق بندے کو حاصل نہیں۔ جہاد وقتال اللہ کے حقوق کے مقابلے میں شروع ہوا اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفوودرگزر کے اخلاقی احکام میں دخل انداز نہیں ہیں۔''(۵)

سورہ مائدہ کی آیت نمبر۱۳ میں بنی اسرائیل کی بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کا بیان ہے۔ان بداخلاقیوں کا تقاضا تھا کہ اللہ کے رسول ان سے نفرت کریں اور اپنے سے دور کر دیں۔اس لیے آیت کے آخر میں رسول کریمؐ کو یہ ہدایت دی گئی کہ

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ۵:۱۳)

---

(۴)مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن(لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء)ج:۳،ص:۳۷۲،۳۷۳

(۵)علامہ شبلی نعمانی،علامہ سید سلیمان ندویؒ،سیرۃ النبی ﷺ(لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء)ج:۶،ص:۲۴۱-۲۴۳

آپ ان کو معاف کریں اوران کی بدعملی اور بداخلاقی سے درگزر کریں۔ان سے منافرت کی صورت نہ رکھیں۔اس لیے کہ اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ان کی بداعمالیوں کے باوجوداپنے طبعی تقاضے (نفرت وحقارت) پرعمل نہ کریں۔اس لئے کہ ان کی سخت دلی اور بے حسی کے بعد اگر چہ کسی وعظ ونصیحت کا ان کے لیے موثر ہونا دور کی بات ہے۔لیکن رواداری اور حسن خلق ہی وہ اخلاقی صفات ہیں جن کی مدد سے بے حس میں حس پیدا کی جاسکتی ہے۔یہ اس کو محسوس کریں یا نہ کریں آپ کو اپنے اخلاق اور معاملات کو درست رکھنا چاہیے۔اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔احسان ہی کی وجہ سے اللہ تعالی کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس لیے آپؐ احسان کی روش اختیار کریں۔آپ عملی طور پر احسان کرنے اور معاف کرنے کی روش اختیار کی۔آپؐ نے پتھر مارنے والوں اور گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیں۔گندگی پھینکنے والوں کی تیمارداری کی۔جنگیں مسلط کرنے والوں کو معاف کردیا۔

غرض عفو ایک اخلاقی صفت ہے جسے اختیار کرنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔ہمارے نبی مکرم ﷺ نے بھی اپنی سیرت سے یہی درس دیا ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عفو کے ساتھ انتقام کا پہلو موجود ہے۔اسلام نے عفو میں اعتدال کا درس دیا ہے۔صوفیاء نے اللہ جیسے اخلاق پیدا کرنے کا درس دیا ہے۔اللہ تعالی معاف کرنے والے بھی ہیں اور انتقام لینے والے بھی ہیں۔جہاں معافی کی حدود ختم ہوجاتی ہیں وہاں انتقام کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔مثلا اللہ تعالی شرک کو معاف نہیں کرتا اس کے علاوہ دوسرے جس گناہ کو چاہے معاف کردیتا ہے۔عیسائیت میں انتقام لینے کی تعلیم نہیں ہے۔کوئی اگر ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے آگے کردو۔مگر اسلام ایک طرف تو معافی کا حکم دیتا ہے لیکن دوسری طرف شرعی حدود بھی نافذ کرتا ہے اور ظلم وزیادتی پر انتقام لینے کی اجازت دیتا ہے۔عفو کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی عفو سے کوئی فائدہ متصور ہوتا ہو اور دینی یا اخلاقی حدود پر حملہ نہ ہوتا ہو اس سے کبھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔البتہ ہر معاملہ میں معافی درست نہیں کیونکہ بعض اوقات جرم کی معافی مجرم کو زیادہ خطرناک بنادیتی ہے۔

۷۔شکر

کسی کے احسان پر اس کی تعریف کر دینا شکر کہلاتا ہے۔یہ شکر قول،فعل اور دل کے احساس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔شکر کفر کا متضاد ہے۔اللہ رب العزت یہ چاہتے ہیں کہ تمام بندے اس کا شکرادا کریں۔شکر کرنے کے کئی روحانی اور مادی فوائد بھی ہو سکتے ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔اللہ کے شکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ شکر کا قبول کرنے والا ہے۔نبی مکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ عبادت اس لیے کرتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن جائیں۔ہم پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی بھی نعمت سے نوازیں تو ہم اس کا شکرادا کریں۔اگرچہ ہم اس کی ذات کا شکر ادا کرنے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے حمد کا ترجمہ شکر سے کیا ہے۔ان کے نزدیک قرآن عظیم میں حمد کا لفظ شکر کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔مثلاً

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰنَا لِهٰذَا (الاعراف ۷:۴۳)

انہوں نے کہا شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۱۰:۱۰)

اور ان کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر ہے اللہ کے لیے جو عالم کا رب ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِىْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراھیم ۱۴:۳۹)

شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔

مولانا امین احسن اصلاحی سورہ فاتحہ میں الحمد کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے،شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔اس کے برعکس حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے،خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے۔اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبہ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتا''۔(۱)

اگر ساری دنیا شکر کرنے والی بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتی اور اگر ساری دنیا کفر کرنے والی بن جائے تو اللہ کی بادشاہت میں کچھ کمی نہیں کر سکتی۔اس لیے شکر کرنے کا فائدہ شکر کرنے والے ہی کو ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (لقمٰن ۳۱:۱۲)

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے،اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۵۶

اللہ تعالی نے اپنے ایک ولی حضرت لقمانؑ کو حکمت عطا کی ۔اس حکمت کے عطا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اللہ تعالی کا شکر ادا کرے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکیم اور دانا وہی ہے جو اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہے۔پھر یہ بھی بیان فرما دیا کہ انسان کے شکر کرنے کا فائدہ شکر کرنے والے کو ہی ہوتا ہے ۔لیکن یہ شکر تب ہی مفید ہو گا جب یہ دل، زبان اور عمل سے کیا جائے۔

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ کی بخشی ہوئی اس حکمت و دانائی اور بصیرت و فرزانگی کا اولین تقاضا یہ تھا کہ انسان اپنے رب کے مقابلے میں شکر گزاری و احسان مندی کا رویہ اختیار کرے نہ کہ کفران نعمت اور نمک حرامی کا۔اور اس کا یہ شکر محض زبانی جمع خرچ ہی نہ ہو بلکہ فکر اور قول اور عمل تینوں صورتوں میں ہو۔وہ اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین و شعور رکھتا ہو کہ مجھے جو کچھ نصیب ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔اس کی زبان اپنے خدا کے احسانات کا ہمیشہ اعتراف بھی کرتی رہے اور وہ عملا بھی خدا کی فرماں برداری کر کے ،اس کی معصیت سے پرہیز کر کے ،اس کی رضا کی طلب میں دوڑ دھوپ کر کے ،اس کے دیے ہوئے انعامات کو اس کے بندوں تک پہنچا کر اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مجاہدہ کر کے یہ ثابت کر دے کہ وہ فی الواقع اپنے خدا کا احسان مند ہے۔''(۲)

حکمت کا پہلا فائدہ اللہ تعالی کی شکر گزاری ہے۔حکمت سے انسان اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے۔شکر سے ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔شکر ادا کرنے کی صلاحیت کے بغیر علم وفلسفہ کا ماہر اور امام حکیم نہیں سمجھا جائے گا۔شکر سے دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔اللہ کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنے نافرمانوں کو بھی دنیاوی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا۔اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس درجہ کی نعمت ہو اس درجہ کا شکر بھی ادا ہونا چاہیے۔شکر کرنے یا نہ کرنے سے اللہ تعالی کا کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہوتا۔بلکہ شکر کر کے انسان اپنا فائدہ کر رہا ہوتا ہے۔اللہ تعالی اس کے شکر کی وجہ سے اسے مزید نعمتوں سے نوازتا ہے۔اسی طرح ناشکری کر کے انسان اپنا نقصان کرتا ہے۔

سورہ لقمان کی آیت نمبر ۱۳ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شکر کی اصل روح شرک سے بچنا ہے۔اللہ تعالی بندے کو تمام نعمتیں عطا کرتا ہے اس لیے شکر بھی اللہ تعالی کا ادا کرنا چاہیے۔یہ بھی انسان پر لازم ہے کہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو کسی اور کی طرف منسوب نہ کرے۔جب انسان کو نفع اور نقصان اللہ تعالی کے حکم سے پہنچتا ہے تو شکر کے قابل بھی وہی ذات ہے۔کسی اور کا حق اللہ کے حق کے تحت ہے،اللہ کا حق سب سے بڑا ہے۔اللہ کا حق یہ ہے کہ صرف اسی کا شکر ادا کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔کیونکہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے شکر کے ساتھ انسان کو اپنے والدین کا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

اَنِ اشْكُرْلِىْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَىَّ الْمَصِيْرُ (لقمٰن ۳۱:۱۴)

میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر بجالا میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے

کسی کو اس کا حق پوری طرح ادا کرنا شکر کی اصل حقیقت ہے۔آیت کے اس حصے سے معلوم ہوا کہ شکر کے حوالے سے انسان کے اوپر خدا کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے۔اس لیے کہ وہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔اللہ تعالی حقیقی مربی ہیں اور والدین کی تربیت اسی کی تربیت کا نمونہ ہے۔یہ حق عبادت کا نہیں ہے بلکہ شکر گزاری اور خدمت کا ہے۔اگر ایفائے حق نہ ہو تو صرف زبان سے شکر ادا کرنا بالکل ایک بے معنی چیز ہے۔

---

(۲) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۴،ص:۱۴

اللہ رب العزت شکر کے فائدے کو بیان کرتے ہیں کہ شکر کرنے سے اللہ تعالیٰ اور زیادہ عطا کریں گے۔ کفر کا نقصان سخت عذاب کی صورت میں ہوگا۔ اس سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراهيم ۱۴:۷)

اور جب تمہارے رب نے آگاہ کیا، البتہ اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور تمہیں اور زیادہ دوں گا،

البتہ اگر تم نے ناشکری کی تو بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا جائے۔ اس آیت میں اللہ کی طرف سے اعلان عام ہے کہ اگر تم اپنے اعمال کو میرے احکامات کے مطابق بنانے کی کوشش کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ یہ اضافہ نعمتوں کی مقدار میں بھی ہوسکتا ہے اور ان نعمتوں کے باقی اور ہمیشہ رہنے کے حوالے سے بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس انعامات الٰہیہ کی ناشکری کرنے والے کے لیے سخت عذاب ہے۔ ناشکری کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر انعامات الٰہیہ کو اللہ کی نافرمانی والے اور ناجائز کاموں میں خرچ کرنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کیے گئے فرائض یا واجبات کے ادا کرنے میں سستی کرنا ناشکری ہے۔ دنیا میں ناشکری کا سخت عذاب یہ ہوسکتا ہے کہ نعمت ہی چھین لی جائے۔ انسان کسی ایسی مصیبت کا شکار ہو جائے کہ نعمت کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہے۔ نیز یہ سخت عذاب آخرت میں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ناشکروں کے لیے **لازیدنکم** کے مقابلے میں **لاعذبنکم** (تمہیں ضرور عذاب دوں گا) نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنے عذاب کی سختی کا ذکر فرمایا۔ ان الفاظ میں یہ اشارہ ہے کہ ہر ناشکرا عذاب الٰہی میں گرفتار نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے معافی کا امکان موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ کچھ نعمتیں آفاقی ہیں کہ سارا جہان سورج، چاند، ستارے، بحر و بر اور آب و ہوا سب کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ کھانے پینے، رہنے سہنے گرمی سردی وغیرہ کی جو نعمتیں انسان کو میسر ہیں یہ سب آفاقی ہیں۔

دوسری قسم کی نعمتیں وہ ہیں جو انسان کی ذات تک محدود ہیں۔ جیسے دیکھنے کی نعمت، ہنسنے کی نعمت، بولنے کی نعمت، صحت و سلامی وغیرہ ان سب نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ بلکہ شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ انسان کا سانس جو اندر کی طرف جاتا ہے وہ ایک نعمت ہے اور جب باہر آتا ہے دوسری نعمت ہے اس لیے کہ اندر جانے سے زندگی بڑھتی ہے اور سانس کے باہر آنے سے فرحت ملتی ہے۔ ان دونوں نعمتوں پر اللہ کا شکر واجب ہے (۳)۔

غرض شکر کے معنی کسی نعمت کے تصور اور اظہار کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے، جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا کر رکھنے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے شکر کے معنی قبولیت اور رضامندی کے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی فعل کو یا خدمت کو قبول کرتا ہے اور اس پر رضامند ہو جاتا ہے تو اسے لفظ شکر کے استعمال سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے لاتعداد انعامات کا زبان، اعضاء اور دل سے تعریف کرنے کو شکر کہا جاتا ہے۔ شکر ادا کرنے کے تین طریقے ہیں:

(۱) شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا (۲) شکر لسانی یعنی زبان سے منعم حقیقی کی تعریف کرنا (۳) شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق اعضاء سے نعمت کا بدلہ چکانا

شکر کے انسانی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارا نصف دین شکر ہے۔

حکیم اور دانا انسان ہی اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے بلکہ حکمت کے مقاصد میں شکر ادا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہی چاہتے ہیں کہ وہ اس کا شکر ادا کر کے دنیاوی اور اخروی فوائد حاصل کریں۔ اس کی فرماں برداری کر کے اس کے سخت قسم کے عذابوں سے بچیں۔ اللہ رب العزت سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اپنا شکر گزار بندہ بنائے۔

---

(۳) پروفیسر ڈاکٹر ملک غلام حیدر، مشعل اسلامیات (میانوالی: اسلامی کتب خانہ، ۱۹۹۸ء) ص: ۴۲

۸۔ بر اور تقوی میں تعاون

اللہ رب العزت، اہل ایمان کو نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیا ہے۔لیکن اس حکم کی تفسیر سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم براور تقوی کا مفہوم معلوم کریں۔ یہ مفہوم مفسرین نے بڑی عمدگی اور تفصیل کے ساتھ اپنی تفاسیر میں بیان کیا ہے۔ براور تقوی کا مفہوم حاصل کرنے کے بعد ہم ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے اہل ہوں گے۔ دینی لحاظ سے بھی نیکی اور برائی کا مفہوم جاننا ضروری ہے۔

''بر'' کا مفہوم :

بر عام طور پر نیکی کو کہا جاتا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی ''**بر**'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''**بر**'' کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں ۔بنیادی اور حقیقی بھی ۔مثلا خدا کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی ۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول وقرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں ۔اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے ۔اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کی ضد ہے۔ براور بار اس صفت کے صیغے استعمال ہیں مثلا کہیں گے **بر بوالده** وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔**بر بالقسم** کے معنی ہیں میں نے اپنی قسم پوری کی۔''(۱)

قرآن مجید میں حضرت یحیٰی علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے:

وَكَانَ تَقِيًّاo وَّبَرًّابِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارً ا عَصِيًّا (مریم ۱۹:۱۳،۱۴)

وہ پرہیز گار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مَمَّا تُحِبُّونَ (ال عمران ۳:۹۲)

تم خدا کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔

اللہ تعالی کی تعریف میں ہے:

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (طور ۵۲:۲۸)

بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا مہربان ہے۔ نیز فرمایا

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''بر'' کا لفظ نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے۔مخصوص مفہوم میں یہ حقوق وفرائض کو پورا کرنے کے لیے آتا ہے۔اسلام کے عملی احکام بر کے اندر شامل کیے جاتے ہیں ۔ جو سورہ بقرہ کے نصف سے لے کر خاتمہ تک بیان کیے گئے ہیں ۔ پہلے اصول بر یعنی ایمانیات اور مکارم اخلاق کو بیان فرمایا۔ان کے بعد فروع بر کو بیان فرمایا۔تحویل قبلہ کے وقت نیکی کے مفہوم کو اجاگر کیا گیا کہ نیکی مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے کا نام نہیں ۔ بلکہ اصل نیکی اللہ کی طرف اپنے دلوں کو پھیرنا اور اس کی رضا واطاعت کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا ہے ۔نماز اللہ کی رضا کے لیے ادا کرنی

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱، ص:۱۸۷، ۱۸۸

ہے لہذا وہ جس طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے گا ہم اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں گے۔ اسی طرح نیکی یہ ہے کہ اپنی محبوب چیز کو بھی اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کر دو۔ حقوق اللہ میں بر یہ ہے کہ نماز قائم کرے اور اپنے تمام اعضاء سے اللہ کی بندگی کا حق ادا کرے اور واجبی صدقات کے ذریعے مال میں سے اللہ کا حق ادا کرے۔ حقوق العباد یا اخلاق واعمال میں بر کا مفہوم یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مہمانوں، مقروضوں پر مال خرچ کرے۔ اس کے علاوہ مسلمان غلاموں اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے لیے مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرے۔

''تقوی'' کا مفہوم:

مولانا امین احسن اصلاحی ''تقوی'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اتقاء کا لفظ قرآن مجید میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

ا۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلا

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْ مًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (المزمل ۷۳:۱۷)

اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔

۲۔ کسی امت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا۔ مثلا

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْامِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال ۸:۲۵)

اور اس وقت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنھوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا۔

۳۔ اس رب قدوس سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے' جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (الزمر ۳۹:۷۳)

اور جو لوگ اپنے پروردگار سے برابر ڈرتے رہے ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

۴۔ اس کا چوتھا مفہوم مذکورہ تینوں مفاہیم کا جامع ہے یعنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا۔ جب یہ لفظ مفعول کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو عموماً یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی چیز کو تقوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (ال عمران ۳:۱۷۹)

اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقوی اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہوگا۔

اس تشریح کی روشنی میں متقی وہ شخص ہوگا جس کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کے غضب کا خوف سمایا ہوا ہو اور جس کو گناہوں کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو۔

تقوی میں عمل کی نسبت کیفیت اور حال کا پہلو اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو اگرچہ زیادہ نمایاں ہے اور اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں نفی اثبات پر غالب ہے لیکن چونکہ یہ دل کی تندرستی کی دلیل ہے اور دل تندرست ہو تو سب کچھ تندرست ہے اس وجہ سے اس سے علم اور عمل دونوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ (۲)

تقوی کا لغوی معنی ڈرنا اور بچنا کے ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ تعالی سے ڈرنا اور گناہوں سے بچنے کا نام تقوی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے کانٹے دار

---

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱، ص:۸۸، ۸۹

جھاڑیوں کی طرح گناہوں سے بچنے کوتقوی قرار دیا۔اسلامی شریعت میں حدود اللہ کا احترام اوران کی خلاف ورزی سے ڈرنا تقوی کہلاتا ہے۔
پیر محمد کرم شاہ الازہری ''تقوی'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تقوی کے لغوی معنی ہیں:

جعل النفس فی وقایة مما یخاف

نفس کو ہر ایسی چیز سے محفوظ کرنا جس سے نقصان کا اندیشہ ہو۔

عرف شرع میں تقوی کہتے ہیں:

ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانا اس کے درجے مختلف ہیں۔

میرے نزدیک اس کی سب سے موثر تعبیر یہ ہے:

التقوی ان لا یراك الله حیث نهاك ولا یفقدك حیث امرك۔

یعنی تیرا رب تجھے وہاں نہ دیکھے جہاں جانے سے اس نے تجھے روکا ہے اور اس مقام
سے تجھے غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونے کا اس نے تجھے حکم دیا ہے۔(۳)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی تقوی کا مفہوم اور مراتب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لغت میں تقوی کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں۔اصطلاح شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقوی کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے نقصان پہنچانے والی ہوں۔خواہ ان کا تعلق عقائد واخلاق سے ہو یا اقوال،اعمال اور احوال سے ہو۔''

پہلا مرتبہ:

یہ ہے کہ کفر سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو اور اپنے آپ کو ہمیشہ کے عذاب کے نقصان سے بچالے۔درج ذیل آیت میں تقوی کے یہی معنی مراد ہیں۔

وَاَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ ا لتَقْوٰی(الفتح ۴۸:۲۶)

دوسرا مرتبہ:

یہ ہے کہ نفس کو کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کے نقصان سے محفوظ رکھے۔جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَلَو اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوا وَاتَّقُوْا۔(الاعراف ۷:۹۶)

اہل شریعت کی اصطلاح میں جب تقوی کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور کسی نے خوب کہا ہے:

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِیْرَهَا ۔۔۔ و کَبِیْرَهَاذَاكَ التُّقٰی

چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے یہی تقوی ہے

وَاصْنَعْ کَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ۔۔۔ ضِ الشَّوك یحذرُ مَایَرٰی

---

(۳) پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن (لاہور: ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۴۰۲ھ) ج:۱،ص:۳۰

خدا کی راہ میں اس طرح چل جس طرح کہ خاردار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر چلتا ہے

لَا تَحۡقِرَنَّ صَغِیۡرَةً　　　　　اِنَّ الجِبَالَ مِنَ الۡحَصٰی

چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے پہاڑ بنتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ سے تقوی کی حقیقت دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ کبھی کسی پرخار راستہ سے بھی گزرے ہیں فرمایا کیوں نہیں۔ابی بن کعبؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین یہی تقوی ہے۔یعنی حق جل وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقوی ہے۔اسی لیے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَاللهِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرٰت۴۹:۱۳)

یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔

تیسرا مرتبہ:

یہ ہے کہ قلب کو ہر اس چیز سے محفوظ کر لیا جائے جو خدا تعالی سے غافل کرتی ہو۔اور یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیاوی ذلت و ندامت سے ڈر کر معصیت کو چھوڑا تو وہ تقوی نہیں،خدا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑنے کا نام تقوی ہے۔اس آیت میں تقوی کا یہی مرتبہ مراد ہے۔

یاَاَیُّهَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اتَّقُواالله َحقَّ تُقَاتِهٖ (ال عمران ۳:۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

خدا کا خوف ہی ہدایت کا مبداء اور ہر قسم کے فوز وفلاح کا سرچشمہ ہے۔اسی لیے حضرت نوح،حضرت ہود،حضرت صالح،حضرت لوط اور حضرت شعیب **علیهم الصلٰوة والسلام** نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی نصیحت فرمائی: **اَلَا تَتَّقُوۡنَ** کیا تم کو خدا کا خوف نہیں۔اور **فَـاتَّقُوااللّٰه وَاَطِیۡعُوۡنِ (ال عمران۳:۵۰)** اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔جیسے ارشاد الٰہی ہے: **سَیَـذَّکَّـرُمَـنۡ یّخۡشٰی (الاعلی ۸۷:۱۰)** یعنی نصیحت وہی قبول کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہوگا۔

اللہ تعالی نے دوسرے موقع پر **هدی للمتقین** کی بجائے،**هدی للناس** ارشاد فرمایا۔جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ درحقیقت انسان نہیں۔انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے ڈرے۔جو اپنے رب سے نہیں ڈرتا وہ جانور یا جانور سے بھی بدتر ہے۔ارشاد الٰہی:

اولٰئِك کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ (الاعراف:۱۷۹)

سفر آخرت کے لیے تقوی ہی کا توشہ اور تقوی ہی کا لباس کارآمد ہوسکتا ہے۔کما قال تعالی

وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَیۡرَالزَّادِالتَّقۡوٰی (البقرہ۲:۱۹۷)

سفر کے لیے توشہ لے لو پس تحقیق سب سے بہتر توشہ تقوی ہے۔

جس طرح بغیر ارادہ کے مسافر کا دنیاوی سفر ناممکن ہے اسی طرح بغیر تقوی کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے اور جس طرح

ایک معمولی راستہ سے برہنہ گزرنا شرم وحیا کے خلاف ہے۔اسی طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جوایک لمحہ کے لیے بھی بے شمارفرشتوں سے خالی نہیں رہتی لباس تقوی کے بغیر گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی ہے۔(۴)

تعاون علی البر والتقوی:

اللہ رب العزت نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرنے سے متعلق ایک طویل آیت میں حکم دیتے ہیں:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (مائدہ ۵:۲)

اورتعاون کرو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو حق تلفی اور زیادتی کے کاموں میں

قرآن عظیم نے اس مقام پر ایک بنیادی مسئلہ سے متعلق حکیمانہ فیصلہ سنایا ہے۔اس فیصلہ پر انسانی زندگی کی بقا اور کامیابی کا انحصار ہے۔یہ بنیادی مسئلہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مدد کرنے سے متعلق ہے۔انصار نے مہاجرین کے ساتھ تعاون کر کے ایثار کی تاریخ رقم کی۔مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اس نقطے پر کافی تفصیل سے لکھا ہے۔
مولانا محمد ادریس کاندھلوی براور تقوی میں تعاون کرنے پر لکھتے ہیں:

''نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی یعنی ظلم وستم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو بلکہ اس کے برعکس نیکی اور پرہیزگاری کی ترغیب دو۔پہلی آیت میں دشمنی کا دستور العمل تھا کہ دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے اوراس آیت میں دشمنی کا دستور العمل ہے کہ دوستی میں کسی کی بے جا حمایت نہ کرو جیسے آج کل پارٹیوں میں ہوتا ہے بلکہ براور تقوی میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالی اپنے نافرمانوں کو سخت عذاب دینے والا ہے لہذا تم کو چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کروتا کہ تم کو اللہ کے فضل اور رضوان سے حصہ ملے اور سخت عذاب سے محفوظ رہو۔بریعنی نیکی سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور تقوی سے اللہ خوش ہوتا ہے۔جس نے دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کرلیا اس نے سعادت مکمل کرلی۔بر(نیکی) فعل خیرات کا نام ہے تقوی اور پرہیزگاری ترک منکرات کا نام ہے جس میں یہ دونوں خصلتیں جمع ہوجائیں اس کی خوش نصیبی کا کیا پوچھنا۔''(۵)

اللہ تعالی نے یہ نہیں ارشادفرمایا کہ مسلمانوں کی مدد کرو اور غیر مسلموں کی مدد نہ کرو۔کیونکہ مسلمانوں کے درمیان تعاون وتناصر کی اصل بنیاد نیکی اور پرہیزگاری ہے۔اس سے واضح ہے کہ مسلمان اگر گناہ اور ظلم وزیادتی پر چل رہا ہے تو اس کی مدد نہ کرو۔اگر کسی مسلمان کو ظلم وزیادتی کرتے ہوئے دیکھیں تو اسے ظلم اور زیادتی سے روکنے کی کوشش کی جائے۔دنیاوآخرت کے عذابوں اور تباہ کاریوں سے بچانا ایک مسلمان بھائی کی صحیح مدد کرنا ہے۔اس آیت سے مراد یہی ہے کہ نیکی کے کام کرنے اور گناہوں کو چھوڑنے پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔اسلام نے اسی پر مسلم قومیت کی عمارت کو تعمیر کیا ہے۔کسی دوسرے کو نیکی کی ترغیب دینے والے کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا نیکی کرنے والے کو ملتا ہے۔اس تعلیم نے امت مسلمہ کے ہر فرد کو نیکی،انصاف اور اچھے اخلاق کا مبلغ بنادیا ہے۔خوف خدا نے انسانوں کو جرائم سے روک دیا ہے۔ناجائز معاملات میں اپنی قوم کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ایسا کرنا تباہ ہونیوالے کے ساتھ تباہ ہونا ہے۔

---

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۴۴-۴۶

(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۴۲۹

۹۔غض بصر

غض بصر سے مراد ہے نگاہوں کا پست رکھنا۔نظر انسان کو زنا کے قریب کر دینے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔اس لیے نظر کو پست کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اللہ رب العزت قرآن مجید میں غض بصر یعنی نگاہوں کو پست رکھنے سے متعلق حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (النور ۲۴:۳۰)

مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہی ان کے لیے پاکیزہ ترین طریقہ ہے وہ جو کاروائیاں کرتے ہیں اللہ ان سب سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں سید ابوالاعلی مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''اصل میں الفاظ ہیں: **يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِم**۔غض کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے ،گھٹانے اور پست کرنے کے ہیں ۔غض بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہ نیچی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے۔لیکن دراصل اس حکم کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا اور نگاہوں کے دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔یہ مفہوم ''نظر بچانے'' سے ٹھیک ادا ہوتا ہے،یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو،اس سے نظر ہٹالی جائے،قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچی کرے یا کسی اور طرف اسے بچالے جائے۔**من ابصارهم** میں من تبعیض کے لیے ہے،یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔بالفاظ دیگر اللہ تعالی کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے ، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔اب یہ بات سیاق وسباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے ،وہ ہے مردوں کا عورتوں کو دیکھنا یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا ،یا فحش مناظر پر نگاہ جمانا۔''(۱)

شریعت اسلامی میں ایک مومن کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے علاوہ کسی عورت کو آنکھ بھر کر دیکھے۔پہلی مرتبہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے۔لیکن پہلی نظر میں کشش محسوس ہونے پر دوبارہ دیکھنے کی معافی نہیں ہے۔نبی مکرم ﷺ نے اس طرح دیکھنے کو آنکھ کا زنا قرار دیا ہے۔آپ ؐ کا ارشاد ہے:

''آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے۔لگاوٹ کی بات چیت زبان کا زنا ہے۔آواز سے لذت لینا کانوں کا زنا ہے۔ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کا زنا ہے۔بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہو چکتی ہیں تب شرم گاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں،یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں۔''(۲)

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا:

---

(۱)مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۳،ص:۳۸۰

(۲)صحیح مسلم ،کتاب القدر،باب قدر علی ابن اٰدم حظه من الزنا وغیره ،رقم :۲۶۵۷

یـا علـی لا تتبع الـنـظـرـة الـنـظـرة فـان لك الاولی ولیسـت لك الاٰخـرة

اے علی !ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری معاف نہیں ۔(۳)

عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

ان الـنـظـر سهـم مـن سهـام ابـلیس مسموم ،من ترکها مخافتی ابدلته ایمانا یجد حلاوته فی قلبه

نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا، میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔(۴)

ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

ما من مسلم ینظر الی محاسن امراة اول مرة ثم یغض بصره الا احدث الله له عبادة یجد حلاوتها

جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔(۵)

حجۃ الوادع کے موقع پر مشعر حرام سے واپسی کے وقت فضل بن عباسؓ نے گزرنے والی عورتوں کی طرف دیکھا تو آپؐ نے ان کے چہرے پر ہاتھ رکھ کے دوسری طرف پھیر دیا۔اس سے ایک غلط فہمی یہ ہوسکتی ہے کہ آغاز اسلام میں عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں تو مومن مردوں کو نگاہیں پست رکھنے کا حکم دیا گیا۔اگر چہرے کے پردے کا حکم ہو چکا ہوتا تو نگاہیں پست رکھنے اور نہ رکھنے کا کیا سوال؟

یہ استدلال عقل اور واقعے کے اعتبار سے غلط ہے۔عقل کے اعتبار سے اس لیے غلط ہے کہ چہرے کے پردے کا حکم آجانے کے بعد بھی بعض اوقات ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ کسی مرد کا اچانک کسی نامحرم عورت سے سامنا ہو جاتا ہے۔اور عورت نے چہرہ چھپایا ہوا نہیں ہوتا۔اسی طرح مسلم معاشرے میں غیر مسلم عورتیں بھی پردہ نہیں کریں گی۔لہذا آنکھیں بچانے کا حکم صرف اس صورت میں ضروری نہیں ہے جب عورتیں پردہ نہ کریں۔عورتیں پردہ کریں یا نہ کریں ہمیں اپنی نگاہوں کو ان سے بچانا ہے۔واقعات کے اعتبار سے اس لیے غلط ہے کہ پردے کے احکام حجۃ الوداع سے قبل سورہ احزاب میں نازل ہو چکے تھے۔مسلمان خواتین چہرے کا پردہ کرتی تھیں۔

یہ واقعہ عہد نبوی میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔اس لیے کہ حالت احرام میں چہرے پر نقاب نہیں کیا جاتا۔تاہم محتاط خواتین ایسی حالت میں بھی غیر محرم مردوں کے سامنے چہرہ نہیں کھولتیں۔حج الوداع کے سفر میں محرم صحابیات کے قریب سے جب مسافر گزرتے تو وہ اپنے سر سے چادریں کھینچ کر چہرہ چھپا لیتیں۔جب مسافر گزر جاتے تو وہ اپنے چہرے کھول لیتیں۔اس لیے فضل بن عباسؓ نے جن عورتوں کو دیکھا ہوگا وہ پردہ کی حالت میں ہی ہوں گی۔

کسی غیر محرم کو دیکھ کر چہرہ چھپانے کا ذکر واقعہ افک میں بھی موجود ہے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سوگئی۔صفوان بن معطل سلمی لشکر کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔انہوں نے

---

(۳)مرقاه المفاتیح شرح مشکاة المصابیح ،کتاب النکاح ،باب النظر ،رقم : ۳۱۱۰

(۴)المعجم الکبیر للطبرانی ،باب التاء ،الاختلاف عن الاعمش فی حدیث عبدالله ،رقم :۱۰۲۱۵

(۵)ذم الهوی لابن جوزی،کتاب ذم الهوی ،الباب الثامن عشر ،فی ذکر ثواب من غض بصره عن الحرام،رقم :۳۰۵

ایک سوئے ہوئے انسان کا سایہ دیکھا۔

فَعَرَفَنِی حِیْنَ رَآنِی وَكَانَ رَآنِی قَبْلَ الْحِجَابِ فَاسْتَیْقَظْتُ بِاسْتِرْجَاعِهِ حِیْنَ عَرَفَنِی فَخَمَّرْتُ وَجْهِیْ بِجِلْبَابِی

وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ پردے کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا ۔مجھے پہچان کر جب اس نے **انا لله و انا الیه راجعون** پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔(۲)

غض بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔مثال کے طور پر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب ہے۔اسی سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ ضرورت سے دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔مثلا جرائم کی تفتیش کے سلسلہ میں کسی مشکوک عورت کو دیکھنا یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

غرض یہ حکم مرد اور عورت کا ایک دوسرے کو دیکھنے سے متعلق ہے۔اس حکم پر عمل کر کے نگاہ اور عفت کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔اس سے پہلے والی آیات میں زنا اور زنا کی تہمت لگانے کی سزا اور احکام بیان ہوئے۔کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے سے منع کیا گیا۔ان آیات میں اسباب زنا کی ممانعت کا بیان ہے۔ان احکامات پر عمل کرنے سے انسان زنا سے محفوظ رہ سکتا ہے۔اس کے علاوہ لوگوں کی تہمتوں اور شکوک وشبہات سے محفوظ رہے گا۔اسی لیے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کو دیکھنے جیسے عظیم فتنے سے منع کیا گیا۔کیونکہ کسی کا چہرہ دیکھنے سے اس کی خوبصورتی معلوم ہوتی ہے۔جس سے طبیعت میں اس کی طرف رغبت اور نفس کو اس کی طرف کشش معلوم ہوتی ہے۔یہی کشش نفس کو زنا کے لیے کوشش کرنے پر تیار کرتی ہے۔

جن چیزوں کا دیکھنا حرام ہے ان کی طرف بالکل نہ دیکھیں۔جن چیزوں کو شہوت کے ساتھ دیکھنا جائز نہیں تو ان کو شہوت کی نظر سے نہ دیکھیں ۔ناجائز نگاہ سے دیکھنا زنا کا آغاز ہے۔اگر اتفاقی نگاہ پڑ جائے تو اس نگاہ کو دوسری طرف پھیر لیں۔غیر محرم عورت کی طرف بری نیت سے دیکھنا حرام ہے ۔بری نیت کے بغیر کسی نیت کے دیکھنا مکروہ ہے۔علاج معالجے کے علاوہ کسی مرد یا عورت کی شرعی ستر کو دیکھنا حرام ہے۔اسی طرح کسی کے گھر میں راز معلوم کرنے کے لیے جھانکنا شریعت اسلامی میں ممنوع اور ناجائز ہے۔اسی سے اکثر علماء نے بغیر داڑھی والے کم عمر لڑکے کی طرف بری نیت اور خواہش نفس کے ساتھ دیکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے کے درجات ہیں۔بعض صورتوں میں غیر محرم عورت کو دیکھنا معاف ہے ،بعض صورتوں میں جائز اور بعض صورتوں میں حرام ہے۔

اللہ رب العزت سورہ نور کی ایک طویل آیت کی ابتدا میں مومن عورتوں کو غض بصر کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَقُلْ لِّلْمُؤمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور ۳۱:۲۴)

اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

عورتوں کے لیے بھی غض بصر کے احکام وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں ،یعنی انہیں قصدا غیر مردوں کو نہ دیکھنا چاہیے ،نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے اور دوسروں کے ستر دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مرد کو دیکھنے کے معاملے میں احکام تھوڑے مختلف ہیں۔

---

(۲)صحیح بخاری ،کتاب المغازی ،باب حدیث الافك

ا یک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ

حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ نبی ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابن ام مکتومؓ آ گئے ۔ نبی ﷺ نے دونوں بیویوں سے فرمایا: ان سے پردہ کرو۔ بیویوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ ہمیں پہچانیں گے ۔فرمایا: کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتیں؟ حضرت ام سلمہؓ تصریح کرتی ہیں کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آ چکا تھا۔(۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نابینا صحابی سے بھی پردہ واجب ہے اگرچہ کسی فتنے کا خوف نہ ہو۔ خاص کر اس وقت جب شوہر بھی گھر میں موجود ہو۔
دوسری طرف ہمیں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ملتی ہے کہ

7ھ میں حبشیوں کا وفد مدینہ آیا اور اس نے مسجد نبوی کے احاطے میں
ایک تماشا کیا۔ نبی ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا۔(۸)

تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ

فاطمہؓ بنت قیس کو جب ان کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدت کہاں گزاریں۔ پہلے حضورؐ نے فرمایا: ام شریک انصاریہ کے ہاں رہو۔ پھر فرمایا: ان کے ہاں میرے صحابہ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مالدار اور فیاض خاتون تھیں، بکثرت لوگ ان کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں) لہٰذا تم ابن ام مکتوم کے ہاں رہو وہ اندھے آدمی ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکو گی (۹)

مردوں کو نگاہ نیچے رکھنے کا حکم پہلے دیا اور شرم و حیا زیادہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو بعد میں حکم دیا۔ ان روایات سے یہ حاصل ہوا کہ جتنی سختی سے عورتوں کو دیکھنے سے مردوں کا منع کیا گیا ہے اتنی سختی سے مردوں کو دیکھنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا گیا ہے۔ ایک محفل میں مرد اور عورت کا آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے سے روکا گیا ہے۔ پیدل چلتے ہوئے یا سفر میں مردوں کو دیکھنے سے منع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح شرعی طور پر جائز کھیل کا تماشہ دیکھتے ہوئے مردوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی ضرورت کے پیش نظر بھی دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تاہم عورتوں کے لیے اطمینان سے گھورنا اور ان کی خوبصورتی سے آنکھیں ٹھنڈی کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ان روایات سے امام غزالیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی تقریباً یہی مفہوم اخذ کیا ہے۔ ابن حجرؒ کا قول ہے:

''جواز کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں، اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مرد ان کو نہ دیکھیں، مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تا کہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے۔''(۱۰)

---

(۷)سنن الترمذی ،کتاب الادب ،باب ما جاء فی احتجاب النساء من الرجال ،رقم :۲۷۷۸

(۸)صحیح البخاری ،کتاب النکاح ،باب نظر المرأة الی الحبش و نحوهم من غیر ریبة ،رقم :۴۹۳۸

(۹)سنن ابی داؤد،کتاب اللباس ،باب فی قوله عز وجل وقل للمومنات یغضضن من ابصارهن ،رقم :۴۱۱۲

(۱۰)مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص ۳۸۳، ۳۸۴

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''عورتوں کا کسی غیر محرم مرد کو دیکھنا حرام ہے۔ بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لیے مطلقا حرام ہے۔خواہ شہوت اور بری نیت سے دیکھے یا کسی نیت وشہوت کے بغیر دیکھے، دونوں صورتیں حرام ہیں۔اس پر حضرت ام سلمہؓ کی (نابینے کو دیکھنے والی) حدیث سے استدلال کیا گیا ہے۔بعض فقہا نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لیے مضائقہ نہیں۔ان کا استدلال حضرت عائشہؓ صدیقہ کی اس حدیث سے ہے جس میں حبشیوں کے کھیل کا ذکر ہے۔اور اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نظر شہوت تو حرام ہے بلا شہوت نظر کرنا بھی خلاف اولی ہے۔ایک عورت کا دوسری عورت کے مواضع ستر کو بغیر خاص ضرورتوں کے دیکھنا یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے۔۔۔مواضع ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورت کا سارا جسم سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے چھپانا فرض ہے۔نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجہ اولی حرام ہے اور آیت مذکورہ کے حکم غض بصر کے خلاف ہے کیونکہ آیت کا مطلب جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں ہر ایسی چیز سے نظر پست رکھنا اور ہٹا لینا مراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرعا ممنوع کیا گیا ہے اس میں عورت کے لیے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔''(۱۱)

غرض ان آیات میں خواتین کو نگاہیں نیچی رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کے علاوہ کچھ دوسرے احکامات کا اضافہ کیا گیا ہے۔مومن عورتوں کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کے تحفظ کے لیے مردوں کا نگاہوں کو پست کرنا کافی نہ سمجھیں۔بلکہ وہ اپنی نگاہوں کو غیر محرم مردوں کو دیکھنے سے بچائیں۔اللہ رب العزت نے جس چیز کی طرف ان کا دیکھنا حرام کر دیا ہے اس کی طرف نظریں اٹھا کر نہ دیکھیں۔نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔کسی غیر محرم مرد کی طرف دیکھنا شیطان کا زہریلا تیر ہے۔شیطان کہتا ہے کہ وہ جو تیر عورت کے ذریعے چلاتا ہے وہ کبھی خطا نہیں جاتا۔سلف صالحین کا قول ہے کہ بری نگاہ زنا کا ڈاکیہ اور گناہ ونافرمانی کا پیغام لانے والی ہے۔اللہ تعالی نے مومن مردوں اور عورتوں کو اس فتنے سے بچنے کے لیے یہ احکامات دیے ہیں۔اس سے اسباب زنا کا تدارک ہو سکے گا اور ایک مومن لوگوں کی تہمتوں اور شکوک وشبہات سے بچ سکے گا۔

---

(۱۱) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۶ ص:۳۹۸-۴۰۱

۱۰۔حفاظت فروج

حفاظت فروج سے مراد شرم گاہوں کی حفاظت ہے۔ اسباب زنا کے تدارک کے لیے یہ اہم حکم ہے جو سورہ نور کی درج بالا ۳۰ اور ۳۱ نمبر آیت میں دیا گیا ہے۔ اس میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں زنا اور لواطت سے بچنا اور کسی مرد یا عورت کے ستر کو بغیر کسی شرعی عذر کے دیکھنے، دکھانے سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں تصریح موجود ہے کہ مرد کے لیے ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے ۔اس حصہ کو اپنی بیوی کے علاوہ کسی شرعی عذر کے بغیر کسی اور کے سامنے کھولنا حرام ہے۔ عورت کا سارا جسم سوائے ہتھیلیوں اور پاؤں کے ستر میں داخل ہے ۔تنہائی میں اپنے اوپر ستر کھولنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے:

ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ فاستحیوھم واکرموھم
خبردار! کبھی ننگے نہ رہو، کیونکہ تمہارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے) سوائے اس وقت کے جب تم رفع حاجت کرتے ہو، یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو لہذا ان سے شرم کرو اور ان کے احترام کا لحاظ رکھو۔(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

احفظ عورتك الا من زوجتك او ملكت يمينك اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سواہر ایک سے محفوظ رکھو۔ سائل نے پوچھا اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا: **فالله تبارك وتعالى احق ان يستحيامنه**، اللہ تبارک وتعالی اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔(۲)

اس حکم سے یہی مراد ہے کہ اپنی شرمگاہ کو کسی ناجائز فعل میں استعمال نہ کریں۔ اس میں زنا اور لواطت وغیرہ اور ان سے تعلق رکھنے والے تمام افعال شامل ہیں۔ حفاظت فروج کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہر وقت اپنی شرمگاہوں کو چھپا کر رکھیں۔ نیز تنہائی میں بھی اپنی شرمگاہ کی طرف دیکھنا ممنوع ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ **یحفظوا فروجھم** کے تحت لکھتے ہیں:

شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی تمام ناجائز صورتوں سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں ۔اس میں زنا، لواطت، دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہو جائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز وحرام چیزیں داخل ہیں۔ اس آیت کا مقصد ناجائز وحرام شہوت رانی اور اس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے۔ جن میں سے اول وآخر کو وضاحت سے بیان فرما دیا۔ فتنہ شہوت کا سب سے پہلا سبب دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے۔ ان دونوں کو وضاحت سے ذکر کر کے حرام کر دیا گیا۔ ان کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سننا، ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آ گئے۔(۳)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی الاستتار عند الجماع، رقم: ۲۸۰۰

(۲) سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی حفظ العورۃ، رقم: ۲۷۶۹

(۳) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۶، ص:۳۹۹

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''عورتوں کے ستر کے حدود مردوں سے مختلف ہیں۔ نیز عورت کا ستر مردوں کے لیے الگ ہے عورتوں کے لیے الگ۔ مردوں کے لیے عورت کا ستر ہاتھ اور منہ کے سوا اس کا پورا جسم ہے۔ جسے شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد حتیٰ کہ باپ اور بھائی کے سامنے بھی نہیں کھلنا چاہیے اور عورت کو ایسا باریک یا چست لباس بھی نہ پہننا چاہیے جس سے بدن اندر سے جھلکے یا بدن کی ساخت نمایاں ہو۔ عورت کے لیے عورت کے ستر کی حدود وہی ہیں جو مرد کے لیے مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور گھٹنے کا درمیان کا حصہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برہنہ رہے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کا درمیان کا حصہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصوں کا ڈھانکنا فرض نہیں ہے۔'' (۴)

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ان کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ حضورؐ نے فوراً منہ پھیر لیا اور فرمایا:

یا اسماء ان المرأة اذا بلغت المحیض لم یصلح لها
ان یریٰ منها الا هذا و هذا واشار الی وجهه و کفیه

اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا
اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے۔ (۵)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''ایمان والیوں کو چاہیے کہ اپنی شرمگاہوں کی پوری پوری حفاظت کریں کہ کوئی ان کو دیکھ نہ سکے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنی خلوت اور اپنی تنہائی میں بے ضرورت اپنی شرمگاہ کو نہ دیکھیں۔ میاں بیوی کو اگر چہ باہم صحبت اور مباشرت کی اجازت ہے مگر بلاضرورت ایک دوسرے کی شرمگاہ کی طرف نظر کرنے کی اجازت نہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شرمگاہ کی طرف دیکھنے سے نگاہ کمزور ہوتی ہے جیسا کہ یہ مضمون ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔'' (۶)

نبی مکرم حضرت محمد ﷺ نے اس شخص کو جنت کی ضمانت دی جو زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ (۷)
غرض اسلام حیاء کا علمبردار ہے۔ اس لیے وہ اپنے پیروکاروں کو نظروں اور شرمگاہوں کی حفاظت کا درس دیتا ہے۔ شرمگاہ کی حفاظت سے مراد زنا، لواطت اور ان سے متعلق افعال سے مکمل اجتناب کرنا ہے۔ اس کے ساتھ اپنی ستر کی بھی مکمل حفاظت کرنی ہے۔ یہ کامیاب مومنوں اور جنت کے وارثوں کی صفات میں سے ہے۔

---

(۴) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳،ص:۳۸۴، ۳۸۵

(۵) **سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فیما تبدی المراة من زینتها، رقم: ۴۱۰۴**

(۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۵،ص:۴۱۹

(۷) **صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم: ۶۱۰۹**

۱۱۔خوش کلامی

خوش کلامی سے مراد لوگوں کے ساتھ اچھے طریقے سے کلام کرنے کے ہیں۔اسلام اپنے پیروکاروں کو بلاتفریق مذہب اور قوم تمام انسانوں کے ساتھ اچھے طریقے سے بات کرنے کا حکم دیتا ہے۔اللہ رب العزت قرآن عظیم میں خوش کلامی سے متعلق حکم دیتے ہوئے ارشادفرماتے ہیں:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲:۸۳)

اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہوتو) اچھی طرح (خوش خلقی) سے کہنا۔(۱)

مفتی محمد شفیعؒ آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> **وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا** سے مراد **قولا ذا حسن** ہے۔اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرے تو بات نرم کرے،خوش روئی اور کشادہ دلی سے کرے۔چاہے مخاطب نیک ہو یا بد سنی ہو یا بدعتی ، ہاں دین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے۔وجہ یہ ہے کہ حق تعالی نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ **قولا لہ قولا لینا** تو آج جو کلام کرنے والا ہے، وہ حضرت موسیٰؑ سے افضل نہیں اور مخاطب کتنا ہی برا ہو فرعون سے زیادہ برا اور خبیث نہیں۔
>
> طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام تفسیر و حدیث عطاؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں،مگر میرے مزاج میں تیزی ہے میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں۔حضرت عطاء نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو کیونکہ حق تعالی کا حکم ہے **وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا**،اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں،مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا۔*(۲)

یہ آیت ان احکامات میں سے جو اسلام اور سابقہ شرائع میں مشترک ہیں۔ان میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ شامل ہیں۔تمام انسانوں کے ساتھ خواہ وہ مومن ہوں یا کافر اچھی طرح اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔حسن خلق اور مدارت میں کسی کو خاص نہیں کیا گیا کہ مسلمان کے ساتھ تو اچھے طریقے سے بات کرو اور کافر کے ساتھ اچھے طریقے سے بات نہ کرو۔عام طور پر مالی احسان قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ قولی احسان ہر انسان کے ساتھ ممکن ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا ایک تو ظاہری الفاظ سے اخذ کیا گیا عام مفہوم ہے۔اس مفہوم میں تعلیم اور دعوت کے ہر موقع پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی اچھائی اور نصیحت کی ہر بات شامل ہے۔تاویل کرنے والوں نے اسے عام ہی رکھا ہے۔لیکن بالکل یہی بات اسی محل وقوع میں الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ قرآن عظیم کی مختلف آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ان تمام ارشادات پر غور و فکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس محل وقوع میں یہ الفاظ بیان ہوئے ہیں ان کا ایک خاص مفہوم بھی ہے۔اس خاص مفہوم سے تفسیر کے طالب علم کو باخبر ہونا چاہیے۔یہاں ہم تمام مترادف آیات کو بیان کر کے اس خاص مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۹ھ) ج:۱،ص:۵۱

* مفتی محمد شفیعؒ نے یہ بات تفسیر قرطبی کے حوالے سے لکھی ہے۔

(۲) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۱،ص:۲۵۴

یتیموں کے ساتھ معروف طریقے سے بات کرنے سے متعلق ارشاد ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (النسآء ۴:۵)

اور تم ناسمجھ یتیموں کے حوالہ اپنے وہ مال نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے معاشی قیام وبقا کا وسیلہ بنایا ہے۔ البتہ تم اس مال سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ اور معروف طریقہ پر ان کی دلداری کرتے رہو۔

اسی طرح سچی اور سیدھی بات کہنے سے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاO وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (النسآء ۴:۸،۹)

اور اگر تقسیم میراث کے وقت قرابت مند یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور معروف طریقہ پر ان سے دلداری کی بات کرو۔ اگر یہ اپنے پیچھے کمزور اولادیں چھوڑتے تو ان کے بارے میں ڈرتے تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔

اسی طرح دستور کے مطابق دلداری کا ایک کلمہ دل کو تکلیف پہنچانے والے صدقہ سے بہتر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ Oقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۶۲،۲۶۳)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے اس خرچ کے پیچھے اظہار احسان اور ایذا رسانی کی بلا نہیں لگا دیتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ نہ ان کے لیے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دستور کے مطابق دلداری کا ایک کلمہ اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری کی بلا لگی ہوئی ہو۔ اللہ بڑا بے نیاز اور حوصلے والا ہے۔

نرم بات کہنے سے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۸)

اگر تم کو اپنے رب کے کسی فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض ہی کرنا پڑے تو ان سے نہایت نرم بات کہو۔

ان تمام آیات قرآنیہ میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں **قولوا للنا س حسنا** کی طرح وہی بات کہی گئی ہے جو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں سے متعلق درج بالا آیات میں **وقولوا لهم قولا معروفا، وليقولوا قولا سديدا ، قول معروف** اور **قَوْلًا مَّيْسُوْرًا** کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے والدین، اقربا، یتامٰی اور مساکین سے متعلق ایک طرف حسن سلوک اور ادائے حقوق کی تاکید کی ہے دوسری طرف اس امر کی ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ بات شریفانہ انداز میں کی جائے۔ ان کے خلاف دل میں برہمی ہو تو اس کو ضبط کیا جائے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخلاق کے بغیر کوئی شخص ان کے حقوق و فرائض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات آدمی ان کی حالت کی کمزوری کی بنا پر ان کی عزت نفس ملحوظ رکھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے۔ جس سے ان کے مجروح دل اور زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات آدمی کے دل میں ان کے خلاف کوئی رنجش ہوتی ہے جو ان کو مجبور اور بے بس پا کر زیادہ کرخت انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حالات میں خود ان ضرورت مندوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ چیز بھی آدمی کے لیے ترش کلامی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے ان تمام چیزوں سے روک کر ان سے اچھے انداز میں بات کرنے کی ہدایت کی ہے اور تسلی و تسکین کے ایک کلمہ کو اس خیرات سے بھی بہتر قرار دیا ہے جس کے ساتھ تلخ کلامی، توہین اور دل آزاری شامل ہو۔ اسی بات کو یہاں **قولوا للناس حسنا** کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن سیاق کلام اور نظم دلیل ہے کہ مفہوم یہی ہے۔'' (۳)

غرض قرآن عظیم نے مسلم اور غیر مسلم کے فرق کے بغیر تمام انسانوں کے ساتھ اچھے طریقے سے بات کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اچھے انداز میں مجادلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے خاص مفہوم میں **قول معروف** ،یعنی دستور کے مطابق بات کرنا، **قول سدید** یعنی سیدھی اور سچی بات کرنا اور **قول میسور** یعنی نرم بات کرنا شامل ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہم دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں اور بزرگوں کے ساتھ اچھے انداز میں بات نہیں کرتے۔ ہمارے مذہب نے تو دوسروں کے ساتھ اچھے انداز میں بات کرنے کا حکم دیا ہے ۔ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اچھے انداز میں بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ تلوار کے زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ لڑائی جھگڑا بھی اچھے انداز میں کرنا چاہیے۔ مباحثہ اور مناظرہ ایسا ہو کہ اس میں گالیاں نہ دی جائیں۔ بیہودہ مذاق کے ذریعے کسی کو گھٹیا ثابت نہ کیا جائے۔ تہمت اور بہتان کے ذریعے کسی کو بدنام کرنا مقصد نہ ہو بلکہ دلیل کی قوت سے جواب دیا جائے۔ ہم تو اس نبی کی امت میں سے ہیں جس نے گالیاں سن کر دعائیں دی ہیں۔ اس لیے تمام انسانوں کے ساتھ ہمیں اچھے انداز اور خوبصورت طریقے سے بات کرنی چاہیے۔

---

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵

۱۲۔صلہ رحمی

صلہ رحمی سے مراد ہے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ تعلق جوڑنا۔صلہ رحمی کے متعلق اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَان وَاِیْتَائِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْن ۔(النحل ۱۶:۹۰)

بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا اور روکتا ہے بے حیائی اور نامعقول کام اور سرکشی سے،تم کو سمجھاتا ہے شاید تم یاد رکھو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے صلہ رحمی ہے۔جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار رہے۔بلکہ اس کا معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے،بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک محتاج ہوں۔وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے،پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ہر خاندان کے خوشحال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے،پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں یہی بات ہے جس کو نبی ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین،اس کے بیوی بچے،اور اس کے بہن بھائی ہیں،پھر وہ نو جوان جوان کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جوان کے بعد قریب تر ہوں۔اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں،اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا ______ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (Unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی،معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔(۱)

غرض صلہ رحمی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا نام ہے۔صلہ رحمی عدل اور احسان میں داخل ہے۔لیکن یہاں صلہ رحمی اور قریبی رشتہ دار کو اس کا حق دینے کو ایک مستقل نیکی قرار دیا گیا ہے۔اسی لیے اس کا علیحدہ ذکر فرمایا۔انسان پر دوسروں کی نسبت قریبی رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے۔رشتہ دار

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۲:ص:۵۶۵،۵۶۶

سے تعلق جوڑنے کو اللہ تعالی کے ساتھ تعلق جوڑنا قرار دیا گیا ہے جبکہ رشتہ دار سے تعلق توڑنے کو اللہ تعالی کے ساتھ تعلق توڑنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اسی لیے بعض صورتوں میں ضرورتمند قریبی رشتہ دار کو خرچ دینا واجب ہوتا ہے۔صلہ رحمی کی بعض صورتیں مستحب ہیں جیسے محبت و الفت قائم رکھنے کے لیے قریبی رشتہ دار کو ہدیہ یا تحفہ دینا۔۔رشتہ دار کے بیمار پڑنے پر اس کی عیادت کی جائے۔مالی مشکلات میں مدد کی جائے۔فوت ہونے پر جنازے میں شرکت کی جائے۔صدقات خیرات کے بھی سب سے زیادہ حقدار دوسروں کی نسبت اپنے قریبی رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔غرض کسی نہ کسی صورت میں رشتہ دار سے تعلق بنائے رکھا جائے اور اس کے حقوق ادا کیے جائیں۔اس کے دنیاوی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں جیسے رزق اور عمر کا بڑھنا۔چونکہ صلہ رحمی احسان کی ایک مکمل صورت ہے اس لیے اس کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرنا اور ان کی پیسوں سے مدد کرنا عظیم عبادت ہے۔

اللہ رب العزت قرآن مجید کی سورہ رعد میں اہل عقل کی تیسری صفت * یہ بیان فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَاللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ (رعد ۱۳:۲۱)

وہ لوگ جوان روابط کو برقرار رکھتے ہیں جنہیں برقرار رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

اہل عقل کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں جن سے تعلق جوڑنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے۔اس سے مراد یہی ہے کہ وہ صلہ رحمی کرتے ہیں۔اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔اس میں وہ تمام معاشرتی اور تمدنی روابط بھی شامل ہیں جن کے درست ہونے پر معاشرتی زندگی کی اصلاح اور کامیابی کا انحصار ہے۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶)

قریبی رشتہ داروں کو ان کا حق دو۔رشتہ داروں کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ رشتہ اور محبت قائم رکھے اور خوشحالی اور افلاس دونوں حالتوں میں اس کے ساتھ حسن معاشرت اور الفت برتے اگر انہیں مدد کی ضرورت ہو تو ان کی مدد کرے اور اگر وہ تنگ دست ہوں تو ان پر خرچ کرے اور محتاج اور مسافروں کو خیرات دے اور اگر محتاج اور مسافر رشتہ دار بھی ہو تو اس کے دینے میں دوہرا ثواب ہے۔

اہل تشیع کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس وقت پیغمبر خدا ﷺ نے جبرائیل امین سے پوچھا کہ میرے قریب کون ہیں اور ان کا حق کیا ہے؟ جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ قریب تمہارے فاطمہؓ ہے اور حق اس کا فدک ہے فدک اس کو دے دو رسول خدا ﷺ نے اسی وقت فاطمہؓ کو فدک دے دیا۔

یہ روایت موضوع، اہل تشیع کی بنائی گئی اور عقل و نقل کے خلاف ہے۔یہ بالکل غلط ہے کہ اس آیت میں ذاالقربی سے صرف حضرت فاطمہؓ اور اس کے حق سے فدک مراد ہے۔ذالقربیٰ ایک لفظ عام اور امر کلی ہے۔جس کے معنی قرابت والے کے ہیں۔جو حضور پرنورؐ کے تمام قرابتداروں کو شامل ہے۔لہذا اس لفظ عام یعنی ذالقربیٰ کو فقط حضرت فاطمہؓ تک محدود کر دینا کیسے صحیح ہوگا؟ جبکہ قرابت میں آپؐ کی باقی بیٹیاں اور دیگر قرابت دار بھی آتے ہیں۔تو کیا معاذ اللہ نبی کریم ﷺ نے سب قرابتداروں کو محروم کر کے سب کا حق حضرت فاطمہؓ کو دے دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ صاحبزادیاں نزول آیت سے پہلے وفات پا چکی تھیں تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور وفات مدینہ میں ہوئی۔نیز یہ کہنا کہ حقہ سے فدک مراد ہے یہ بھی غلط ہے۔اس لیے کہ یہ آیت سورہ اسراء کی ہے جو بالاتفاق مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا؟ فدک تو ہجرت کے ساتویں برس رسول اللہ ﷺ کے قبضے میں آیا تھا۔

نیز اگر اہل تشیع کے نزدیک ذاالقربیٰ کے لفظ سے حضرت فاطمہ الزہراءؓ ہی مراد ہوتی تھیں تو اس بناء پر آیت **واعلموا انما غنمتم من شیء فان لله خمسه وللرسول ولذی القربیٰ** میں ذی القربیٰ سے حضرت فاطمہؓ ہی مراد ہوں گی۔جس کا مطلب یہ نکلے گا کہ مال غنیمت کا خمس صرف فاطمہؓ کے لیے ہے۔باقی حضرت فاطمہؓ کے علاوہ دیگر بنی ہاشم کو دینا اور لینا جائز نہیں۔اہل تشیع نے یہ سمجھا کہ اس آیت میں خطاب فقط نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ہے خاص حضرت فاطمہؓ کو حق فدک دینے کے بارے میں بطور قبالہ آسمان سے نازل ہوئی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اس کے ماقبل اور مابعد تمام خطابات امت کو ہیں اور امت کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم ان احکام کو بجالانا کیونکہ شروع آیت میں **وقضٰی ربك الا تعبدوا الا ایاه** اور **ربکم اعلم بما فی نفوسکم** اور **لا تقتلوا اولادکم** وغیرہ وغیرہ میں تمام ضمیریں جمع کی ہیں اور باقی رہا **اما یبلغن عند ك الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف** یہ خطاب بھی اگرچہ لفظ مفرد ہے۔مگر اس سے بھی مراد امت ہی کا ہر فرد ہے، نبی کریم ﷺ کے ماں باپ تو بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔لہذا یہ حکم کہ ماں باپ کے سامنے اف نہ کرنا اور ان کے ادب کو ملحوظ رکھنا درحقیقت امتیوں کو سنانے کے لیے ہے آپ کے لیے نہیں۔

۔۔۔۔۔وات۔۔۔۔میں بھی خطاب ہر شخص کو ہے۔کہ ہر شخص کو چاہیے کہ قرابتداروں کا حق ادا کرے اور صلہ رحمی سے دریغ نہ کرے اور علی ھذا القیاس سورہ روم میں **اولـم یـرو ان الله یبسط الرّزق لمن یشآء ویقدر** کے بعد **فـاٰت ذالقربیٰ حقه** سے بھی صلہ رحمی کی ترغیب مقصود ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے تم اگر اہل قرابت کے ساتھ سلوک اور احسان کرو گے تو اللہ تعالی تمہارے رزق میں وسعت دے گا اور اللہ کی رضا چاہنے اور کامیابی پانے والوں کے لیے یہی طریقہ بہتر ہے کہ رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دیا جائے۔اس آیت میں بھی گو مخاطب خاص رسول اللہ ﷺ ہی ہیں لیکن فی الحقیقت خطاب عام ہے۔(۲)

فَـاٰتِ ذَالْـقُـرْبیٰ حَـقَّــهٗ وَالْـمِسْـكِيْـنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يُـرِيْـدُوْنَ وَجْــهَ الـلّٰـهِ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الْـمُـفْـلِحُوْنَ (الـروم۳۰:۳۸)

پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق)۔یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کو خیرات نہیں بلکہ ان کو ان کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے دوسروں کی نسبت تمہیں اگر کچھ مال زیادہ عطا کیا ہے تو یہ زائد مال تمہارے لیے آزمائش ہے۔اللہ تعالی یہ آزمانا چاہتے ہیں کہ تو اپنے زائد مال میں سے ان کا حق پہچانتا بھی ہے یا نہیں پہچانتا۔

اس حکم کی اصل روح یہ ہے کہ قرآن عظیم کے مطابق انسان کی اخلاقی اور روحانی ارتقا کی راہ کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت ضروری ہیں۔یہ ارتقا کسی ایسے معاشرے میں ناممکن ہے جس میں لوگوں کے حقوق ملکیت ختم کردیے جائیں۔تمام وسائل و ذرائع کی مالک ریاست بن جائے۔لوگوں کے درمیان رزق کی تقسیم حکومتی نظام سنبھال لے۔یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے اوپر دوسرے کا حق پہچان کر دے سکے۔نہ کوئی شخص کسی دوسرے سے کچھ لے کر خوش ہو سکے۔اسی طرح کے خالص دہریانہ نظام تمدن و معیشت کو ہمارے ملک میں ''قرآنی نظام ربوبیت'' کے پرفریب نعرے کے ساتھ قرآن سے منسلک کیا گیا۔یہ قرآن کی حکمت عملی کے بالکل خلاف ہے۔کیونکہ اس میں ایک فرد کی اخلاقی نشوونما اور سیرت کی تشکیل و ترقی کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔

قرآن کی حکمت عملی تو اس جگہ کارگر ہے جہاں افراد کچھ وسائل دولت کے مالک ہوں۔ان پر آزادانہ تصرف کا اختیار رکھتے ہوں اور اپنی خوشی اور پورے اخلاص کے ساتھ بندوں کے حقوق ادا کریں۔اسی قسم کے معاشرے میں امکان ہے کہ لوگوں میں ایک طرف حق کو پہچاننے اور حقوق العباد کی

---

*مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے اس روایت کی تردید مدلل انداز میں کی ہے میں نے مختصر لکھنے پر اکتفا کیا ہے،مزید تفصیل کے لیے حوالہ ذیل سے رجوع کیا جائے۔

(۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۴،ص:۴۷۵۔۴۷۷

ادائیگی کے اعلی اوصاف پیدا ہوں اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے، ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لیے خیر خواہی اوراحسان مندی کے جذبات پرورش پائیں۔ایسی مثالی حالت حاصل ہوجائے جس میں برائی کا رکنا اور نیکی کا فروغ پانا کسی ظالمانہ قوت کی وجہ سے نہ ہو ، بلکہ لوگوں کی اپنے نفس کی پاکیزگی اور نیک ارادوں کی وجہ سے ہو۔

وہی فلاح پانے والے ہیں کا یہ مطلب نہیں کہ کامیابی صرف مسکین ،مسافر اور رشتہ دار کا حق ادا کرنے سے حاصل ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حقوق العباد کو نہ تو پہچانتے ہیں اور نہ ہی انہیں ادا کرتے ہیں وہ کامیابی حاصل کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اصل کامیابی حاصل کرنے والے وہ ہیں جو اللہ تعالی کی رضا کے لیے ان حقوق کو پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

۱۳۔انفاق فی سبیل اللہ

انفاق فی سبیل اللہ سے مراد ہے اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرنا۔امام راغب اصفہانی نے انفاق کا درج ذیل مفہوم بیان کیا ہے۔

نَفَق (ن۔س) **الشیءُ** کے معنی کسی چیز کے ختم ہوجانے یا چلے جانے کے ہیں۔ چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) خوب فروخت ہونے سے جیسے **نفق البیع** (سامان) کا خوب فروخت ہونا۔

(۲) بذریعہ مرجانے کے جیسے **نفقت الدابۃ نفوقا**۔جانور کا مرجانا۔

(۳) بذریعہ فنا ہوجانے کے جیسے **نفقت الدراھم**:دراہم خرچ ہوگئے۔**انفقتھا** ان کو خرچ کردیا۔

''**الانفاق** '' کے معنی مال وغیرہ صرف (خرچ) کرنا کے ہیں اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔۔۔۔**خَشْیَۃَ الْاَنْفَاق** (**بنیٓ اسرآئیل** ،۱۷:۱۰۰) کے معنی مفلس ہونے کا خوف کے ہیں اور یہ **انفق فلان** کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی مال خرچ ہوجانے کے بعد قلاش ہوجانے کے ہیں۔ یہاں انفاق بمعنی املاق (بھوک) کے ہیں۔۔**نفقۃ** (اسم) جو چیز خرچ کی جائے۔''(۱)

سید سلیمان ندویؒ سخاوت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کردینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔اپنا حق کسی کو معاف کرنا۔اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا۔اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر دوسرے کو دینا،اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا،دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت خرچ کرنا،اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا،اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا،اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا،دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا۔۔۔اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔''(۲)

فرد چونکہ جماعت کا حصہ ہے اس لیے اس کی انفرادی آمدنی پر اجتماعی معیشت کے حقوق بھی عائد ہیں اور جس قدر وہ کماتا ہے اسی نسبت سے یہ حقوق اس پر زیادہ ہوتے ہیں۔اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

غرض انفاق کے لفظی معنی خرچ کرنے کے ہیں۔اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔یہ خرچ کرنا دو قسم کا ہے۔بعض مرتبہ یہ خرچ کرنا لازم ہوتا ہے۔ایسے صدقات کو واجبی صدقات کہتے ہیں۔جبکہ بعض مرتبہ یہ خرچ کرنا نفل یا زائد ہوتا ہے جو آدمی پر فرض نہیں ہوتا۔ایسے صدقات نفلی صدقات کہلاتے ہیں۔اللہ رب العزت سورہ بقرہ کی ابتدا میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ (البقرہ ۲:۲)

وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔

---

(۱) امام راغب اصفہانی،، مترجم مولانا محمد عبدہ، مفردات القرآن (لاہور: اہل حدیث اکادمی ۱۹۷۱ء) ج:۲،ص:۱۰۷۲،۱۰۷۳

(۲) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ (لاہور: رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۶ ص:۱۸۷

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ دونوں کام دوسری تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی بنیاد ہیں ۔ یہی دو بنیادی نیکیاں ہیں جن پر پورا دین قائم ہے ۔انفاق کے ساتھ **مما رزقنهم** ''اس میں سے ہم نے ان کو بخشی ہیں'' کے الفاظ فرما کر کئی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک تو یہ کہ خدا کی راہ میں اسی کا بخشا ہوا مال خرچ کرنا درحقیقت بندہ کی طرف سے اس مال کے عطیہ الٰہی ہونے کا اعتراف ہے۔

دوسرے اس سے خرچ کرنے کی ایک موثر دلیل سامنے آ گئی وہ یہ کہ خدا کے بخشے ہوئے مال کا کچھ حصہ اس لیے اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے کہ اس کی شکر گزاری کا حق ادا ہو سکے۔

تیسرے اس وضاحت نے انفاق کے مشکل کام کو ایک حد تک آسان بھی بنا دیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس نے دیا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک قلیل حصہ ہی ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں زکٰوۃ کی بجائے انفاق کا لفظ ہے، جو اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدقات وخیرات کی ساری قسموں پر حاوی ہے۔''(۳)

اللہ تعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (البقره ۲:۲۶۷)

اے ایمان والو! خرچ کرو اس میں سے پاکیزہ چیزیں جو تم کماؤ اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے نکالا اور اس میں سے گندی چیز خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو، جبکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ تم چشم پوشی کر جاؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز، خوبیوں والا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُم: (اپنی کمائی کے پاکیزہ حصے میں سے) میں طیبات کا لفظ بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے ۔ایک تو یہ کہ اپنی کمائی میں سے وہی مال خرچ کرو جو پاکیزہ طریقے سے آیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقہ سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو، بے وقعت گھٹیا اور نکما نہ ہو۔ غلط طریقہ سے آئے ہوئے یا نکمے مال سے نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نفس کی وہ تربیت ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر تثبیت کے لفظ سے ہوا ہے۔

مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: کا علیحدہ ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ **ما کسبتم** والے ٹکڑے سے مراد وہ مال ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، زمین کی پیداوار کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیداوار پر زکوۃ کا نظام دوسرے اموال سے بالکل مختلف ہے۔

---

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱، ص:۹۵

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ: میں ناپاک اور گھٹیا مال سے بچنے کی غایت درجہ تاکید ہے۔جس طرح **لا تقربوا** کا لفظ ہے کہ فلاں چیز کے پاس بھی نہ پھٹکو،اسی طرح **لا تیمموا** کا مفہوم یہ ہے کہ برے مال کے دینے کا تو ارادہ بھی نہ کرو۔پھر برے مال کی وضاحت بھی فرمادی کہ اس سے مراد اس طرح کا مال ہے جو خدا کی راہ میں دینے کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں میچے اور دل پر جبر کیے بغیر نہ لے سکو۔جس چیز کو آدمی اپنے لیے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا ،درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے انتہائی دناءت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت حاصل ہونا تو الگ رہا اس سے مزید دوری و مہجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

غنی اور حمید کی وضاحت: یعنی اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کریں تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے۔کہ دیکھے کہ لوگ اس کے بخشے ہوئے مال کو جب خود اس کو دینے کا وقت آتا ہے تو کس طرح دیتے ہیں۔پھر غنی کے ساتھ حمید کی صفت لگائی ہے ۔حمید کے معنی ہیں وہ ذات جو سزاوار حمد و تعریف کاموں کا منبع ہے۔یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے۔اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیضیاب ہوتے ہیں نیک بھی اور بد بھی۔(۴)

انفاق ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۵۴)

اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دیا اس میں سے خرچ کرو ،اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی ،نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر وہی ظالم ہیں۔

مما رزقنٰکم میں انفاق کی دلیل اور تسہیل ہے۔اللہ تم سے انفاق کا جو مطالبہ کر رہا ہے وہ تم پر گراں نہ گزرے۔وہ تم سے تمہاری چیز نہیں بلکہ اپنی ہی بخشی ہوئی چیز مانگ رہا ہے۔وہ اپنے بخشے ہوئے مال میں سے صرف ایک حصہ کے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے۔اس دنیا کے سامان کا حقیقی نفع اسی میں ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے ایک نہ ختم ہونے والے خزانے کی صورت میں حاصل کر لو۔تجارتی نفع ،تعلقات ، برادری اور سفارشات صرف اس دنیا میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔قیامت کے دن وہ نیکی نفع دے گی جو اس دنیا میں ایمان کے ساتھ کمائی گئی ہے۔اس کے علاوہ اس دنیا کی کوئی چیز ابدی نفع دینے والی نہیں ہے اور نہ ہی قیامت کے دن کام آنے والی ہے۔قیامت کے دن انسان کو ایمان اور عمل صالح ہی آخرت کے نقصان سے بچا سکتے ہیں

اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کی گئی رقم کو قرض حسنہ کا نام دیتے ہیں۔مال بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور اگر اسے اس کے راستے میں خرچ کیا جائے تو اسے وہ اپنے ذمے ایک قرض قرار دیتا ہے جو قیامت کے دن کئی گنا نفع کے ساتھ لوٹایا جائے گا۔اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرہ ۲:۲۴۵)

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی ،تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج ۱، ص ۶۱۹، ۶۲۰

کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، پھر وہ اسے کئی گنا زیادہ بڑھا دے؛ اللہ تنگی

(بھی) دیتا ہے اور فراخی (بھی) دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(آیت ماقبل میں) ''جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لیے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ موثر ہے۔ اول تو سوال کا یہ انداز ہے کہ کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے غایت درجہ شوق انگیز ہے۔ پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض قرض دار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کو اپنے ذمے قرض ٹھہراتا ہے۔ یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمے واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے۔ اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پرواہ ہے۔ البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنا تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔''

اس کے بعد قرض حسنہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لیے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے دیا جائے کسی دنیاوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔''(۵)

سید ابوالاعلیٰ مودودی ''قرض حسن'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قرض حسن کا لفظی ترجمہ ''اچھا قرض'' ہے، اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو کسی کو خالص نیکی کے جذبے اور کسی غرض کے بغیر دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ قرض حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔''(۶)

---

(۶) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۵۶۷

(۷) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۱۸۵

آیت کے آخر میں ایک اہم بات ارشاد فرمادی کہ رزق کی تنگی اور کشادگی کا اختیار اللہ تعالی کے پاس ہے۔انسان کی اپنی تدبیروں پر رزق کی تنگی اور کشادگی کا انحصار نہیں ہے۔اب اگر وہ اپنا مال اپنے خدا سے چھپاتا اور بچاتا ہے تو وہ اس سے چھپاتا ہے جو عطا کرنے کے بعد چھین بھی لیتا ہے۔
اللہ تعالی، انفاق فی سبیل اللہ کے فوائد کو ایک مثال سے واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ‌ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ‌ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ (البقرہ ۲:۲۶۱)

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں اگیں، ہر بال میں سو دانے ہوں۔اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور اللہ وسعت والا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کے فوائد کو ایک مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ایمانی مقاصد کی خاطر مومنوں کو اللہ کی راہ میں جانی اور مالی قربانیاں دینے کا حکم دیا گیا۔کسی قوم کے معاشی نقطہ نظر کی تبدیلی سے اسے ذاتی اور قومی مفادات سے بالاتر ہو کر اعلی خلاقی مقاصد کے لیے اپنا مال خرچ کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔پیسے کمانے کے لیے جینے والے، پیسے پر جان دینے والے، ہر وقت نفع نقصان کو سامنے رکھنے والے مادہ پرست لوگ اعلی مقاصد کے لیے کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ایسے لوگ اخلاقی مقاصد کے لیے خرچ سے پہلے اپنی ذات، برادری یا قوم کے مادی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔اس مادی فکر کے ساتھ اس دین کی راہ پر چلنا بہت مشکل ہے، جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔اس راہ میں اس کی فکر دنیاوی فوائد و نقصانات سے بالاتر ہوتی ہے۔اس دین کی پیروی کے لیے وسعت نظری، حوصلے کی بلندی ،دل کی کشادگی کے ساتھ رضائے الٰہی کی طلب جیسی اخلاقیات کی ضرورت ہے۔معاشرتی نظام زندگی میں مادہ پرستانہ اخلاقیات کی بجائے ان روحانی اخلاقی اوصاف کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔اسی لیے آگے مسلسل تین رکوعات میں اسی فکر کی تشکیل کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

اب یہ مال خرچ کرنا اگر اللہ تعالی کے قانون کے مطابق اور خالص اللہ تعالی کی رضا کے لیے ہو تو اس کا شمار اللہ کی راہ میں ہوگا۔اس میں اپنی جائز ضروریات پوری کرنا، اپنے گھر والوں کی پرورش کرنا، قریبی رشتہ داروں کی خبر گیری محتاجوں اور ضرورتمندوں کی مدد کرنا، رفاہ عامہ کے کام، دین کی اشاعت اور جہاد کے لیے مال خرچ کرنا شامل ہے۔اس مال کو انسان جتنی زیادہ خلوص نیت کے ساتھ خرچ کرے گا، اتنا ہی اللہ تعالی کی طرف سے اجر زیادہ دیا جائے گا۔وہ تمہارے اس مال کے ایک روپے کا اجر سات سو گنا تک بڑھا سکتا ہے۔کیونکہ وہ واسع یعنی کھلے ہاتھ سے دینے والا ہے۔وہ تنگ دست نہیں ہے کہ تمہارے عمل کے مطابق تمہیں اجر نہ دے سکے۔پھر تم جس جذبے اور نیت کے ساتھ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اسے خوب جانتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ بے خبری میں اسے تمہاری نیت اور جذبے کا علم نہ ہو اور تمہیں تمہارے عمل کا اجر نہ دیا جائے۔
وسری مثال جو انفاق کے فوائد میں ارشاد فرمائی گئی:

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِيۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبۡوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ‌ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (البقرہ ۲:۲۶۵)

ان کی مثال جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دلوں کے ثبات و یقین کے لیے مال خرچ کرتے ہیں (ایسی ہے) جیسے بلندی پر ایک باغ ہے اس پر تیز بارش پڑی تو اس نے دوگنا پھل دیا، پھر اگر تیز بارش نہ پڑے تو پھوار (ہی کافی ہے) اور جو تم کرتے ہو اللہ دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں اللہ رب العزت مقبول صدقات کی مثال بیان فرماتے ہیں۔ان لوگوں کے صدقات کی مثال جو اپنے مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کا خرچ کرنا دلی تصدیق اور یقین کی بنیاد پر ہے۔ان کو پختہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقات پر کیا گیا جزا وسزا کا وعدہ برحق ہے۔ان کے دل اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو اس خرچ کرنے کا پورا پورا اجر ملے گا۔جیسے ایک حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔(۷)

جس نے ایمان اور احتساب کی نیت سے روزے رکھے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔

اللہ کی رضا، دلی تصدیق اور یقین کامل کی بنیاد پر خرچ کیے جانے والے صدقہ کی مثال بلندی پر واقع ایک باغ کی طرح ہے۔یہ باغ دیکھنے میں انتہائی خوبصورت نظر آتا ہے۔کیونکہ جو درخت بلندی پر واقع ہوں وہ خوبصورت نظر آتے ہیں۔عام مشاہدے کی بات ہے کہ بلند مقامات کی آب وہوا انتہائی لطیف ہوتی ہے۔اب اس باغ پر زور کی بارش پڑتی ہے تو وہ باغ دوگنا پھل دیتا ہے۔اگر بارش نہ ہو تو اس باغ کے لیے شبنم اور اوس ہی کافی ہے۔اس لیے کہ زمین عمدہ اور آب وہوا خوشگوار ہے۔ایسی صورت میں تھوڑا سا پانی بھی کافی ہوتا ہے۔غرض کم یا زیادہ پانی کے ملنے سے وہ باغ خراب نہیں ہوتا۔بالکل اسی طرح ایک مخلص مومن کے صدقات بلندی پر واقع باغ کی مانند ہیں جو کم ہوں یا زیادہ ضائع نہیں ہوتے۔ان کو ان کے اخلاص،نیت اور خرچ کے مطابق ثواب ملے گا۔

زور کی بارش کو بہت مال خرچ کرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی جبکہ شبنم اور اوس سے اللہ کی راہ میں تھوڑا مال خرچ کرنا مراد ہے۔اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو گہرائی سے دیکھنے والے ہیں۔وہ نیتوں کی بنیاد پر انسان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ کون اخلاص نیت کے ساتھ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اور کون دکھاوے اور منافقت کے لیے خرچ کرتا ہے۔اس کے علاوہ کون ایسا ہے جو دینے کے بعد احسان جتلاتا ہے۔اس مثال سے اللہ تعالیٰ یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ خلوص نیت کے ساتھ کیا جانے والا عمل فائدے والا ہوگا۔یہ اخلاص والے سابقین،اولین،مقربین ہوں یا اصحاب یمین (جن کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) میں سے ہوں۔ایمان اور اخلاص کے ساتھ کیا جانے والا کوئی عمل ضائع نہیں ہوگا۔

اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کی اقسام اور اس کے اخروی فوائد پر درج ذیل آیت میں نہایت جامعیت سے ارشاد فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن کو، پوشیدہ اور ظاہر، پس ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہے۔انفاق کے اجر اور ثواب کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔خرچ کرنے سے دنیاوی مال کم ہو رہا ہے لیکن آخرت میں اس مال کے بے شمار فوائد حاصل ہونے والے ہیں۔اس کا اجر سات سو گنا تک بڑھا دیا جائے گا۔انفاق چاہے دن کو کیا جائے چاہے رات کو،اعلانیہ کیا جائے یا پوشیدہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہی اس کا اصل اجر عطا فرمائیں گے۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اولیاء اللہ ہیں۔جن کو نہ تو عذاب کا خوف ہوگا اور نہ ناکامی کا غم۔ایسے لوگ ہی کامیاب ہیں۔

---

(۷)صحیح بخاری،کتاب الصوم،باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا و نیة،رقم:۱۸۰۲

۱۴۔امانت داری

امانات کے بارے میں اللہ رب العزت حکم دیتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُوءَ دُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا (النسآء ۴:۵۸)

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں خالدؓ بن ولید کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے اور جب فتح مکہ کے دن آنحضور مکہ آئے اور عثمان سے خانہ کعبہ کی کنجی طلب کی تو عثمان نے بے تامل آپ کے حوالے کر دی اور پھر خانہ کعبہ سے باہر آ کر جب آپ وہ کنجی عثمان کو دینے لگے تو حضرت عباسؓ بول اٹھے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کنجی میرے حوالے کر دی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے عثمان کی امانت (کنجی) عثمان کے حوالے کر دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کنجی تم کو واپس دلائی ہے۔ اب یہ کنجی ہمیشہ تمہارے ہی پاس رہے گی اور جو شخص یہ کنجی تم سے چھینے گا وہ ظالم کہلائے گا۔ مرتے دم تک یہ کنجی عثمان ہی کے پاس رہی۔ مرتے وقت یہ کنجی اپنے بھائی شیبہ کو دی۔ چنانچہ اب تک خانہ کعبہ کی کنجی شیبہ کی اولاد میں ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک اسی کی اولاد میں رہے گی۔'' (۲)

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ امانات کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امانات سب حقوق کو شامل ہے اس میں حقوق اللہ بھی آ گئے۔ مسائل سلوک میں لکھتے ہیں کہ اگر امانت کو عام لے لیا جائے تو آیت میں مشائخ کو بھی امر ہو گا کہ برکات کو ان کے اہل تک پہنچا دیں اور جو شخص خلافت ارشادیہ کا اہل ہو اس کو اجازت دیں۔'' (۱)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ امانت کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) امانت کی حقیقت یہ ہے کہ جس کسی کا جو حق تم پر واجب ہو اس کو طیب خاطر کے ساتھ ادا کرو۔

(۲) آیت کا نزول اگرچہ خاص واقعہ مفتاح (چابی) میں ہوا ہے لیکن بالاجماع یہ آیت مال ودیعت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ لفظ امانات میں جملہ قسم کی امانتیں داخل ہیں کیونکہ الامانات پر جو الف لام داخل کیا گیا ہے وہ استغراق کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جملہ اقسام کی امانتوں کی رعایت واجب ہے کسی امانت میں بھی خیانت روا نہیں۔

(۳) جاننا چاہیے کہ انسان کے معاملات کی کل تین قسمیں ہیں یا تو انسان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے یا لوگوں کے ساتھ یا اپنے نفس کے ساتھ ہے۔ تینوں قسموں میں امانت کی رعایت ہر انسان پر فرض ہے۔

(۱) خدا تعالٰے کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ جن باتوں کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو بجا لائے اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے رکا رہے احکام خداوندی کی بجا آوری میں خیانت نہ کرے۔

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۲۳۷

(۲) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۳۶۵

(ب)اور لوگوں کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ ان کی ودیعتیں اور ان کے قرض ادا کرے ماپ (ناپ) تول میں کمی نہ کرے اور بادشاہوں کی امانت یہ ہے کہ رعایا کے حقوق ادا کریں عہدہ اور منصب کسی نا اہل کو نہ دیں نا اہل کو عہدہ اور منصب دینا رعایا کے ساتھ خیانت ہے اور علماء کی امانت یہ ہے کہ احکام خداوندی بلا کم و کاست شریعت کے مطابق لوگوں تک پہنچا دیں۔
(ج) اور اپنے نفس کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ اپنے اعضاء و جوارح سے وہ کام نہ لے جو دنیا اور آخرت میں اس کے لیے مضر ہوں مثلاً زبان کو کلمات کفر اور بدعت اور کذب و غیبت سے محفوظ رکھے اور آنکھ کی امانت یہ ہے کہ اس کو حرام کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھے اور کان کی امانت یہ ہے کہ جھوٹ اور غیبت اور گانے بجانے کے سننے سے محفوظ رکھے اور شرمگاہ کی امانت یہ ہے کہ اس کو حرام سے بچائے۔'' (۳)

''امانت'' کے وسیع مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''امانت'' کا لفظ یہاں اپنے محدود مفہوم میں نہیں بلکہ جس طرح **انا عرضنا الامانة على السمٰوٰت والارض** (ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر) والی آیت میں یہ آیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی نہایت وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق و فرائض خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی کے، اپنوں سے متعلق ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے، غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

اگر اس سورہ کے پچھلے مطالب ذہن میں محفوظ ہیں تو یہ بات سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی کہ اس ہدایت کے اندر یہ تلمیح بھی مضمر ہے کہ یہ امانت جن سے چھین کر تمہیں دی جا رہی ہے انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ جس منصب شہادت پر ان کو مامور کیا گیا اس کو انہوں نے چھپایا، جو کتاب ان کی تحویل میں دی گئی اس میں انہوں نے تحریف کی، جس شریعت کا ان کو حامل بنایا گیا اس میں انہوں نے اختلاف پیدا کیا، جن حقوق کے وہ امین بنائے گئے اس میں انہوں نے خیانت کی، جو فرائض ان کے سپرد ہوئے ان میں وہ چور ثابت ہوئے، جو عہد انہوں نے باندھے وہ سب توڑ ڈالے۔ اس وجہ سے تمہاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اس عظیم امانت کی صورت میں جن حقوق و فرائض کے اب تم حامل بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

حقوق و فرائض کے لیے امانت کا لفظ ایک تو یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ یہ سب خدا کی سپرد کردہ امانتیں ہیں اس لیے کہ ان کا عائد کرنے والا خدا ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان ساری امانتوں کے متعلق ایک دن لازماً امانت سونپنے والے کی طرف سے پرسش ہونی ہے، اگر ان میں خیانت ہو گی تو کوئی نہیں ہے جو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔ (۴)

غرض امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد آ جاتے ہیں۔ ایک مسلمان کو اللہ، اس کے رسول اور آپس کی امانتوں میں خیانت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے نبیؐ کا تو لقب ہی امین تھا۔ اس آیت میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ عہدہ اس شخص کے سپرد کرو جو عہدے کا اہل ہے۔

---

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ۲۳۸، ۲۳۹

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲ ص: ۳۲۲، ۳۲۳

کیونکہ عہدہ ایک امانت ہوتا ہے۔اس عہدے کوسونپتے ہوئے رشوت اور سفارش کے ذریعے کسی کا حق نہ مارا جائے۔کیونکہ امانت کے مفہوم میں کسی کو اس کا حق ادا کرنا شامل ہے۔سید ابوالاعلی اس کی تصریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی ان تمام برائیوں سے بچتے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں،یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے (Position of trust)ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل،کم ظرف،بداخلاق،بددیانت اور بدکار تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا،بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں،یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔''(۵)

قرآن مجید میں ہی دوسری جگہ کامیاب مومنوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (المومنون ۲۳:۸)

اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی نگرانی کرتے ہیں

لغت کے اعتبار سے امانت کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اٹھائی ہو اور اس پر اعتماد کیا گیا ہو۔امانت کی کئی اقسام ہیں جن کو شامل کرنے کے لیے مصدر کو جمع کے صیغے میں لایا گیا ہے۔اس طرح ''امانات'' کا لفظ جامع ہے جس میں وہ تمام امانتیں شامل ہیں جو اللہ رب العزت ،معاشرے یا افراد نے کسی شخص کے سپرد کی ہوں۔اس مفہوم میں وہ تمام امانتیں بھی شامل ہیں جو اللہ رب العزت نے ہمیں قوتوں،صلاحیتوں ،فرائض کی صورت میں،نعمتوں کی شکل میں عطا کی ہیں۔درج بالا تصریح سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی بھی امانت کے مفہوم میں شامل ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض اور واجبات کا ادا کرنا ہے اور تمام محرمات ومکروہات سے پرہیز کرنا ہے۔ حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت کا داخل ہونا تو معروف ومشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا یہ اس کی امانت ہے اس کی حفاظت اس کے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے۔اس کے علاوہ کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی وہ بھی اس کی امانت ہے،شرعی اجازت کے بغیر کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے ۔مزدور ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا اس کے لیے جتنا وقت خرچ کرنا باہم طے ہو گیا اس میں اس کام کو پورا کرنے کا حق ادا کرنا اور مزدوری ملازمت کے لیے جتنا وقت مقرر ہے اس کو اسی کام میں لگانا بھی امانت ہے۔کام یا وقت کی چوری خیانت ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت اور اس کا حق ادا کرنا بڑا جامع لفظ ہے سب مذکورہ تفصیلات اس میں داخل ہیں۔(۶)

غرض کامیاب مومن امانتوں میں خیانت نہیں کرتے۔آنکھ اور کان غرضیکہ تمام اعضاء سب اللہ کی امانتیں ہیں۔ان کو اللہ تعالی کے حکم کے خلاف استعمال کرنا خیانت ہے۔اسی طرح شرمگاہ کو بیوی اور شرعی باندی کے علاوہ کسی اور جگہ استعمال کرنا بھی امانت میں خیانت ہے۔امانت میں خیانت کرنا منافقین کی علامت تو ہوسکتا ہے کامیاب مومنوں کی صفت نہیں ہوسکتی۔اس لیے جو امانتیں ہمارے ذمے ہیں ہمیں ان کی حفاظت کرنی چاہیے۔

---

(۵) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن(لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء)ج:۱،ص:۳۶۲

(۶) مفتی محمد شفیع،معارف القرآن(کراچی،ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء)ج:۶،ص:۲۹۸

محاسن اخلاق اللہ تعالی کی صفات کا عکس ہیں ۔پیغمبر اسلام ﷺ اخلاق کے بلند درجہ پر فائز تھے ۔اردو تفاسیر سے محاسن اخلاق کا مختصر مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے ۔اس کے علاوہ ان احکام میں سے بعض فرض کا درجہ رکھتے ہیں ،بعض سنت کا ،بعض نفل کا اور بعض مستحب کا۔ان احکامات پر عمل کرنے سے ایک مسلمان ثواب کماتا ہے جبکہ ان پر عمل نہ کرنے سے انسان گناہ گار ہوتا ہے ۔اس فصل کے لیے جن اخلاق حسنہ کا انتخاب کیا گیا وہ یہ ہیں ۔صدق ،صبر ،ایفائے عہد ،عدل ،احسان ،عفو ،شکر ، بر اور تقوی میں تعاون ،نگاہوں کا پست رکھنا ،شرمگاہ کی حفاظت ،خوش کلامی ،صلہ رحمی ،انفاق فی سبیل اللہ ،امانت داری ۔اس سے یہ مراد نہیں کہ صرف یہی اعلی اخلاق ہیں اور ان کے علاوہ اعلی یا اچھے اخلاق نہیں ۔بلکہ یہ اہم اخلاقی اقدار ہیں اور زیادہ تر اخلاق کی کتابوں میں ان پر بحث کی گئی ہے ۔

صدق سچائی کو کہا جاتا ہے لیکن اسے صرف سچ بولنے تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۔صدق میں قلب ،زبان اور عمل کی سچائی شامل ہے ۔سچ بولنے سے انسان صدیق کا درجہ پا لیتا ہے اور اللہ تعالی کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہو جاتا ہے ۔اس لیے اللہ رب العزت نے سچوں کی صحبت اختیار کرنے اور ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے ۔اس لیے کہ نیک لوگوں کی صحبت انسان کو نیک بنا دیتی ہے ۔صدق سے اعمال کی اصلاح اور گناہوں سے معافی ملے گی ۔

صبر کے لفظی معنی قابو میں رکھنا کے آتے ہیں ۔اپنے نفس کو قابو میں رکھنا صبر کہلاتا ہے ۔اللہ تعالی نے خوف ،بھوک ،جانی ،مالی اور پھلوں کے نقصان پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے ۔اس کے علاوہ مشکل اور نا مساعد حالات میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہیے ۔صبر کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے ۔صبر کے بدلے میں جنت اور ریشمی لباس عطا کیا جائے گا ۔

اسی طرح اچھے اخلاق کے ضمن میں وعدے کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔عہد تین قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو انسان اللہ کے ساتھ کرتا ہے ۔دوسرا وہ جو اپنے آپ کے ساتھ کرتا ہے ۔تیسرا وہ جو انسان دوسرے لوگوں کے ساتھ کرتا ہے ۔وعدے کی جو بھی قسم ہو اسے پورا کرنا لازم ہے ۔وعدے کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ قیامت کے دن ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا ۔وعدہ پورا نہ کرنا علامات نفاق میں سے ہے ۔اس کے علاوہ نذر اور قسم وغیرہ بھی عہد میں شامل ہیں ان کو بھی پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔کسی قوم کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ان کو اطلاع دینے کے بعد توڑا جا سکتا ہے ۔

عدل اسلام کا ایک اہم حکم ہے ۔اکثر لوگوں نے اس کا معنی برابری کے کیے ہیں لیکن سید ابوالاعلی مودودی نے اس کے لیے توازن اور تناسب کا لفظ تجویز کیا ہے ۔اسلام معاشی ،معاشرتی غرض ہر سطح پر عدل کا قیام چاہتا ہے ۔اسلام نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے ۔اس کے ساتھ انصاف پر مبنی شہادت دینے کا حکم بھی دیا گیا ہے ۔

احسان ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے ۔عبادت میں خوبصورتی ،اخلاص نیت ،کسی جانور کو ذبح کے وقت تکلیف سے بچانا ،حسن سلوک وغیرہ ۔عدل کے معاملے میں احسان معافی کا معنی دیتا ہے جو عدل سے بڑھ کر ہے ۔اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔احسان نفل کے زمرے میں آتا ہے

اسلام نے عفو یعنی انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے معاف کر دینے کا حکم دیا ہے ۔ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں ۔معاف کرنے کا اعلی درجہ یہ ہے کہ معاف کرنے کے ساتھ احسان بھی کیا جائے ۔اعتدا کی حد تک معاف کرنے کی اجازت ہے ۔اگر معاف کرنے سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا دینی اور اخلاقی حدود پر کوئی حملہ نہیں ہوتا تو معاف کر دینے میں کوئی حرج نہیں ۔

شکر کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک منفرد طرز اختیار کیا ہے اور حمد کا ترجمہ تعریف کی بجائے شکر سے کیا ہے ۔عام طور پر کسی کے احسان پر اس کی تعریف کرنا شکر کہلاتی ہے ۔شکر کی بھی تین اقسام ہیں ۔قولی ،قلبی ،عملی ۔شکر کرنے والے کو شکر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔اللہ تعالی اس کو مزید عطا کرتے ہیں ۔پھر اللہ رب العزت نے اپنے ساتھ اپنے والدین کا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے ۔

اسی طرح بر اور تقوی بھی وسیع مفہوم کے حامل ہیں ۔اہل ایمان کو بر اور تقوی میں تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔

فصل دوم:

رذائل اخلاق سے متعلق احکام کی تشریح وتوضیح

رذائل اخلاق سے مراد بری عادات اور گھٹیا اخلاق ہیں ۔ ہر مذہب اور معاشرے نے اپنے طور پر برے اخلاق کی وضاحت کی ہے ۔اخلاق رذیلہ وہی بری عادات ہوں گی جو خدا، مذہب، افراد یا معاشرہ کی ناپسندیدہ ہوں گی ۔لیکن اسلام میں اخلاق رذیلہ سے مراد وہ بری عادات ہوں گی جن سے قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے اور احادیث نبویؐ میں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمادیا ہے۔اس لیے کہ ان بری عادات سے افراد اور معاشروں کو روحانی نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ان کی معاشرت تباہ ہوسکتی ہے۔قرآن مجید نے ان کو فحشاء، منکر اور بغی کے الفاظ میں جامعیت کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ان تینوں کے تحت آنے والا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے ضمن میں آتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو ان تینوں الفاظ میں جمع کردیا ہے ۔ان میں سے بعض گناہ قابل تعزیر جرم بھی ہیں۔اسلام نے برے اخلاق سے بچنا کا حکم دیا ہے۔ جب تک برائی اور اس کے احکامات معلوم نہیں ہوں گے برائی سے بچنا مشکل ہے بلکہ اس بات کا زیادہ خدشہ ہے کہ انسان برائی کا شکار ہوجائے۔

ان احکامات کی فہرست بہت طویل ہے ۔ان میں سے میں نے چودہ احکام کا انتخاب کیا ہے ۔ان میں فحشاء، جھوٹ، فضول خرچی کی ممانعت، بخل، قتل اولاد، قتل ناحق، غیبت، بدگمانی، عیب جوئی، ناپ تول میں کمی جھوٹی قسمیں کھانا، عہد شکنی، بہتان اور فحش گوئی شامل ہیں۔کچھ ذیلی احکامات کی وضاحت ان کے ضمن میں کردی ہے۔اس تفصیل کے لیے سید سلمان ندویؒ کی کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی چھٹی جلد کی طرف مراجعت کی گئی ہے۔ان میں سے صرف وہ احکام منتخب کیے گئے ہیں جو خالصتا اخلاق کے باب سے متعلق ہیں۔طوالت کے ڈر سے معاشیات سے متعلق اخلاقی برائیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ان پر مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ان پر بہت زیادہ تحقیقی کام ہوچکا ہے۔ان بداخلاقیوں کے مباحث بھی چھوڑے گئے ہیں جو ایک فرد کی خرابی سے متعلق ہیں۔صرف انہی رذائل اخلاق پر بحث کی گئی ہے جن سے معاشرے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔

دور جدید میں بے حیائی عام ہوچکی ہے ۔مسلمان عورتوں نے پردہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ان کے نزدیک صرف دل کا پردہ ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ انہوں نے نیم عریاں لباس پہننا شروع کردیا ہے۔شادیوں کی تقریبات میں رقص وسرود کی محفلیں بپا کی جاتی ہیں اور پیسے کو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔جھوٹ اور منافقت عام ہوتی جارہی ہے۔ملاوٹ اور دھوکہ دہی کو تجارت کا لازمی جز وسمجھا جاتا ہے۔بسنت اور شب برات پر فضول خرچی کی جاتی ہے اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ہم دنیا کے معاملات میں تو پیسہ لگاتے ہیں مگر راہ خدا میں خرچ کرتے وقت ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔انسانوں کو ناحق قتل کیا جاتا ہے۔دہشت گردی کی کاروائیوں میں معصوم انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے۔صبر اور برداشت معاشرے سے ختم ہورہا ہے۔دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے مسلمان غیر مسلم طرز زندگی اختیار کررہے ہیں۔

ایسے حالات میں ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دین کا صحیح مفہوم حاصل کرے۔اسلام کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کو پہچانے۔ان احکامات کا فہم حاصل کرے جو قرآن وسنت میں بڑی وضاحت سے بیان کردیے گئے ہیں۔مغربی دنیا اخلاق کی جو تعریف بھی کرے یا جس بہترین طریقے سے وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کریں ہمارے لیے قابل تقلید نہیں ہیں۔ہمارے لیے قابل تقلید وہی احکامات اور معیارات ہیں جو قرآن وسنت میں بیان کردیے گئے ہیں۔یہ فصل برے اخلاق کو سمجھ کر ان سے اجتناب کرنے کی ایک کوشش ہے۔ہماری دنیا اور آخرت کی کامیابی اسی میں ہے کہ ہم ان احکامات کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔

ا۔فحشاء

فحشاء کے معنی کھلی بے حیائی کے ہیں ۔اسلام حیاء کا علمبردار ہے ۔ہمارے نبی مکرم ﷺ اعلی درجے کے حیادار انسان تھے۔حیاء ایمان کا شعبہ ہے ۔اس لیے اسلام میں بے حیائی سے منع کیا گیا ہے۔اللہ رب العزت فحشاء سے باز رہنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰـہَ یَـامُرُ بِـالۡـعَـدۡلِ وَالۡاِحۡسَـانِ وَاِیۡتَـآئِ ذِی الۡـقُرۡبٰی وَیَنۡھٰی عَنِ الۡـفَـحۡشَـآءِ وَالۡـمُـنۡـکَرِ وَالۡبَغۡیِ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ۔(النحل ۱۶:۹۰)

بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا اور روکتا ہے بے حیائی اور نامعقول کام اور سرکشی سے ،تم کو سمجھاتا ہے شاید تم یاد رکھو۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی ''**فحشاء**'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' **فحشاء** کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو فحش ہے۔مثلاً بخل ،زنا، برہنگی و عریانی ،لواطت ،محرمات سے نکاح کرنا ،چوری ،شراب نوشی ، بھیک مانگنا ،گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ ۔اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے ،مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا ،تہمت تراشی ، پوشیدہ جرائم کی تشہیر ،بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم ،عریاں تصاویر،عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا ،علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز وادا کی نمایش کرنا وغیرہ ۔''(۱)

مولانا امین احسن اصلاحی ''**فحشاء**'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فحشاء کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لیے مستعمل ہے۔قرآن مجید میں اس سے زنا ،لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے جیسی برائیاں مراد ہیں۔جب سوء اور فحشاء دونوں لفظ اکٹھے آئیں تو نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کی مالی ،جسمانی اور عقلی نقصانات ومصائب بھی ان کے تحت آجاتے ہیں ۔(۲)

غرض فحشاء کا مفہوم بہت وسیع ہے ۔اس کے معنی کھلی بے حیائی کے ہیں۔ہر وہ برا کام جو خواہش نفس کی قوت سے کیا جائے فحشاء کہلاتا ہے۔لوگوں کے سامنے سرعام برائی کا ارتکاب کرنا اور برائی کا پھیلانا فحشاء کی تعریف میں آتا ہے۔مفسرین نے فحشاء کے تحت زنا اور لواطت کا ذکر کیا ہے۔اللہ تعالی انسانوں کو حیاء کی تعلیم دیتے ہیں۔جبکہ شیطان انسانوں کو بے حیائی کا راستہ دکھاتا اور بے حیائی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔اس بارے میں ارشاد الہی ہے:

اِنَّـمَـا یَامُرُکُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَالۡفَحۡشَآءِ وَاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ مَالَاتَعۡلَمُوۡنَ (البقرہ ۲:۱۶۹)

وہ (شیطان) یہی تو حکم کرے گا تم کو برے کام اور بے حیائی اور جھوٹ بولو اللہ پر جو تم کو معلوم نہیں۔

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲:ص:۵۶۶

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی ، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن ، ۱۹۸۵ء) ج:۱ص:۴۱۰

یہاں امر کے معنی سمجھانے اور مشورہ دینے کے ہیں ۔شیطان انسان کو بے حیائی اور برے کام کا مشورہ دیتا ہے ۔انسان کے دل میں برے خیالات کو پیدا کرتا ہے۔وہ انسان سے سرعام جرائم کا ارتکاب کرانا چاہتا ہے۔وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے اس کے عذاب کا حقدار بن جائے ۔وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان بے حیائی کا ارتکاب کر کے اپنے جیسے انسانوں کے درمیان ذلیل اور حقیر ہو جائے ۔اس آیت میں شیطان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سوء اور فحشاء کا حکم دیتا ہے۔''سوء'' افعال سے جبکہ ''فحشاء'' اخلاق سے متعلق ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان انسان کو اپنے افعال اور اخلاق تباہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے ۔وہ انسان کو اس بات کا بھی مشورہ دیتا ہے کہ تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن سے تم خود لاعلم ہو۔اس سے مراد یہ ہے کہ تم ایسے عقائد اور اعمال کی تعلیم دو جن کی شریعت اسلامی میں کوئی بنیاد نہیں ۔ جو شرک اور بدعت پر مبنی ہیں ۔
اسی لیے اللہ تعالی نے بے حیائی کے قریب جانے سے بھی منع کیا ہے۔اس بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام ٦:١٥١)
اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ ،خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ۔

سید ابوالاعلی مودودی ''فواحش'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فواحش'' کا اطلاق ان تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی برائی بالکل واضح ہو۔قرآن میں زنا،عمل لوط، برہنگی ،جھوٹی تہمت اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا ہے۔اسی طرح دوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشاد الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ اعلانیہ کیے جائیں نہ چھپ کر۔(٣)

ہر قسم کی کھلی بے حیائی کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔چاہے یہ بے حیائی پوشیدہ ہو یا ظاہر ہو۔اس لیے بے حیائی کی ہر قسم سے اجتناب کیا جائے۔
فواحش کے میں پہلا درجہ زنا کو حاصل ہے۔چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو ان الفاظ کے ساتھ ادا فرمایا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ١٧:٣٢)
اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو ،یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے ۔

قرآن مجید میں ''**وَلَا تَقْرَبُوا**'' کا لفظ ہلکے اثر کے ساتھ انسان کو تباہ و برباد کر دینے والی برائیوں کے لیے مستعمل ہے۔ان برائیوں کے اسباب و محرکات انتہائی خطرناک ہیں۔یہ برائیاں بہت دور سے انسان پر اپنا جال پھینکتی ہیں اور اسے گرفتار کر لیتی ہیں ۔پھر ان سے رہائی پانا انسان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ان برائیوں سے انسان اپنے آپ کو اسی وقت بچا سکتا ہے جب وہ اپنے دل و نگاہ اور زبان کی پوری پوری حفاظت کرے ۔ برائی کی طرف راغب کرنے والی ہر چیز سے دور رہے۔ ہر بیہودگی ، بے حیائی اور عریانی کی راہ سے دور رہے۔قرآن مجید نے ''**وَلَا تَقْرَبُوا**'' کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مومن مردوں اور مومن عورتوں پر بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں۔ان پابندیوں کی تفصیل سورہ النور اور سورہ الاحزاب میں موجود ہے۔
اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے۔اس لیے نیکی اور برائی کا اصل مرکز انسان کا دل ہے۔وہی نیکی فروغ پائے گی جس کی جڑ دل میں مظبوط ہوگی اور وہی برائی ختم ہوگی جس کی جڑ کو دل سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔دل کے اندر موجود برائی حواس خمسہ اور فکر انسانی کے ذریعے پرورش پاتی رہتی ہے۔

---

(٣) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ٢٠١٦ء) ج:١،ص:٥٩٩

یہاں تک کہ وہ روح کے لیے کینسر بن جاتی ہے۔ اگر اسے عمل کے ذریعے وجود میں آنے کا موقع نہ ملے تو اس کے فکری اور قلبی تسلط کی وجہ سے تزکیہ و اصلاح ممکن نہیں۔ یہ روحانی کینسر انسان کی اخلاقی اور ایمانی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن عظیم نے باطنی اور ظاہری بے حیائی سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔

قرآن عظیم نے اللہ رب العزت کے ساتھ مشرکین مکہ کے باطل طرز عمل کا ذکر کئی آیات میں کیا ہے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالی نے فحشاء یعنی بے حیائی کا حکم دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ان کی تردید میں فرمایا:

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف ۷:۲۸)

ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> اس مختصر جملے میں مشرکین کے جاہلانہ عقائد کے خلاف بہت بڑی دلیل پیش کی گئی ہے جسے سمجھنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں:
> ایک یہ کہ اہل عرب اگر چہ اپنی بعض بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے، لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرمناک فعل ہونا خود ان کے نزدیک بھی مسلم تھا۔ چنانچہ کوئی شریف اور ذی عزت عرب اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ کسی مہذب مجلس میں، یا بازار میں، یا اپنے اعزہ و اقربا کے درمیان برہنہ ہو۔
> دوسرے یہ لوگ برہنگی کو شرمناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لیے ان کا دعوی تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ اس پر قرآن مجید یہ استدلال کرتا ہے کہ جو کام فحش ہے اور اور جسے تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ فحش ہے اس کے متعلق تم یہ کیسے باور کر لیتے ہو کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام کا حکم خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتا اور اگر تمہارے مذہب میں ایسا حکم پایا جاتا ہے تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ تمہارا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ (۴)

اللہ رب العزت کی ذات پر مشرکین مکہ کا یہ سراسر الزام تھا کہ وہ بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ حالانکہ اللہ رب العزت نے کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیا۔ قرآن عظیم کی ہر آیت گواہ ہے کہ اللہ تعالی نے حیاء کی تعلیم دی ہے۔ اللہ کے تمام انبیاء بھی حیاء کے لحاظ سے اعلی درجہ کے انسان تھے۔ ایمان کا ایک اہم شعبہ حیاء ہے۔ لہذا مشرکین کا یہ کہنا کہ اللہ بے حیائی کا حکم دیتا ہے ایک جھوٹے الزام کے سوا کچھ نہیں۔ یہ اللہ پر بہتان ہے اور وہ اس بہتان کے برے انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ بے حیائی سے روکتا ہے۔ انسداد فواحش کے سلسلہ میں ایک حکم الہی میں ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِیْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۲)

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے۔

کسی مرد اور عورت کا بغیر نکاح کے جنسی ملاپ زنا کہلاتا ہے۔ زنا ایک واضح بے حیائی ہے۔ اسلام نے اسے حرام، کبیرہ گناہ اور قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔ اگر کوئی کنوارہ مرد اور عورت زنا کریں تو ان کو سو کوڑے مارے جائیں۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد اور عورت زنا کریں تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔ اس آیت میں زنا کو بے حیائی اور برا راستہ قرار دیا گیا ہے۔ ان اسباب سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کو زنا کے قریب لے جا سکتے ہیں۔

---

(۴) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۲۱

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس حکم کے مخاطب افراد بھی ہیں اور معاشرہ بحیثیت مجموعی بھی۔ افراد کے لیے اس حکم کے معنی یہ ہیں کہ وہ محض فعل زنا ہی سے بچنے پر اکتفانہ کریں، بلکہ زنا کے مقدمات اور اس کے ان ابتدائی محرکات سے بھی دور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رہا معاشرہ، تو اس حکم کی رو سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا اور محرکات زنا اور اسباب زنا کا سد باب کرے اور اس غرض کے لیے قانون سے، تعلیم و تربیت سے، اجتماعی ماحول کی اصلاح سے، معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے اور دوسری تمام موثر تدابیر سے کام لے۔ یہ دفعہ آخر کار اسلامی نظام زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اس کے منشاء کے مطابق زنا اور تہمت زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا، پردے کے احکام جاری کیے گئے، فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر جو (زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔''(۵)

مولانا امین احسن اصلاحی ''زنا اور اس کے محرکات'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''منہیات کے باب میں اول زنا کو لیا ہے اس لیے کہ یہ صالح معاشرہ کی جڑ کاٹنے والی برائی ہے۔ صالح معاشرہ کی بنیاد صالح خاندان پر ہے۔ صالح خاندان صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے، جب والدین کے ساتھ اولاد کا تعلق صحیح خون اور صحیح نسب پر استوار ہو۔ اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو خاندان خاندان نہیں بلکہ فطری جذبات و عواطف سے بالکل محروم و ناآشنا حیوانات کا ایک گلہ ہے۔ حیوانات کا کوئی گلہ کسی صالح معاشرہ کی بنیاد نہیں رکھ سکتا ہے۔

زنا کی ممانعت کی دلیل یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے۔ اس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی منطقی بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ فطرت انسانی کی قدیم ترین، معروف، واضح ترین حقیقت ہے۔ انسان جب سے دنیا میں موجود ہے اس نے مرد اور عورت کے آزادانہ تعلق کو کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ نہایت سخت پابندیاں رہی ہیں اور وہ لوگ کبھی خوش دلی کے ساتھ معاشرے میں گوارا نہیں کیے گئے جنھوں نے ان پابندیوں کو توڑا ہے۔

وساء سبیلا: قرآن جس سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے اس سے یہ بالکل منحرف راہ ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں وہ صالح خاندان، صالح معاشرہ اور بالآخر صالح حکومت سب کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔''(۶)

غرض زنا ایک کھلی بے حیائی ہے جس کی قباحت بالکل ظاہر ہے۔ زنا بہت ہی برا راستہ ہے۔ زنا سے حسب نسب خراب ہو جاتے ہیں۔ زنا کی وجہ سے دشمنیاں اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ زنا خواہش پرستوں کا راستہ ہے۔ زنا کے قریب جانے سے مراد ہے کسی اجنبی اور غیر محرم عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا۔ کیونکہ نظر بد زنا کا ڈاکیہ ہے۔ زنا سے پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ جس طرح زانی کی ایک بیوی نہیں ہوتی اسی طرح زانیہ کا ایک شوہر نہیں ہوتا۔ زنا کے لحاظ سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جیسے حیوان جس مادہ جانور سے چاہتا ہے اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے اسی طرح زانی بھی جس عورت سے چاہتا ہے اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے۔ جانور اور زانی دونوں کو نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقتی نکاح جسے متعہ بھی کہا جاتا ہے وہ بھی زنا اور حرام ہے۔

---

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص: ۶۱۳، ۶۱۴

(۶) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص: ۴۹۹، ۵۰۰

۲۔ جھوٹ

عربی زبان میں جھوٹ کو''الکذب '' کہا جاتا ہے۔ یہ''الصدق '' کا متضاد ہے۔قرآن عظیم اوراحادیث میں اس کے لیے''**قول الزور**'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔لغت میں جان بوجھ کر غلط خبر دینے کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔امام راغب اصفہانی ''الکذب'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصل میں یہ دونوں (صدق اور کذب) قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔خواہ اس قول کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے ساتھ۔وعدہ کی قبیل سے ہو یا وعدہ کی قبیل سے نہ ہو۔الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔پھر قول میں سے صرف خبر کے لیے آتے ہیں۔اس کے علاوہ کلام کی دیگر اصناف میں استعمال نہیں ہوتے۔مگر کبھی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام مثلاً استفہام، امر، دعاوغیرہ کے لیے بھی آجاتے ہیں۔الکذب کا استعمال قول اور فعل دونوں کے متعلق ہوتا ہے اسی طرح صحیح بات کہنا مگر ضمیر کا اس کے خلاف ہونا بھی جھوٹ ہے۔''(۱)

اسی طرح **اَلزُّوْرُ** کی لغوی وضاحت میں لکھتے ہیں:

جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہو اسے **بِئْرٌزَوْرَاءُ** کہا جاتا ہے۔اسی سے جھوٹ کو **اَلزُّوْرُ** کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی صحیح جہت سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔۔۔زُوْرٌ کے معنی بت کے ہیں کیونکہ بت پرستی بھی جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔(۲)

جھوٹ اخلاقی برائیوں کی بنیاد ہے،اس لیے قرآن عظیم میں ہر جھوٹی بات سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج ۲۲:۳۰)

اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ ثَلَاثًاقَالُوْابَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِئًافَقَالَ اَلَا وَقَوْلَ الزُّوْرِفَمَا زَالَ یُكَرِّرُهَا حَتّٰی قُلْنَا لَیْتَ سَكَتَ

نبی اکرمؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے تین بڑے گناہوں سے باخبر نہ کردوں۔کہنے لگے ہاں کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی اور بیٹھے تھے اور ٹیک لگالی پس کہا سنو اور جھوٹی بات۔وہ اسے بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ خاموش ہوجائیں۔(۳)

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ہر جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو،خواہ وہ عقائد سے ہو مثلاً اعتقادی شرک یا غیر عقائد سے ہو مثلاً جھوٹی گواہی وغیرہ۔''(۴)

---

(۱)امام راغب اصفہانی،،مترجم مولانا محمد عبدہ،مفردات القرآن (لاہور:اہل حدیث اکادمی ۱۹۷۱ء) ج:۱،ص:۳،۵۷۴،۵۷، ج:۲،ص:۹۰۱،۹۰۲

(۲)امام راغب اصفہانی،،مترجم مولانا محمد عبدہ،مفردات القرآن (لاہور:اہل حدیث اکادمی ۱۹۷۱ء) ج:۱،ص:۴۴۲

(۳)**صحیح البخاری،کتاب الشهادات،باب ما قیل فی شهادة الزور،رقم :۲۵۱۱**

(۴)مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ،بیان القرآن (ملتان:ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۵۱۷

مفتی محمد شفیعؒ **قَوۡلَ الزُّوۡرِ** کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"**قَوۡلَ الزُّوۡرِ** سے جھوٹ مراد ہے، حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے خواہ عقائد فاسدہ شرک و کفر ہوں یا معاملات میں اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔" (۵)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ الفاظ عام ہیں، جن سے ہر جھوٹ، بہتان اور جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس سلسلہ کلام میں خاص طور پر اشارہ ان باطل عقائد، احکام، رسوم اور اوہام کی طرف ہے جن پر کفر و شرک کی بنیاد ہے۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں اس کے بندوں کو حصہ دار بنانا وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ اور پھر وہ جھوٹ بھی اس فرمان کی براہ راست زد میں آتا ہے جس کی بنا پر مشرکین عرب بحیرہ اور سائبہ اور حام وغیرہ کو حرام قرار دیتے تھے۔" (۶)

اللہ پر جھوٹ گھڑنا کافروں کی برائی تھی جسے قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا يَفۡتَرِى الۡكَذِبَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ (النحل ۱۶:۱۰۵)

بے شک

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُكُمُ الۡكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ۔اِنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ لَا يُفۡلِحُوۡنَ (النحل ۱۶:۱۱۶)

-اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

قول الزور سے بچنے کے حکم میں جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی شامل ہیں۔ جھوٹی گواہی کے بارے صحیح حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عُدِلت شهادة الزور بالاشراك باللّٰه

جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے ۔(۷)

آج ایک اسلامی معاشرے میں بھی جھوٹی گواہی دینا معمول بن چکا ہے۔ اسے گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ عدالتوں میں اکثر جھوٹی گواہیاں دی جاتی ہیں۔ اس حدیث میں کتنی وضاحت سے فرما دیا گیا کہ جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر گناہ ہے۔ شرک کی طرح یہ بھی ظلم عظیم ہے اور اس کی بھی معافی نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی "**وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ**" کی تفسیر میں اس حدیث کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

---

(۵) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۶، ص:۲۶۳

(۶) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص:۲۲۲

(۷) مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ،كتاب الامارة و القضاء، باب الاقضية و الشهادات ،رقم :۳۷۷۹

آپؐ نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔ اسلامی قانون میں یہ جرم مستلزم تعزیر ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا فتوی یہ ہے کہ جو شخص عدالت میں جھوٹا گواہ ثابت ہو جائے، اس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔ یہی حضرت عمرؓ کا قول اور فعل بھی ہے۔ مکحول کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں، اس کا سر مونڈا جائے اور منہ کالا کیا جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔''

عبداللہ بن عامرؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں ایک شخص کی گواہی جھوٹی ثابت ہو گئی تو انہوں نے اس کو ایک دن برسر عام کھڑا رکھ کر اعلان کرایا کہ یہ فلاں بن فلاں جھوٹا گواہ ہے، اسے پہچان لو، پھر اس کو قید کر دیا۔ موجودہ زمانے میں ایسے شخص کا نام اخبارات میں نکال دینا تشہیر کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔ (۸)

غرض جھوٹ ایک اخلاقی برائی اور کبیرہ گناہوں میں سے بڑا گناہ ہے۔ انسانی عادات میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ جھوٹ زبان سے بولا اور عمل سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ چونکہ تمام انسانی اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حقیقت کے مطابق ہوں، جبکہ جھوٹ اس کا الٹ ہے۔ اس لیے یہ برائی تمام قولی اور عملی برائیوں کی بنیاد ہے۔ انسان کا راز جو اس کے سینے میں موجود ہے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا شخص صرف ایک ہی صورت میں معلوم کر سکتا ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان سے بتا دے یا اپنے عمل سے ظاہر کر دے۔ اب وہ اگر اپنی اندرونی بات یا کیفیت کو غلط اور واقعہ کے خلاف ظاہر کرتا ہے تو وہ لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے جو کہ جھوٹ ہے۔

قرآن عظیم میں جھوٹے پر لعنت کی گئی ہے۔ جھوٹا بعض مرتبہ ثواب کے لیے قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن قرآن اس پر لعنت کر رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن جن پر لعنت کرتا ہے ان میں وہ بھی شامل ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہے جو اللہ کی رحمت سے محروم کر دیے گئے۔ اس لیے کہ لعنت سے مراد اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی ہے۔ ہمیں جھوٹ کی تمام اقسام سے اجتناب کرنا چاہیے۔ منافقت جھوٹ کی سب سے بڑی قسم ہے۔ عقیدے کے اندر جھوٹ بولنے والا اعتقادی منافق کہلاتا ہے۔ اسی طرح منافقوں جیسے اعمال (جن میں جھوٹ بولنا بھی شامل ہے) اختیار کرنے والا عملی منافق کہلاتا ہے۔ اسی طرح جھوٹی قسم اٹھانے اور جھوٹی گواہی دینے سے بھی اجتناب کیا جائے۔ کسی پر جھوٹا الزام یا بہتان نہ لگایا جائے۔ مختصر یہ کہ جس پر بھی جھوٹ کا اطلاق ہوتا ہو، اس سے بچنا چاہیے۔ جھوٹ کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ مسلمان کی یہ شان کے خلاف ہے کہ وہ بات بات پر جھوٹ بولے۔ کیونکہ مومن بزدل اور بخیل تو ہو سکتا ہے لیکن مومن کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اللہ اور اس کے نبی کی طرح ہر بات میں سچائی کو اختیار کرنا چاہیے۔

---

(۸) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص:۲۲۲، ۲۲۳

۳۔فضول خرچی کی ممانعت

ایسا خرچ کرنا جس کا کوئی دینی یا دنیاوی مقصد اور فائدہ نہ ہو فضول خرچی کرنا کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں بسنت کے تہوار پر پتنگوں پہ پیسہ خرچ کرنا ،شب برات کو پٹاخوں پہ پیسہ خرچ کرنا ، بے حیائی اور برائی کے کاموں میں اپنی عیاشی کے لیے پیسہ خرچ کرنا وغیرہ فضول خرچی کی مختلف صورتیں ہیں ۔قرآن عظیم نے فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔اسی سے اس عمل کی قباحت معلوم ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فضول خرچی سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمَسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا o اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶، ۲۷)

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو (ان کا حق)اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں نہ اڑاؤ یقین جانو کہ جو لوگ بے ہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ ''اسراف''اور''تبذیر'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے فضول خرچی کے لیے اسراف اور تبذیر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں''کسی معصیت یا بے موقع ، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے۔بعض حضرات کے نزدیک کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع ، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے اس کو اسراف کہتے ہیں ۔اس لیے تبذیر بہ نسبت اسراف کے اشد ہے۔مبذرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ''غیر حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے۔''

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا:

''اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لیے خرچ کر دے تو وہ تبذیر نہیں اور اگر باطل کے لیے ایک مدّ (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔''

امام مالکؒ نے فرمایا:

''تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلاف حق خرچ کر ڈالے اور اس کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام ہے۔''

امام قرطبیؒ نے فرمایا:

حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تبذیر میں داخل ہے۔ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں*۔''(۱)

---

*مفتی محمد شفیعؒ نے درج بالا تمام اقوال امام قرطبیؒ کی تفسیر'' **الجامع لا حکا م القرآن**'' سے لیے ہیں۔

(۱) مفتی محمد شفیع ،معارف القرآن (کراچی ،ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵،ص:۴۵۸

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

''حد سے تجاوز کرنا'' وسیع مفہوم کا حامل ہے۔حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔اللہ کو یہ تینوں باتیں ناپسند ہیں۔''(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا:

''جب ہر صاحب مال کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہوئے تو اس کو اللے تللے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہوسکتی۔پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ احتیاط واعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرے اور بقیہ مال کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو دوسرے حقداروں کا امین سمجھے اور اس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔جو شخص اپنی ضروریات کے معاملے میں محتاط اور اور کفایت شعار نہیں ہوگا اس کو اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ہوگی تو دوسروں کے حقوق کہاں سے ادا کر پائے گا۔''

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ:

''جو لوگ فضول خرچ ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔جن لوگوں کو اللہ اپنی نعمت دیتا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمت کے شکر گزار رہوں اور اس کو انہی کاموں میں صرف کریں جو اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے موجب ہوں۔لیکن شیطان ان کو ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور خدا کا بخشا ہوا مال ان سے ان کاموں پر خرچ کراتا ہے، جو ان کو خدا سے دور سے دور تر اور شیطان سے قریب سے قریب تر کردیں۔''(۳)

مولانا امین احسن اصلاحی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''خدا کو تمہاری خستہ حالی اور فاقہ کشی اور طیبات رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجالانے کے لیے یہ کسی درجہ میں بھی مطلوب ہو۔بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے عمدہ لباس پہنو اور پاک رزق سے فائدہ اٹھاؤ۔اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے خواہ یہ تجاوز حلال کو حرام لینے کی شکل میں ہو، یا حرام کو حلال لینے کی شکل میں۔''(۴)

غرض انسان کو عطا کیا گیا مال اس کے پاس ایک امانت ہے۔قیامت کے دن اس مال کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔اسلام میں فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے۔فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔فضول خرچی کے لیے قرآن میں اسراف اور تبذیر کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔جائز کاموں میں حد سے بڑھنا اسراف جبکہ ناجائز کاموں میں حد سے بڑھنا تبذیر کہلاتا ہے۔اسلام نے خرچ کے سلسلہ میں اپنے پیروکاروں کو اعتدال اور درمیانی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔میانہ روی سے انسان تنگ دست نہیں ہوتا۔

---

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۴۹۹، ۵۰۰

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴،ص:۴۹۸

(۴) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲،ص:۲۲، ۲۳

قرآن عظیم میں اللہ رب العزت اسراف سے بچنے کا حکم ارشاد فرماتے ہیں:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف۷:۳۱)

کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو بے شک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے یہاں اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے:

''یہ آیت زمانہ جاہلیت کے عربوں کی اس بری رسم کو ختم کرنے کے لیے نازل ہوئی کہ وہ ایام حج میں اچھی غذا کھانے پینے کو گناہ سمجھتے تھے، لیکن عموم الفاظ سے یہاں بھی بہت سے احکام و مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ کھانا پینا شرعی حیثیت سے بھی انسان پر فرض و لازم ہے باوجود قدرت کے کوئی شخص کھانا پینا چھوڑ دے یہاں تک کہ مر جائے یا اتنا کمزور ہو جائے کہ واجبات بھی ادا نہ کر سکے تو یہ شخص عنداللہ مجرم و گناہگار ہوگا۔ آیت کے آخری جملہ **ولا تسرفوا** سے ثابت ہوا کہ کھانے پینے کی تو اجازت بلکہ حکم ہے مگر ساتھ ہی اسراف کرنے کی ممانعت ہے، اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، پھر حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جائے اور حرام چیزوں کو کھانے پینے اور برتنے لگے اس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلا وجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دے، جس طرح حرام کا استعمال جرم و گناہ ہے اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانون الٰہی کی مخالفت اور سخت گناہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے پیئے، اسی لیے فقہاء نے پیٹ بھرنے سے زائد کھانوں کو ناجائز لکھا ہے۔ نیز یہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت و اختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے۔

سلف صالحین نے اس بات کو اسراف میں داخل قرار دیا ہے کہ آدمی ہر وقت کھانے پینے کے دھندے میں مشغول رہے یا اس کو دوسرے اہم کاموں میں مقدم جانے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا مقصد زندگی یہی کھانا پینا ہے، انہی حضرات کا مشہور مقولہ ہے ''کھانا اس لیے ہے کہ زندگی قائم رہے، یہ نہیں کہ زندگی کھانے پینے ہی کے لیے ہو۔

خلاصہ یہ کہ **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا** کے کلمات سے آٹھ مسائل شرعیہ نکلے۔ اول یہ کہ کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے، دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کی حرمت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز حلال ہے، تیسرے یہ کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ممنوع کر دیا ان کا استعمال اسراف اور ناجائز ہے، چوتھے یہ کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں ان کو حرام سمجھنا بھی اسراف اور سخت گناہ ہے۔ پانچویں یہ کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اور کھانا ناجائز ہے، چھٹے یہ کہ اتنا کم کھانا جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے۔ ساتویں یہ کہ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بھی اسراف ہے، آٹھویں یہ کہ جب کبھی کسی چیز کو جی چاہے تو ضروری ہی اس کو حاصل کرے۔ (۵)

فضول خرچ دوسرے انسانوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ شیطان ان کو خواہشات کے جال میں پھنسا کر انہیں اپنی خواہشات کا غلام بنا دیتا ہے۔ سارا مال راہ خدا میں خرچ کرنے سے بھی منع کیا گیا کیونکہ ایک شعبہ میں اسراف سے دوسرے شعبہ میں کوتاہی کا سبب بنتا ہے۔ اگر سارے پیسے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں تو اہل و عیال، رشتہ دار اور خود اپنے نفس کے حقوق کیسے ادا کیے جائیں گے۔ اس لیے انفاق فی سبیل اللہ میں بھی اعتدال کا حکم ہے۔

---

(۵) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۳، ص:۵۴۴-۵۴۷

۴۔بخل

شریعت اسلامی میں بخل کے معنی ہیں کہ ''جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے۔'' اسی لیے بخل حرام ہے اور اس پر جہنم کی سخت وعید سنائی گئی ہے۔ جن مواقع پر خرچ کرنا مستحب ہے وہ بخل کی اس حرام صورت میں داخل نہیں۔ عام معنی کے اعتبار سے اسے بخل کہتے ہیں۔ بخل کے لیے ''**شح**'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔''**شح**'' سے مراد واجب خرچ کا ادا نہ کرنا اور مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا رہنا ہے۔

وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ هُوَ خَيۡرًا لَّهُمۡ‌ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ‌ؕ سَيُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ؕ وَلِلّٰهِ مِيۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ (آل عمران ۳:۱۸۰)

اور وہ لوگ ہرگز یہ خیال نہ کریں، جو اس (مال) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا کہ وہ بہتر ہے ان کے لیے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے۔ جس مال میں انہوں نے بخل کیا عنقریب قیامت کے دن طوق (بنا کر) پہنایا جائے گا اور اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ''مذمت بخل'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''سلسلہ کلام چونکہ جہاد کے بارہ میں تھا جس سے منافقین جان چراتے تھے اسی طرح جہاد میں مالی امداد سے بھی جان چراتے تھے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے تھے۔ اس لیے آئندہ آیت میں بخل کی مذمت بیان فرماتے ہیں اور ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جو اس چیز میں بخل کرتے ہیں کہ جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی ہے کہ یہ بخل ان کے لیے بہتر ہوگا بلکہ یہ ان کے لیے بہت ہی برا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی چیز میں سے کچھ تھوڑی سی چیز بھی خدا کے نام پر دینا ان کو گراں گزرتا ہے قیامت کے دن ان کے گلے میں اس مال کا طوق ڈالا جائے گا۔ جس پر انہوں نے بخل کیا تھا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہ دے گا اس کا مال اژدھا بن کر گلے میں پڑے گا اور اس کے گلے کو چیرے گا اور اللہ ہی کے لیے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی یعنی تم سب فانی ہو بقاء صرف اسی کے لیے ہے تم سب مر جاؤ گے اور مال اور ملکیت سب یہیں چھوڑ جاؤ گے چاہے تم اس کو زکوٰۃ دو یا نہ دو سب مال اسی کا ہو کر رہے گا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے کچھ دے جاؤ تا کہ تمہیں ثواب مل جائے اپنی ملکیت کے دھوکہ میں نہ رہو۔ تم بھی فانی اور تمہاری ملکیت بھی فانی اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے وہ تمہارے بخل سے بھی باخبر ہے، اس کی سزا سے تم بچ نہیں سکتے۔ یہ مال جس کی زکوٰۃ دینے میں تم بخیل بن گئے ہو قیامت کے دن یہی مال و دولت ایک ایسے کالے اور زہریلے سانپ کی صورت میں ظاہر ہوگا کہ زہر کی شدت اور حدت کی وجہ سے اس کے سر پر بال نہ ہوں گے وہ تمہارے دونوں کلّے پکڑ کر کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں اور میں تیرا خزانہ ہوں یعنی وہی مال ہوں جس پر تو فخر اور ناز کرتا تھا اور پھر اس کو ڈسے گا۔''(۱)

انسان کو جو کچھ بھی عطا کیا گیا ہے اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ تمام چیزیں عارضی طور پر انسان کے تصرف میں دے دی گئی ہیں۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ اس عارضی تصرف کے دوران اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا بیوقوفی ہے۔ اسی کو بخل کہا جاتا ہے جو قیامت کے دن انسان کے لیے عذاب کا باعث بن جائے گا۔ اس لیے اللہ کے حکم کے مطابق تمام امانتوں کو اسی کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۱۰۵، ۱۰۶

بخل کی تعلیم دینے والوں اور اللہ کے فضل کو چھپانے والوں کے لیے ذلیل کر دینے والا عذاب ہے۔اس بارے ارشادالٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا(النسآء ۴:۳۷)

اس آیت کا ترجمہ اور مختصر تفسیر بیان کرتے ہوئے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''بخل کی تعلیم کرتے ہوں (خواہ زبان سے یا اس طرح سے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے یہی تعلیم پاتے ہیں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالی نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے (اس سے مراد مال و دولت ہے جبکہ بلا مصلحت حفاظت کے محض بخل کی وجہ سے چھپا دے کہ اہل حقوق ان سے توقع ہی نہ کریں یا مراد علم دین ہے کہ یہود اخبار رسالت کو چھپایا کرتے تھے، پس بخل بھی عام ہو جائے گا، پس اس میں بخلاء ومنکرین رسالتؐ دونوں آ گئے) اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے (جو نعمت مال یا نعمت بعثت رسولؐ کی حق شناسی نہ کریں) اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔''(۲)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں

''ایسے لوگ جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے پر آمادہ کرتے ہیں :یقیناً ایسا رویہ اللہ اور اس کے احکام سے روگردانی کرنا ہے۔جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑے گا تو اس کو اپنے انجام سے آگاہ ہونا چاہیے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہر خوبی کے ساتھ موصوف ہے۔اس کو کسی کی نافرمانی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور نہ ہی اس کو کسی کی فرمانبرداری کی ضرورت ہے۔اس لیے کسی بھی انسان کو اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں اور مال و دولت پر مغرور و متکبر نہیں ہونا چاہیے اور نہ شیخی اور بڑائی جتلانی چاہیے اور جو کچھ اللہ نے مال عطا کیا ہے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔نہ یہ کہ بخل کرے بلکہ اور ظلم یہ کہ دوسروں کو بھی بخل پر آمادہ کرے تو اس سے بڑھ کر انسان کے واسطے کوئی برائی نہیں ہو سکتی۔ساتھ ہی اس کو یہ بھی عقیدہ قلب کی گہرائیوں میں راسخ کر لینا چاہیے کہ ہر راحت اللہ کا انعام ہے۔اس وجہ سے اس پر شکر گزار ہو اور ہر تکلیف و مصیبت خدا ہی کے فیصلہ سے ہے،اس لیے اس پر صبر و استقامت چاہیے اور خدا ہی سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رجوع کرنا چاہیے کہ اس کی بارگاہ میں تضرع و زاری اور دعا و التجا میں مشغول ہو نہ یہ کہ بے صبری اور بے قراری اختیار کر لے۔''(۳)

مولانا امین احسن اصلاحی ''اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دکھا رکھا ہے'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ بخیل مالداروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔بخیل مالداروں کی خواہش ایک طرف یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے، دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب وسائل کے سامنے اپنے وسیع

---

(۲) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۳۵۰

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۷،ص:۶۶۹، ۶۷۰

اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت کا دکھڑا روتے رہتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ہے تو یہ شخص غنی دریا دل لیکن بے چارہ کیا کرے، بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اس کے پاس بچتا بچاتا کچھ بھی نہیں ہے۔'' (۴)

غرض بخل کا اطلاق مالی حقوق کے اندر کوتاہی کرنے پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں لفظ بخل عام ہے جس میں مال اور علم میں بخل کرنا شامل ہے۔ وہ شخص بخیل کہلائے گا جو حقوق العباد کو ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص اپنے ذاتی معاملے میں تنگی کرتا ہے لیکن دوسروں کے حقوق کھلے دل سے ادا کرتا ہے وہ بخیل نہیں۔ بخل کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان اپنے مال واسباب کو اللہ کی عطا سمجھنے کی بجائے اپنی محنت یا صلاحیت کا نتیجہ سمجھے۔ اس لیے وہ اپنے رب کا شکر ادا نہیں کرتا جو سخاوت کا اصل محرک ہے۔ بخیل آدمی اپنے بخل کو چھپانے کے لیے دوسروں کو بخل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تا کہ اس کا بخل ظاہر نہ ہو۔ اللہ کے فضل کو چھپانے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے رہے جیسے اللہ نے اس پر فضل ہی نہیں کیا۔ نہ ہی اپنی ضروریات پوری کرے، نہ اپنی اولاد پر خرچ کرے، نہ غریبوں مسکینوں کو مال دے، نہ ہی نیک کاموں میں حصہ لے۔ لوگ اس کی ظاہری حالت پر افسوس کریں تو یہ اللہ تعالی کی ناشکری ہے۔ اللہ رب العزت انسان سے سارے مال کا مطالبہ اس لیے نہیں کرتا کہ کہیں اس کا بخل ظاہر نہ ہو جائے۔ ارشاد الہی ہے

اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (محمد ۴۷:۳۷)

اگر وہ تم سے مال طلب کرے پھر تم سے چمٹ جائے (طلب ہی کرتا رہے) تو تم بخل کرو اور ظاہر ہو جائیں تمہاری (دلی) عداوتیں۔
مولانا ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اگر وہ تم کو عطا کیے گئے مال میں سے سوال کرے جس کا اس کو حق ہے پھر تم کو تنگ اور مجبور کیا جائے کہ کل مال ہی دینا ضروری ہے تو تم بخل کرنے لگو گے اور اس صورت میں اللہ تعالی تمہارے دل میں چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دے۔ مال کی محبت، تنگ دلی اور بخل جو انسان کی فطری کمزوری سے اس کے اندر چھپا ہوا ہوتا ہے تو کل مال طلب کرنے میں بہت سے لوگوں کے یہ مخفی عیب ظاہر ہوتے۔ صرف چند ہی با کمال مردان خدا ایسے ہوتے جو اپنا سب کچھ سمیٹ کر لے آتے اور صدیق اکبرؓ کی طرح کہہ دیتے جو کچھ تھا سب لے آیا اور گھر والوں کے واسطے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ اس لیے اللہ کا یہ کس قدر احسان عظیم ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ جو درحقیقت خود انسان کے واسطے باعث خیر و فلاح اور برکت ہے اس میں سے صرف تھوڑے سے مال کو طلب کرتا ہے اور اس صورت سے ان کی کوتاہیوں اور عیوب کی پردہ پوشی فرمانے والا ہو۔'' (۵)

جیسے شکر کا فائدہ شکر کرنے والے کو ہوتا ہے اسی طرح جو شخص بخل کرتا ہے تو اس بخل کرنے کا نقصان بخل کرنے والے کو ہو گا۔ ارشاد الہی ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (محمد ۴۷:۳۸)

ہاں تم ہی وہ لوگ ہو، تمہیں پکارا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو، پھر تم میں سے کوئی ایسا ہے جو بخل کرتا ہے اور جو بخل کرتا ہے تو اس کے سوا نہیں کہ وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے، اور اللہ بے نیاز ہے اور تم (خود اس کے) محتاج ہو اور اگر تم

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲، ص:۲۹۹

(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۷، ص:۴۳۴

روگردانی کروگے تو وہ تمہارے سوا (تمہاری جگہ) کوئی دوسری قوم بدل دے گا اور وہ تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔

یہ ان منافقوں کی حالت پر افسوس کا اظہار ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل کر رہے ہو۔ گویا کسی اور کو دے رہے ہو۔ حالانکہ اللہ سے بخل کرنا خود اپنے سے بخل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے لیے نہیں مانگتا بلکہ تمہارے ہی لیے مانگتا ہے۔ وہ اس کے صلہ میں تم کو جنت کی ابدی زندگی عطا کرے۔ اللہ بالکل بے نیاز ہے، اگر محتاج ہو تو تم ہو، اللہ محتاج نہیں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''خبردار ہو جاؤ تم ایسے ہو کہ تم کو جب دعوت دی جاتی ہے اس بات کے لیے کہ تم خرچ کرو اللہ کی راہ میں تو کچھ لوگ تم میں سے وہ ہوتے ہیں کہ جو بخل کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو شخص بھی بخل کرے گا وہ حقیقت میں اپنے ہی لیے بخل کر رہا ہے اس لیے کہ اس بخل کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا اور جو برکات وفوائد انفاق فی سبیل اللہ پر مرتب ہوتے ان سے اپنے آپ ہی کو محروم کر دینے والا ہوگا اور اللہ تو بے نیاز ہے اسے کسی کی حاجت نہیں اور نہ کسی کے خرچ کا وہ محتاج ہے اور تم ہی محتاج ہو اللہ رب العزت کے حتیٰ کہ تم اپنے وجود اور بقاء حیات میں سراپا احتیاج ہو اور ایک لمحہ کے لیے بھی خدا سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اور اگر احکام خداوندی کی فرمانبرداری میں پس وپیش کریں اور مال ودولت کی محبت میں اور انفاق فی سبیل اللہ کا فرض انجام دینے میں کوتاہی کریں تو خدا کا دین کسی جماعت پر موقوف نہیں کہ بس وہی دین خدا کی حفاظت واعانت کر سکتے ہیں ان کے سوا اور کوئی یہ کام انجام نہیں دے سکتا، یہ خیال باطل ہے وہ اپنی حکمت سے جس قوم اور طبقہ کو چاہے اقامت دین اور **اعلائے کلمة الله** کے لیے منتخب کر لے۔''(۶)

ایسا شخص بھی بخیل ہے جو اپنی عیاشیوں پر تو خرچ کرتا ہے لیکن اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی o وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی oفَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی oوَمَا يُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (اللیل ۹۲:۸-۱۱)

اور جس نے بخل کیا اور بے پروار ہا اور جھٹلایا اچھی بات کو پس ہم عنقریب اس کے لیے دشواری آسان کر دیں گے اور اس کا مال اس کو فائدہ نہ دے گا جب وہ نیچے گرے گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس جگہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی وبھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش وآرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال لٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام ونمود، حکام رسی یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ ودو اور محنت وکوشش کا مقصود بنا لے اور خدا سے بالکل مستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کا جھٹلانا تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے۔

یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کی راہ پر

---

(۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج: ۷، ص: ۴۲۴، ۴۲۵

چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی، برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جائیں گے۔اسی کے اسباب اور وسائل اس کے لیے فراہم کردیے جائیں گے، بدی کرنا اس کے لیے آسان ہوگا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک روز اسے بہر حال مرنا ہے اور وہ سب کچھ دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے جسے اس نے یہاں اپنے عیش کے لیے فراہم کیا تھا۔اگر اپنی آخرت کے لیے کچھ کما کر ساتھ نہ لے گیا تو یہ مال اس کے کس کام آئے گا؟ قبر میں تو وہ کوئی کوٹھی، کوئی موٹر، کوئی جائداد اور کوئی جمع پونجی نہیں لے کر جائے گا۔''(۷)

بخل کا ایک انداز وہ بھی ہے جسے قرآن نے **وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْن (الماعون ۱۰۷:۷)** کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔سید ابوالاعلی مودودی ''ماعون'' کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ ماعون چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے لیے کوئی منفعت یا فائدہ ہو۔اس معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ بھی ماعون ہے، کیونکہ وہ بہت سے مال میں سے تھوڑا سا مال ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے دینا ہوتا ہے اور وہ دوسری عام ضرورت کی اشیاء بھی ماعون ہیں۔جن کا ذکر عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ماعون کا اطلاق ان تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہوتا ہے جو عادتاً ہمسایے ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں ۔ان کا مانگنا کوئی ذلت کی بات نہیں ہوتا، کیونکہ غریب اور امیر سب ہی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے ۔البتہ ایسی چیزوں کو دینے سے بخل برتنا اخلاقاً ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا ہے۔عموماً ایسی چیزیں بجائے خود باقی رہتی ہیں اور ہمسایہ ان سے کام لے کر انہیں جوں کا توں واپس سے دیتا ہے۔اسی ماعون کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں مہمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے چارپائی یا بستر مانگ لے یا کوئی اپنے ہمسائے کے لیے تنور میں اپنی روٹی پکا لینے کی اجازت مانگے ،یا کوئی کچھ دنوں کے لیے باہر جارہا ہو اور حفاظت کے لیے اپنا کوئی قیمتی سامان دوسرے کے ہاں رکھوانا چاہے۔پس آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آخرت کا انکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنا دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے معمولی ایثار کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔''(۸)

اللہ رب العزت بخل کے بھیانک انجام سے آگاہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔(التوبة۹:۳۴،۳۵)

اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ،سوانہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دو (آگاہ کردو)۔جس دن ہم اسے دہکائیں گے جہنم کی آگ میں، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، اور ان کے پہلوؤں، اور ان کی

---

(۷) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۳۶۲،۳۶۳

(۸) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۶، ص:۴۸۶

پیٹھوں کو داغا جائے گا کہ یہ ہے وہ جوتم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا، پس مزہ چکھو جوتم جمع کر کے رکھتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی جامع تفسیر اس طرح کرتے ہیں:

''اگرچہ اس ٹکڑے میں اشارہ انہی زر پرستوں (علمائے یہود ونصاری) کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزر الیکن اس کا اسلوب بیان عام تعلیم کا ہے کہ جو لوگ بھی دولت جمع کریں گے اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کریں گے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔اس تعلیم کا واضح مدعا یہی ہے کہ دولت جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔خدا کی راہ سے مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہو چکی ہے وہ تمام مصارف خیر ہیں جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں یا بلواسطہ یا بلا واسطہ کے تحت آتے ہیں۔ یہ بات یہاں پیش نظر رکھنے کی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ مالک نصاب ہوتے ہیں زکٰوۃ نہیں دیں گے۔ان کے لیے یہ وعید ہے بلکہ یہ فرمایا کہ جو لوگ مال ودولت ذخیرہ کریں گے اور اس کو راہ خدا میں خرچ نہیں کریں گے ان کے لیے یہ وعید ہے۔انفاق فی سبیل اللہ ایتائے زکٰوۃ سے الگ چیز ہے۔ ہر صاحب مال سے اللہ تعالی کے دو مطالبے ہیں:

ایک یہ کہ وہ اپنے مال کی زکٰوۃ ادا کرے، دوسرا یہ کہ وہ اپنا مال سینت کر رکھنے کی بجائے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پہلا مطالبہ قانونی ہے اور ایک اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر شہری سے زکٰوۃ اگر محسوس کرے، بجبر وزور وصول کرے۔دوسرا مطالبہ اگرچہ جبروزور کے ذریعہ سے پورا نہیں کرایا جاسکتا بلکہ یہ صاحب مال کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے لیکن اللہ کے ہاں آدمی کے درجہ ومرتبہ کا اصل انحصار اسی آزادانہ اور رضا کارانہ انفاق پر ہے ۔اسی انفاق سے آدمی کے ایمان کو جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر آئے ہیں، ثبات واستحکام حاصل ہوتا ہے، یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے ،اسی سے نور قلب میں افزونی ہوتی ہے۔اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بےکسوں، ناداروں سے بے پروار ہے یا دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عنداللہ مواخذہ اور مسئولیت بری نہیں ہوسکتا اگرچہ اس نے اپنے مال کا قانونی مطالبہ پورا کر دیا ہو۔

اسی سورہ (التوبہ) میں ان منافقین کا بیان آئے گا جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے تھے۔قرآن نے ان کی اس زر پرستی کو ان کے نفاق کی دلیل قرار دیا ہے اور نہایت ہی سخت الفاظ میں ان کو وعید سنائی ہے۔زکٰوۃ تو وہ طوعاوکرہا بہر حال ادا کرتے ہی تھے۔نہ ادا کرتے تو تلوار کے زور سے ادا کرتے۔ان کا اصلی جرم یہی تھا کہ وہ مالدار ہونے کے باوجود جہاد کے لیے انفاق سے جی چراتے تھے اور جہاد کے لیے انفاق سے جی چرانا علامات نفاق میں سے ہے بلکہ بعض حالات میں تو یہ نہایت غلیظ قسم کا نفاق بن جاتا ہے جس کے ساتھ ایمان جمع ہو ہی نہیں سکتا۔

بعض لوگ بعض صحابہؓ کی دولت مندی کو مثال میں پیش کر کے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ ادائیگی زکوۃ کے ساتھ دولت جمع کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔صحابہؓ میں جو لوگ دولت مند تھے ان کی دولت مندی کاروباری اور تجارتی نوعیت کی تھی۔ جائز کاروبار اور تجارت میں سرمایہ لگانا اور اس کو بڑھانا کنز نہیں بلکہ اکتساب دولت ہے اور اسلام میں کوئی مذموم فعل نہیں بلکہ ایک محمود فعل ہے۔اگر ایک شخص ایک جائز کاروبار میں سرمایہ لگائے، حلال راستوں سے روپیہ کمائے، اسراف اور بخل دونوں سے پرہیز کرتا ہوتا اپنی ضروریات پر خرچ کرے، اپنے مال کی زکوۃ نکالے اور اپنی فاضل دولت سرا اور اعلانیۃ اللہ کی راہ میں اپنی مرضی سے خرچ کرے تو وہ اسلامی معاشرہ کا ایک سچا خدمت گزار اور آخرت میں اللہ کا مقبول بندہ ہے ۔صحابہؓ میں سیدنا عثمانؓ ایسے ہی دولت مند تھے اور دوسرے اصحاب کی دولت مندی بھی اسی نوعیت کی تھی۔عثمان غنیؓ کی دولت سے مسلمانوں کو جو فائدے پہنچے اس سے کون انکار کرسکتا ہے؟ پھر یہ بات کس طرح باور کی جاسکتی ہے کہ یہ غنی دریا دل اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنی انفاق کی عادت مستمرہ کے خلاف دولت جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا ہوگا۔

لیکن یہ خوب یاد رکھیے کہ یہ انفاق زکٰوۃ کی طرح کوئی قانونی اور جبری چیز نہیں بلکہ اختیاری چیز ہے اور اس کے اختیاری ہونے ہی میں اس کی ساری برکتیں ہیں۔ایک اسلامی معاشرہ میں یہ چیز ہر صاحب مال سے مطلوب ہے لیکن بالجبر نہیں بلکہ بالرضا۔ یہ حکومت کے فرائض میں ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر لوگوں کے اندر دولت کی ذخیرہ اندوزی کی بیماری نہ پھیلنے دے بلکہ برابر اپنے تمام ترغیبی وتعلیمی ذرائع سے لوگوں کے جذبہ انفاق کو ابھارتی

اوراکساتی رہے۔اس کا سب سے زیادہ کارگراورموثر طریقہ یہ ہے کہ جولوگ اولوالامر کے درجہ پرفائز ہوں وہ خودمعیارزندگی متوسطانہ رکھیں اوردوسروں کوبھی اسی کی تعلیم دیں بلکہ ان رجحانات کی شدت سے حوصلہ شکنی کریں جولوگوں کومعیارزندگی اونچا کرنے کے تنافس میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

راہ خدا سے بچا اور چرا کر جو دولت جمع کی جاتی ہے وہ قیامت کے دن پیشانی کا داغ اور پہلو اور پیٹھ کا زخم بنے گی۔دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے۔ایک ہم چشموں میں اپنا سرا ونچار کھنے کی خواہش دوسری اپنے ذاتی آرام وراحت کی طلب۔فرمایا کہ جولوگ دنیا میں سربلندی اورفخر کی خاطر دولت دولت جمع کریں گےان کی دولت بروز قیامت ان کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔اسی طرح جولوگ نرم وپشمین و مخملیں گدوں،غالیچوں،قالینوں اورصوفوں کے درپے ہوکرانفاق کی سعادت سےمحروم رہیں گےان کی یہ بچائی ہوئی دولت ان کے پہلوؤں اوران کی پیٹھوں کوزخمی کرے گی۔''(۹)

غرض بخل ایک اخلاقی بیماری ہے۔اپنی ضرورتوں کووسائل کے ہوتے ہوئے بھی پورا نہ کرنا بخل ہے۔اسی طرح راہ خدا میں واجبی صدقات ادا نہ کرنا بھی بخل ہے۔قرآن مجید نے منافقوں کی صفت بیان کی ہے کہ وہ مال میں بخل کرتے ہیں۔بخل کرنے کا نقصان اس کی ذات کو ہوتا ہے۔معاشرتی سطح پراسے پسندنہیں کیا جاتا اورآخرت کا نقصان اس کےعلاوہ ہے۔اس کے مال کوگرم کرکے اسے داغا جائے گا کہ یہی وہ مال ہے جسےتوخزانہ بناتا تھااور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا تھا۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ بخل اوراس کےنقصانات سے بچائے۔امین

---

(۹)مولانا امین احسن اصلاحی،تدبرقرآن(لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء)ج:۳،ص:۵۶۳-۵۶۵

۵۔ قتل اولاد

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام۶:۱۵۱)

اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"املاق" کے معنی فقر و تنگ دستی کے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں خشیۃ املاق کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس اندیشہ سے اولاد کیا کھائے گی کہاں سے اس کی پرورش ہوگی اس کو قتل نہ کرو۔ اہل عرب میں قتل اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا، جس کا ذکر اسی سورۃ میں پیچھے گزرا ہے، دوسری صورت بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فاقے کے اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ سنگدلانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آجاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مصائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اصلاً وہ اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں وہ اپنے امکان کی حد تک ادا کرے۔ لیکن ایک لمحے کے لیے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں یہ وہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہوا کھاتا پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشے سے قتل کرے کہ میں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں)۔

خاندانی منصوبہ بندی: افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرہ اختیار اور اپنے فطری و شرعی حدود کار سے بڑھ کر قدرتی حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں۔ حد سے بڑھنے کے نتیجے میں وہ خالق کے لیے کوئی مفید کام کرنے کی بجائے اپنی صلاحیتیں نظام قدرت سے زور آزمائی میں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کے لیے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائل معاش کو ترقی دینے کے لیے، بحر و بر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشہ کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے، یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرائض میں سے ہے کہ وہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ، اجتماعی ہو یا خاندانی، احتیاط، اعتدال، کفایت شعاری، صحت، صفائی اور محنت کی تربیت دے۔ لیکن یہ امر بالکل اس کے دائرہ اختیار اور حدود کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی مزید ناخواندہ مہمان نے ہماری نپی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلہ گھونٹ دیں گے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگدلوں کو لاحق ہوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انہیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو دمبدم اولاد میں کیوں اضافہ کیے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولادوں کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانے کے متمدن انسان کو بھی یہ برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیار زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح اٹھا لیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی سکیم بنا ڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں، عرب اجڈ اور گنوار تھے اس وجہ سے انہوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی، موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس وجہ سے

اس نے ایک خوبصورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈ نکالا ہے لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انہوں نے بھی رزاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزاق اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ رزاق اللہ تعالی ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کر دی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے، مان بھی گئے لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے۔(۱)

دوسری جگہ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا

(بنی اسرائیل ۱۷:۳۱)

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مار ڈالو ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو، بے شک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''املاق کے معنی مفلسی اور ناداری کے ہیں۔۔۔یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے کہ اصل رازق خدا ہی ہے تو کسی دوسرے کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری جان کو اساندیشہ سے ہلاک کر دے کہ وہ کیا کھائے گی۔ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی جو سنگدلانہ رسم جاری تھی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت کوئی کماؤ فرد تو ہے نہیں تو لڑکیوں کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ قرآن نے اس سنگ دلانہ جرم کے اصل محرک پر ضرب لگائی اور اس بربریت کا خاتمہ کیا۔ موجودہ زمانے میں ضبط ولادت کے نام سے جو تحریک چل رہی ہے اور جس کو بروئے کار لانے کے لیے روز نت نئی ترکیبیں ایجاد ہو رہی ہیں، وہ بظاہر تو وحشیانہ نہیں ہیں لیکن فلسفہ اور عقیدہ بنیادی طور پر اس کے اندر بھی وہی کارفرما ہے جو عرب جاہلیت کی بربریت کا محرک تھا۔ جاہل عربوں کی طرح موجودہ زمانے کا متمدن انسان بھی اپنے آپ کو دوسروں کا رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ قرآن نے نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُم فرما کر اس گمراہی کی اصلاح کی ہے۔''(۲)

مفتی محمد شفیعؒ ایک منفرد انداز سے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غور کیا جائے تو اولاد کو تعلیم و تربیت نہ دینا جس کے نتیجہ میں خدا اور رسول ﷺ اور آخرت کی فکر سے غافل رہے، بداخلاقیوں اور بے حیائیوں میں گرفتار ہو یہ بھی قتل اولاد سے کم نہیں، قرآن کریم نے اس شخص کو مردہ قرار دیا ہے جو اللہ کو نہ پہچانے اور اس کی اطاعت نہ کرے۔ افمن کان میتا فاحییناہ میں اسی کی بیان ہے۔ جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال و اخلاق کے درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے ان کو آزاد چھوڑ تے ہیں یا ایسی غلط تعلیم دلاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی اخلاق تباہ ہوں وہ بھی ایک حیثیت سے قتل اولاد کے مجرم ہیں اور ظاہری قتل کا اثر تو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کو تباہ کرتا ہے، یہ قتل انسان کی اخروی اور دائمی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔'' (۳)

مشرکین مکہ اپنی بیٹیوں کو بھوک اور عار کی وجہ سے قتل کر دیتے قرآن عظیم نے اسے بہت بڑا جرم اور حدیث میں تیسرا بڑا گناہ قرار دیا گیا۔

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳، ص:۱۹۹، ۲۰۰

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۴۹۹

(۳) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۳، ص:۴۸۴

۶۔قتل ناحق

انسانی جان کا اصل مالک اللہ تعالی ہے۔لہذا انسان کو موت دینے کا اختیار اللہ تعالی کو ہے۔حق کے علاوہ قتل کرنے پر قصاص، دیت یا معافی کا اختیار دیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)

قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

سید ابوالاعلی مودودی ''قتل نفس'' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''قتل نفس سے مراد صرف انسان کا قتل ہی نہیں ہے، بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔اس لیے کہ نفس، جس کو اللہ نے ذی حرمت ٹھہرایا ہے، اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔لہذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتل انسان ہے، اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی بھی ہے۔آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک، اور اپنی اس ملکیت کو باختیار خود تلف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے۔حالانکہ یہ جان اللہ کی ملکیت ہے، اور ہم اس کے اتلاف تو درکنار، اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالی جس طرح بھی ہمارا امتحان لے ، اسی طرح ہمیں آخر وقت تک ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے، خواہ حالات امتحان اچھے ہوں یا برے۔اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے، کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جرم عظیم کے ذریعے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور ابدی تکلیف و رسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔''(۱)

''**النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ**'' سے وہ جان مراد ہے جسے اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے، جن کا خون بہانا جائز نہیں ہے۔اگر کوئی شخص اس قانونی جواز کے بغیر قتل ہوا تو وہ مظلومانہ قتل ہے۔

إِلَّا بِالْحَقِّ کے تحت سید ابوالاعلی مودودی صاحب لکھتے ہیں:

یعنی انسانی جان جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھیرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔اب رہا یہ سوال کہ ''حق کے ساتھ'' کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں اور دو صورتیں احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔قرآن کی بیان کردہ صورتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

(۲) دین حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

(۳) دارالاسلام کے حدود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرے۔

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲:ص:۶۱۴

باقی دوصورتیں جوحدیث میں ارشاد ہیں، یہ ہیں:

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۵) ارتداد اور خروج از جماعت (جماعت سے نکل جانے) کا مرتکب ہو۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں، خواہ مومن ہو یا ذمی یا عام کافر۔(۲)

فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ۔سلطان سے مراد یہاں ''دلیل'' ہے جس کی بنیاد پر وہ قصاص کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ہم نے اس کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار دے دیا ہے۔وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، چاہے تو خون بہالیں اور اگر چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔پورا اختیار دینے سے مراد ہے کہ اسلامی حکومت مقتول کے ورثاء کی مرضی لازماً نافذ کرائے گی۔مقتول کے ورثاء کو قانون اور حکومت کی مکمل حمایت حاصل ہے لہذا وہ قتل کرنے میں حد سے آگے نہ بڑھیں۔مثلاً قاتل کے رشتہ داروں کو قتل کرنا، اعضاء کا مثلہ کرنا وغیرہ۔اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ طے کردیا گیا کہ مقتول کے ورثاء کی مدد کرنا اسلامی حکومت اور اس کے عدالتی نظام کے ذمے ہے۔کوئی شخص یا فریق بذات خود قتل کا انتقام نہیں لے سکتا۔انصاف کے حصول کے لیے عدالت سے رجوع کیا جائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلامی قانون میں قتل کے معاملے میں اصل مدعی کی حیثیت حکومت کو نہیں بلکہ اولیائے مقتول کی ہے۔حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اولیائے مقتول کی مرضی ٹھیک ٹھیک نافذ کرادے۔حکومت مدعی صرف اس شکل میں ہوگی جب مقتول لا وارث ہو یا وارث ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو۔موجودہ قوانین میں سارا اختیار صرف حکومت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔اولیاء کو سرے سے کوئی تعلق رہ ہی نہیں جاتا۔ہمارے نزدیک موجودہ قوانین اسلامی قانون کی بہت سی برکتوں سے خالی ہیں۔''(۳)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

> ''بے شک اس ولی مقتول کو ہماری طرف سے مدد ہوتی ہے، مظلوم کو حق تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے اور احکام حکومت کو بھی حکم ہے کہ اس کی مدد کریں جہاں تک ممکن ہو مظلوم کا حق دلائیں، رشوت اور سفارش سے کسی مظلوم کے دعوے کو خارج نہ کریں۔''(۴)

حق کے علاوہ اللہ رب العزت نے انسانی جان کا قتل حرام قرار دیا ہے۔ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔اسلام میں مقتول کے ورثاء کو مکمل اختیار ہے کہ وہ قصاص لیں، دیت لیں یا معاف کردیں۔فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں قتل کی پانچ اقسام بیان کی گئی ہیں:

۱۔قتل عمد۔۲۔قتل شبہ عمد۔۳۔قتل خطا۔۴۔قتل قائم مقام خطا۔۵۔قتل بسبب۔(۵)

---

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۵۹۹، ۶۰۰

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴،ص:۵۰۱

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۴،ص:۴۷۹، ۴۸۰

(۵) المرغینانی، برہان الدین ابی الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی، **الهدایه،کتاب الجنایات** (لاہور: **المیزان**، س ن) ج:۴،ص:۵۵۳

(۱)قتل عمد:

قتل عمد وہ ہے کہ اسلحہ کے ساتھ مارنے کا ارادہ کیا جائے یا ایسی چیز کے ساتھ مارنے کا ارادہ کیا جائے جو اسلحہ کے قائم مقام ہو۔ جیسے تیز دھار لکڑی اور تیز دھار بانس اور تیز دھار شیشہ اور آگ۔ اسلام میں کسی مومن کو ارادے کے ساتھ قتل کرنے کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء ۴:۹۳)

اور جو شخص مسلمان کو ارادے سے مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس قتل کی صورت میں مقتول کے ورثاء کو قصاص، دیت لینے یا معافی دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔

(۲)قتل شبہ عمد:

اگر انسان اپنے ارادے کے ساتھ ایسی چیز سے قتل کرے جو نہ تو ہتھیار ہے اور نہ ہی وہ ہتھیار کے قائم مقام ہے اور عام طور پر ایسی چیز سے انسان کی موت واقع نہیں ہوتی۔

یہ قتل ایک شدید گناہ ہے اور قاتل پر کفارہ اور دیت واجب ہو جائے گی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات کے مطابق ۱۰۰ اونٹ جن کی تفصیل یہ ہے کہ تیس اونٹ تین سال سے زیادہ عمر کے + تیس اونٹ چار سال سے بڑی عمر کے + چالیس چھ سے نو سال تک کی عمر کی گابھن اونٹنیاں۔

(۳)قتل خطاء / قتل غیر عمد:

قتل خطاء کی دو اقسام ہیں:

قتل خطا فی القصد:

اس سے مراد ہے کہ قاتل کے ارادے میں غلطی واقع ہو جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس نے ایک چیز کو شکار سمجھتے ہوئے اس پر گولی چلائی یا تیر چلایا لیکن جب دیکھا تو وہ شکار نہیں بلکہ انسان تھا۔ چونکہ ارادے میں غلطی ہوئی اس لیے قتل خطا فی القصد کہلایا۔

قتل خطاء بالفعل:

اس سے مراد یہ ہے کہ بندے نے کسی جانور کا نشانہ بنایا لیکن آگے سے اچانک آدمی گزر پڑا اور وہ گولی یا تیر غلطی سے کسی انسان کو لگ جائے یا لکڑ ہارا درخت کاٹ رہا تھا اور کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پاس کھڑے کسی آدمی کو لگ گئی۔ چونکہ فعل میں غلطی ہوئی اس لیے قتل خطا بالفعل کہلائے گا۔

قرآن عظیم میں قتل خطا کے متعلق ارشاد فرمایا

''اور کسی مومن کو شایان نہیں کہ مومن کو مار ڈالے مگر بھول کر اور جو بھول کر بھی مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو) ایک مسلمان غلام

آزاد کرے اور (دوسرے) مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں (تو ان کو اختیار ہے) اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت میں سے ہو اور وہ خود مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہیے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا اور ایک غلام مسلمان آزاد کرنا چاہیے اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھے یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے (قبول) توبہ (کے لیے) ہے اور اللہ سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے''۔ **(النسآء۴:۹۲)**

اس قتل کی صورت میں دیت ادا کرنا لازم ہوگا سو اونٹوں کی تفصیل درج ذیل ہوگی۔ بیس اونٹنیاں ایک سال سے زیادہ عمر کی + بیس اونٹ دو سال سے زیادہ عمر کے + بیس اونٹنیاں دو سال سے بڑی عمر کی + بیس اونٹ تین سال سے زیادہ عمر کے + بیس اونٹ چار سال سے زیادہ عمر کے۔

(۴) قتل قائم مقام خطا:

اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی سو رہا تھا اور کروٹ لیتے ہوئے گر گیا نیچے لیٹا ہوا آدمی اس کے بوجھ سے مر گیا یا کوئی چھت سے گرا اور نیچے کھڑا آدمی اس کے گرنے سے ہلاک ہو گیا یا کسی کی سواری نے کسی آدمی کو کچل دیا یہ سب قتل قائم مقام خطا کی صورتیں ہیں۔

دیت کی مقدار:

شریعت میں سو اونٹ یا (سونے کی صورت میں) ہزار دینار یا (چاندی کی صورت میں) دس ہزار درہم ہوتے ہیں۔ اور درہم آج کل کے مروجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے آٹھ ماشے چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۳۶ تولے ۸ ماشے۔(۶) امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دیت اونٹ، سونا اور چاندی کے علاوہ بکری، گائے اور کپڑوں کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ گائے کی صورت میں دو سو گائے، بکریوں کی صورت میں دو سو بکریاں یا کپڑوں کی صورت میں دو سو جوڑے (ہر جوڑا دو کپڑوں پر مشتمل ہو)۔

کفارہ قتل:

قتل شبہ عمد، قتل خطا، قتل قائم مقام خطا میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی ادا کرنا واجب ہوتا ہے کہ یا تو ایک مومن غلام کو آزاد کرے اور عصر حاضر میں جیسے صورت حال ہے کہ غلاموں کا تصور ختم ہو چکا ہے تو پھر دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کفارہ ادا کرنے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ قتل کی ان اقسام میں اگر قاتل مقتول کا وارث ہے تو اسے حق وراثت سے محروم کر دیا جائے گا۔

(۵) قتل بالسبب:

وہ قتل جو کسی سبب کے پیش آنے سے ہو مثلاً کسی آدمی نے کسی دوسرے شخص کی ملک میں کوئی گڑھا کھودا اور کوئی شخص اس میں گر کر ہلاک ہو جائے یا کسی راستے میں کوئی وزنی پتھر رکھ دیا اور کسی کو اس سے ٹھوکر لگی اور وہ مر گیا تو یہ قتل بالسبب کہلائے گا۔ ایسے قاتل پر دیت لازمی ہوگی لیکن کفارہ لازم نہیں ہوگا اور اگر قاتل مقتول کے ورثا میں سے ہے تو اس کو میراث سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

---

(۶) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۱، ص:۴۳۷

۷۔غیبت

غیبت سے مراد ہے کسی کی غیر موجودگی میں ایسی بات کہنا کہ اگر اس کے منہ پر کی جائے تو اسے ناگوار لگے۔اسلام میں اس برائی کو حرام قرار دے کر اس سے منع کیا گیا ہے۔اس کی ناپسندیدگی کو ایک تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات ۴۹:۱۲)

اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ''غیبت'' کی تعریف میں لکھتے ہیں:

غیبت یہ ہے کہ کسی کے پیچھے اس کی ایسی برائی کرنا کہ اس کے سامنے کی جائے تو اس کو رنج ہو۔گو وہ سچی ہی بات ہے ورنہ بہتان ہے اور پیٹھ پیچھے کی قید سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ سامنے جائز ہے کیونکہ وہ '' لمز '' میں داخل ہے۔جس کی ممانعت اوپر آئی ہے۔**لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱)**۔(۱)

مولانا امین احسن اصلاحی غیبت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''غیبت کے معنی کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز و ہم خیال اور شریک مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم ان سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھنونا فعل بناتی ہے۔اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت وحمایت کا مقصد حاصل ہوتا نہ کسی اصلاح کی توقع ہوسکتی ہے بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔''(۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ ''غیبت'' کے مسائل کی توضیح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غیبت گناہ کبیرہ ہے البتہ جس سے بہت کم اذیت ہو وہ صغیرہ ہوسکتا ہے۔جیسے کسی کے مکان یا سواری کی مذمت کرنا اور جو سننے والا دفع (ٹالنے) پر قادر ہو (یعنی غیبت سے روک سکتا ہو لیکن نہ روکے) تو اس کا سننا بھی بولنے کے حکم میں آئے گا۔اور اس میں حق اللہ اور حق العبد دونوں ہیں اس لئے (اللہ سے) توبہ بھی واجب ہے اور (بندے سے) معاف کرانا بھی ضروری ہے ،البتہ بعض علماء نے کہا ہے کہ جب تک اس شخص کو اس غیبت کی خبر نہ پہنچے تو حق العبد نہیں ہوتا (اس لیے اس سے معافی کی ضرورت نہیں)۔لیکن اس صورت میں بھی جس شخص کے سامنے غیبت کی تھی اس کے سامنے اپنی تکذیب کرنا (اپنے گناہوں کا

---

(۱) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۴۴۱

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۵،ص:۹۰

اقرار کرنا) ضروری ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو مجبوری۔ اور موت کے بعد وارثوں سے معاف کرانا کافی نہیں بلکہ غائب اور میت میں اپنے اور ان کے لیے کثرت استغفار (یعنی کفارہ غیبت یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لیے اللہ تعالی سے دعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما) کرتا رہے۔ بچہ اور مجنون اور کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے کیونکہ اس کی ایذا احرام ہے اور کافر حربی ہیں اگر چہ ان کی ایذا احرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔ اور غیبت کبھی فعل (یا اشارہ) سے ہوتی ہے مثلاً کسی لنگڑے کی نقل بنا کر چلنے لگے جس سے اس کی حقارت ہو اور جس سے معاف کرایا جائے اس کے لیے مستحب ہے کہ معاف کر دے۔

اور بعض روایات سے ثابت ہے کہ یہ آیت غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے۔ یہ مخصوص البعض ہے یعنی اگر برائی ذکر کرنے کی کوئی ضرورت یا مصلحت ہو جو شرعاً معتبر ہو تو وہ غیبت حرام میں داخل نہیں۔ جیسے ظالم کی شکایت ایسے شخص کے سامنے جو ظلم کو دفع کر سکے یا فتوی حاصل کرنے والا صورت واقعہ بیان کرنے کی غرض سے کسی کا ذکر کرے یا مسلمانوں کو کسی کے شر دنیوی یا دینی سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلا دے یا کسی معاملہ کے متعلق اس سے مشورہ لینے کے وقت اس کا حال ظاہر کر دے **ومثــــل ذلک** یا جو شخص اپنے فسق کو خود آشکارا کرتا ہو (کھلم کھلا گناہ کرتا ہو اس کے اعمال بد کا ذکر کرنا غیبت نہیں ہے) اور بغیر مجبوری کے غیبت سننا غیبت کرنے کی مانند ہے۔ **ھذا کلہ من الروح**۔(۳)

مولانا امین احسن اصلاحی غیبت سے متعلق ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض خوش فہم کسی کی برائی کے ذکر کی ہر صورت کو غیبت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدثین کا راویوں پر جرح کرنا، کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا، کسی کے منکر پر نکیر کرنا، کسی کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانا، کسی کے باب میں کسی مشورہ چاہنے والے کو اس کے کسی واقعی عیب سے آگاہ کرنا اور اس قبیل کی ساری باتیں ہیں تو داخل غیبت لیکن یہ غیبتیں حکمت عملی کے تحت جائز کر دی گئی ہیں۔ پھر وہ یہیں سے ایک شرعی اصول یہ نکال لیتے ہیں کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں۔ اس وجہ سے انہیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کی حکمت عملی کسی حرام کو مباح کرنے کی اگر مقتضی ہو تو وہ اس کو جائز قرار دے سکتے ہیں ہمارے نزدیک یہ دین کے خلاف ایک شدید قسم کا فتنہ ہے جس سے بہت سے نئے فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔''(۴)

سید ابوالاعلی مودودی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''غیبت کے باب میں بھی بعض لوگوں نے قلت تدبر کے سبب سے اسی نوع کا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔ وہ غیبت کی حدود معین کرتے وقت بھول گئے کہ قرآن وحدیث میں جس طرح غیبت کی نہی وارد ہوئی ہے اسی طرح جرح وتعدیل، شہادت حق، انکار منکر، خیر خواہی مسلمین کے احکام بھی نہایت مثبت اور قطعی الفاظ میں وارد ہوئے ہیں۔ جب ان دونوں میں تطبیق کا سوال پیدا ہوا اور کوئی تطبیق ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انہوں نے یوں تطبیق پیدا کر ڈالی کہ ہیں تو یہ ساری باتیں داخل غیبت، لیکن یہ اس لیے مباح کر دی گئی ہیں کہ حکمت عملی ان کی مقتضی تھی۔ حالانکہ جرح وتعدیل، شہادت حق، انکار منکر اور نصح مسلمین کے احکام

---

(۳) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲:ص:۴۴۱، ۴۴۲

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷، ص:۵۱۱

مباحات میں سے نہیں بلکہ واجبات دین میں سے ہیں۔اسلامی نظام کا سارا جمال وکمال انہی پر منحصر ہے۔راویوں کی تحقیق اور جرح وتعدیل پر علم شریعت کی بنیاد ہے۔شہادت حق اس امت کا وہ فریضہ منصبی ہے،جس کے لیے یہ دنیا میں برپا کی گئی ہے ،انکار منکر کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ نے اس امت کے قیام وبقاء کو وابستہ کیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی صرف اخوت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اسی سورۃ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ایمان کا بھی تقاضا ہے یہ چیزیں امت پر غیبت کو مباح کر کے نہیں فرض کی گئی ہیں بلکہ ایمان کے تقاضوں کے تحت فرض کی گئی ہیں۔رہی غیبت تو اس کا ایک خاص دائرہ ہے جس کی وضاحت آیت کے تحت ہم کر آئے ہیں۔اس کی حرمت کسی پہلو سے بھی دین کے ان فرائض میں مخل یا مانع نہیں ہے کہ اس کو حکمت عملی کی خاطر مباح کرنے کی ضرورت پیش آئے۔نہ محدثین نے اس کو جائز قرار دیا ہے نہ مجددین و مصلحین نے اور نہ کسی مسلمان کو اپنے کسی دینی فرض کے ادا کرنے کے لیے کبھی اس کو مباح کرنے کی ضرورت پیش آسکتی۔یہ ضرورت ان لوگوں کو پیش آسکتی ہے جو اسلامی شریعت کو اپنی بازیگاہ بنانا چاہتے ہوں۔''(۵)

سید ابوالاعلی مودودی غیبت کی حرمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مستثنی صورتوں کے ماسوا پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقا حرام ہے۔یہ بدگوئی اگر سچی ہے تو غیبت ہے،جھوٹی ہو تو بہتان ہے اور دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے ہو تو چغلی ہے۔شریعت ان تینوں چیزوں کو حرام کرتی ہے۔اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کے سامنے کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائی جا رہی ہو تو وہ اس کو خاموشی سے نہ سنے بلکہ اس کی تردید کرے ،اور اگر کسی جائز شرعی ضرورت کے بغیر کسی کی واقعی برائیاں بیان کی جا رہی ہوں تو اس فعل کے مرتکبین کو خدا سے ڈرائے اور اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔''(۶)

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ:

''اللہ تعالی نے غیبت کو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اسے انتہائی گھناؤنا قرار دیا ہے۔مردار کا گوشت کھانا قابل نفرت ہے،پھر وہ گوشت بھی انسان کا ہو،اور انسان بھی اپنا بھائی ہو۔پھر اس تشبیہ کو سوالیہ انداز میں پیش کر کے انتہائی موثر بنایا گیا ہے،تاکہ ہر شخص اپنے ضمیر سے پوچھ کر خود فیصلہ کرے کہ آیا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے لیے تیار ہے؟اگر اس کی فطرت اس چیز سے گھن کھاتی ہے تو آخر وہ کیسے یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے ایک مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرے،جہاں وہ اپنی مدافعت نہیں کرسکتا اور اپنی بے عزتی سے بے خبر ہے۔مردہ آدمی کا گوشت کھانا اس لئے حرام نہیں کہ اس سے مردہ کو تکلیف ہوتی ہے۔مردے کو کیا خبر کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟اسی طرح جس شخص کی غیبت ہو اس کو غیبت کی اطلاع نہ پہنچے تو وہ عمر بھر بے خبر رہے گا کہ کہاں کس شخص نے کب اس کی عزت پر کن لوگوں کے سامنے حملہ کیا تھا؟اور اس کی وجہ سے کس کس کی نظر میں وہ ذلیل وحقیر ہو کر رہ گیا تھا۔''

غرض غیبت کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔اسلام میں اسے زنا سے بھی سخت گناہ قرار دیا گیا۔ہمیں غیبت کرنے جیسے گھناؤنے عمل سے بچنا چاہیے

---

(۷) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۷،ص:۵۱۶،۵۱۷

(۸) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۵،ص:۹۳،۹۴

۸۔ بدگمانی

اسلام میں کسی کے بارے میں برا گمان رکھنے سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔تاہم ایک مسلمان کے بارے میں اچھا گمان رکھنا چاہیے۔ارشادالٰہی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرٰت ۴۹:۱۲)

اے ایمان والو !بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں ۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کی تفسیر میں ظن کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس لیے سب اقسام ظن کے حکم کو تحقیق کر کے کہ کونسا ظن جائز ہے اور کون سا ناجائز ہے، حد جواز تک رہو۔ظن میں کثیراا ور بعض جو کہ مقابل جمیع کا اور شامل کثیر کو ہے اس لیے فرمایا کہ ظن کئی قسم کے ہیں۔

۱۔واجب: جیسے ظن فقہی غیر منصوص ہیں اور اللہ تعالی کے ساتھ حسن ظن رکھے۔

۲۔مباح: جیسے ظن امور معاش میں اور ایسے شخص کے ساتھ بدگمانی کرنا جس میں اعلانیہ علامات فسق کے پائے جاتے ہیں جیسے شراب خانوں میں اور فاحشہ عورتوں کی دوکانوں مکانوں میں کسی کی آمدورفت ہو اس پر فسق کا گمان ہو جائے جائز ہے مگر یقین نہ کرے۔اسی طرح جو سوءظن غیر اختیاری ہو مگر اس کے مقتضا پر عمل نہ ہو اس میں بھی گناہ نہیں بشرطیکہ حتی الامکان اس کو دفع کرے۔

۳۔حرام: جیسے الہیات و نبوت میں بلا دلیل قاطع ،کلامیات و فقہیات میں خلاف دلیل قاطع ظن کرنا یا جس میں علامات فسق کے قوی نہ ہوں بلکہ ظاہرا اصلاح کے آثار نمودار ہوں اس کے ساتھ سوءظن کرنا یہ حرام ہے۔

چونکہ سب افراد ظن کے حرام نہ تھے اس لیے کثیرا فرمادیا گیا اور یہ کثرت فی نفسہ ہے۔یہ ضروری نہیں کہ اس کی فردیں دوسری قسم کی فردوں سے زیادہ ہوں اور اگر عام لوگوں کی عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قسمیں باقیین کے اعتبار سے کثرت صحیح ہوسکتی ہے۔کیونکہ زیادہ ابتلاء لوگوں کا ظن حرام ہی میں ہے۔یہ ہے تفصیل ان اقسام کی جن کی طرف **اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ** کے ترجمہ میں اشارہ ہے اور سوءظن (براگمان) کے بارہ میں جو مشہور ہے **الحزم سوء ظن** اس کا مطلب یہ ہے کہ مشتبہ شخص سے اپنی احتیاط رکھے۔پس سوءظن کے مقتضاء پر عمل کرنا مظنون بہ کے حق میں تو حرام ہے جیسے اس کی تحقیر و تنقیص کرنا اس کو ضرر پہچانا اور خود گمان کرنے والے کو اپنے حق میں جائز ہے اس معنی میں کہ اس کی مضرت سے خود بچے۔(۱)

چونکہ ظن کی کئی اقسام ہیں بعض جائز، واجب، مباح اور بعض حرام ہیں۔اس لیے زیادہ گمانوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بچو بہت زیادہ بچنا۔نیک لوگوں کی بدگمانی کرنا بہت بری بات ہے۔فاسقوں کی بدگمانی جائز ہے۔جب یہ حکم معلوم ہوا کہ گمان کی کچھ قسمیں گناہ ہیں تو تحقیق کے بعد جہاں بدگمانی جائز ہو بدگمانی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر موقع اور ہر معاملے میں بدگمانی کرو اور برے گمان سے کام لو۔جو بہت سی بدگمانیوں سے بچے گا وہ کچھ سے تو بچ جائے گا۔بعض گمانوں کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔اس لیے بدگمانی سے بچنا گناہ سے بچنا ہے۔شرعی احکام میں ظن غالب کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔اسی طرح ہر مسلمان کے بارے حسن ظن رکھنا چاہیے۔

---

(۱) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۴۴۱

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں منفرد انداز سے لکھتے ہیں:

اہل ایمان کو ازسرنو خطاب کر کے بعض ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر آتی ہیں لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقوی کی روئیدگی کے لیے بالکل ناساز گار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جن کو ایمان عزیز ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آفتوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔

پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں کے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنالے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے اس کو کسی گوشے میں محفوظ کرے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے اس پہلو سے معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد ہے۔ اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کے رد و قبول کے معاملے میں بھی بے پرواو سہل انگار نہ ہو بلکہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز رہے۔ اہل ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے حتی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس کی فطرت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے۔

اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں ان سب کو سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ مچھلیوں کے شوق میں جو شخص ایسا اندھا بن جائے گا اندیشہ ہے کہ اسی شوق میں کسی دن وہ اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھے گا۔ قرآن نے یہاں اسی خطرے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ گمانوں کے زیادہ درپے نہ ہو کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسن ظن رکھنا چاہیے اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ کرے، اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اس کے برے پہلو کو اسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے۔ جب اس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اس بات کے مقابلے میں آسان ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حقدار سے بدگمانی رکھے۔ حدیث شریف میں مومن کی تعریف یہ آئی ہے کہ **المومن غر کریم** (مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے)

اس زمانہ میں لوگوں کا عام پسندیدہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھو یہاں تک کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے مقصد کا آدمی ہے اس چیز کو لوگ سیاست اور زیرکی خیال کرتے ہیں۔ دشمن کے مقابل میں تو یہ زیرکی وہوشیاری ضروری ہے۔ **اشداء علی الکفار** کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں لیکن اہل ایمان کے مقابل میں یہ سیاست کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ان کو **اذلة علی المومنین** اور **رحماء بینهم** ہونے کی قرآن نے ہدایت فرمائی ہے۔ (۲)

غرض تقوی کو اپنے دل میں پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیبت اور بدگمانی سے بچا جائے۔ اپنے معاشرے میں مسلمانوں کے بارے میں کسی قسم کا برا گمان نہ رکھا جائے۔ آج سیاست میں ایک لیڈر دوسرے لیڈر کے بارے میں بدگمانی پیدا کرتا ہے یہ نہیں ہونا چاہیے۔

---

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷، ص:۵۰۸-۵۱۰

۹۔عیب جوئی

بدگمانی کا ایک سبب کسی کے عیب تلاش کرنا ہیں چنانچہ قرآن مجید میں اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَجَسَّسُوْا (الحجرٰت ۴۹:۱۲)

اور سراغ مت لگایا کرو

مفتی محمد شفیعؒ نے اس لفظ کی جو تفسیر فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے:

''تجسس کے لفظی معنی کسی کے عیب تلاش کرنا یا کسی کے پوشیدہ عیب کا سراغ لگانا ہے۔ اس کے لیے **لا تحسسوا** کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ ''**لاتجسسوا**'' اور'' **لا تحسسوا** '' دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں۔ اخفش کے نزدیک **تجسس بالجیم** کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور **تجسس بالحاء** مطلق تلاش اور جستجو کے معنی میں آتا ہے۔ کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں۔''(۱)

تفسیر بیان القرآن کے مطابق:

''چھپ کر باتیں سننا یا سونے کا بہانہ بنا کر باتیں سن لینا یہ سب تجسس میں داخل ہیں، البتہ اگر کسی سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اور اپنی یا کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے اس نقصان پہنچانے والے کی تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے۔''(۲)

مولانا محمد اشرف علی تھانوی "**فتبینوا**" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فتبینوا سے یہ مقصود نہیں کہ ضرور اس خبر کی تحقیق کی جائے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اگر ہم کسی شخص کی برائی سن کر بالکل التفات نہ کریں جائز ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو تجسس حرام ہے۔ بلکہ مقصود اس سے نہی ہے عمل بلا تحقیق کی۔۔۔۔اور یہ مستقل مسئلہ ہے کہ تحقیق کہاں واجب ہے کہاں جائز ہے کہاں ممنوع ہے سو اس میں قول مجمل یہ ہے کہ جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب شرعی فوت ہوتا ہو وہاں واجب ہے۔ مثلاً سلطان کسی کے ارتداد کی خبر سنے تو چونکہ ارتداد کی صورت میں اس پر واجب ہے کہ اس کو توبہ کرادے ورنہ قتل کرے۔ اس لیے تحقیق واجب ہوگی یا سلطان نے سنا کہ فلاں شخص فلاں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو چونکہ بوجہ سلطان ہونے کے حفاظت رعایا کی اس کے ذمہ واجب ہے اس لیے اس کی تحقیق اور انتظام واجب ہے اور جہاں تحقیق کرنے سے کوئی واجب فوت نہیں ہوتا اور تحقیق کرنے سے اس مبلغ عنہ کا بھی کوئی ضرر نہیں ہوتا تو وہاں تحقیق جائز ہے جیسے یہ سنا کہ فلاں شخص مجھ کو مارے گا اور اگر تحقیق کرنے سے اپنی کوئی دفع مضرت نہیں اور اس دوسرے کو ناگواری ہے تو تحقیق حرام ہے جیسے کسی نے سنا کہ فلاں شخص خفیہ شراب پیتا ہے تو تحقیق کرنے سے اپنا کوئی ضرر نہیں اور تحقیق کرنے سے وہ فضیحت ہوتا ہے خوب سمجھ لیا جائے۔(۳)

---

(۱) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۸، ص:۱۲۰، ۱۲۱

(۲) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۴۴۱

(۳) مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۴۳۷، ۴۳۸

حضرت مجاہدؒ کا قول ہے:

خـذوا مـا ظهـرودعـوا مـا ستره اللـه۔(۴)

جو کچھ ظاہر ہوا وہ لے لو اور جو اللہ نے چھپالیا اسے چھوڑ دو

سید ابوالاعلی مودودی **لا تجسسو ا** کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"**لا تجسسو ا** کا معنی ہے لوگوں کے راز نہ ٹٹولو، ایک دوسرے کے عیب تلاش نہ کرو، دوسروں کے حالات اور معاملات کی ٹوہ نہ لگاتے پھرو۔ یہ حرکت خواہ بدگمانی کی بنا پر کی جائے یا بدنیتی سے کسی کو نقصان پہنچانے کی خاطر کی جائے یا محض اپنا استعجاب دور کرنے کے لیے کی جائے، ہر حال میں شرعاً ممنوع ہے۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے جن حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے ان کی کھوج کرید کرے اور پردے کے پیچھے جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کس میں کیا عیب ہے اور کس کی کون سی کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے نجی خطوط پڑھنا، دو آدمیوں کی باتیں کان لگا کر سننا، ہمسایوں کے گھر میں جھانکنا اور مختلف طریقوں سے دوسروں کی خانگی زندگی یا ان کے ذاتی معاملات کو ٹٹول کرنا ایک بڑی بداخلاقی ہے۔

سید ابوالاعلی مودودی تجسس کو اسلامی حکومت کے لیے بھی ممنوع سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

تجسس کی ممانعت کا یہ حکم صرف افراد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت کے لیے بھی ہے۔ شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے، اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کر کے لوگوں کی چھپی ہوئی برائیاں ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے، بلکہ اسے صرف ان برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیے جو ظاہر ہو جائیں۔ رہیں مخفی خرابیاں، تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے بلکہ تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے۔

اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ

یہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا: اے دشمن خدا! کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا: امیر المومنین جلدی نہ کیجیے اگر میں نے گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا، اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لیے بغیر نہ جاؤ اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ افراد ہی کے لئے نہیں، خود اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتہ چلائے اور پھر انہیں پکڑے۔

---

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج ۷، ص: ۵۰

اس حکم سے مستثنٰی صرف وہ مخصوص حالات ہیں

جن میں تجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آ رہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے، مثلاً کسی شخص کے ہاں کوئی شادی کا پیغام بھیجے یا اس کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کرنا چاہے، تو وہ اپنے اطمینان کے لیے اس کے حالات کی تحقیق کر سکتا ہے۔" (۵)

مولانا امین احسن اصلاحی عصر حاضر میں اخباری نمائندوں کے کیے جانے والے تجسس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جس طرح اوپر والے ٹکڑے میں اچھے گمان سے نہیں بلکہ برے گمان سے روکا گیا ہے اسی طرح یہاں ممانعت اس ٹوہ میں لگنے کی ہے جو برے مقصد سے ہو۔ یعنی تلاش اس بات کی ہو کہ دوسرے کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی بات ہاتھ آئے جس سے اس کی خامیوں سے آگاہی اور اس کے اندرون خانہ کے اسرار تک رسائی ہو۔ یہ چیز کبھی تو حسد کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے کہ حریف کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو سامنے آئے جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کبھی بغض و عناد کی شدت اس کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس کی عندالضرورت تشہیر کر کے مخالف کو رسوا کیا جا سکے۔ اس زمانے میں اس نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کر لی ہے جس کو جدید اخبار نویسی نے بہت ترقی دی ہے۔ بعض اخبار نویس رات دن کسی نہ کسی اسکینڈل کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ شاطر وہ اخبار نویس سمجھا جاتا ہے جو کسی نمایاں شخصیت کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی ایسا اسکینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جس سے اس کا اخبار یا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بک جائے۔

اس طرح کا تجسس ظاہر ہے کہ اس اخوت اور باہمی ہمدردی کے بالکل منافی ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے ، اس وجہ سے اہل ایمان کو اس سے روکا گیا ہے۔ رہا وہ تجسس جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حالات کا اس مقصد سے کرتا ہے کہ اس کی مشکلات و ضروریات میں اس کا ہاتھ بٹا سکے یا ایک اسلامی حکومت اس غرض سے کرتی ہے کہ رعایا کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے تو یہ تجسس نہ یہاں زیر بحث ہے اور نہ یہ ممنوع ہے۔ بلکہ ہر شریف پڑوسی کے لیے یہ نہایت نیکی کا کام ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے حالات و مسائل سے آگاہ رہے تاکہ ان کی مشکلات میں ان کی مدد کر سکے اور حکومت کے لیے تو یہ صرف نیکی ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ رعایا کے اچھے اور برے دونوں طرح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کا اہتمام رکھے، تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔ (۶)

مولانا امین احسن اصلاحی اسلامی حکومت کے لیے تجسس ممنوع ہونے کی تردید میں لکھتے ہیں:

اس زمانے میں چونکہ فرد کی آزادی کا تصور ذہنوں پر بہت غالب ہے اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے جس طرح عام افراد کو دوسروں کے احوال کے تجسس سے روکا ہے اسی طرح حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کا تجسس کرے۔ اس کو اپنا احتساب صرف ان معاملات تک محدود رکھنا چاہیے جو علانیہ طور پر اس کے نوٹس میں آ جائیں۔ رہے

---

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵، ص:۸۸-۹۰

(۶) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷، ص:۵۱۰

اندرون خانہ کے معاملات تو وہ حکومت کے دائرہ احتساب سے خارج ہیں۔ اس کی تائید میں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کے ایک واقعے کا حوالہ بھی دیا ہے۔ *

حضرت عمرؓ کے حوالے سے یہ واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس واقعے پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ روایت بعض حضرات نے مکارم اخلاق اور ترغیب وترہیب کی نوعیت کی کتابوں میں درج کی ہے۔ لیکن نہ سند کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ ہے اور نہ متن ہی کے پہلو سے یہ قابل اعتبار ہے۔ سند کے ضعف کے لیے تو یہی بات کافی ہے کہ بہت سے لوگ خاص طور پر ارباب تصوف، اخلاق و موعظت کی روایات میں تحقیق سند کی اہمیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ جس قسم کے قصوں سے ان کے نزدیک کوئی مفید سبق حاصل ہوتا ہو ان کو بلا تحقیق سند و متن اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں۔ رہا اس کا متن تو اس پر غور کیجیے تو معلوم کہ یہ واقعہ بالکل ہی بعید از عقل و قیاس ہے۔

اول تو یہی بات نا قابل قیاس ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ میں اور وہ بھی حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایسی جسارت کر سکے کہ شاہد و شراب کے ساتھ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف ہو کہ گانے کی آواز حضرت عمرؓ کو باہر گلیوں میں سنائی دے اور ان کو اس بزم عیش میں خلل انداز ہونا پڑے۔ اگر عین مرکز اسلام میں، فاروق اعظمؓ کے دور میں، شیطان کی جسارت کا یہ حال رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ بھی شیطان کو مرعوب نہ کر سکے حالانکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ حضرت عمر جس راستے سے گزرتے ہیں شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ کو قرآن وحدیث کے یہ احکام معلوم نہیں تھے کہ کسی کے گھر میں اس کی دیوار پھاند کر داخل ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کی اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت ملے تو داخل ہونا چاہیے ورنہ تین بار سلام کر کے چپکے سے الٹے پاؤں واپس ہونا چاہیے۔ کیا کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے یہ باور کر سکتا ہے کہ کتاب وسنت کے ان صریح احکام سے حضرت عمرؓ کو پہلی بار ایک رند شاہد باز نے آگاہ کیا! کیا حضرت عمرؓ کو کبھی سورۂ نور اور سورۂ حجرات کی تلاوت کا العیاذ باللہ موقع نہیں ملا تھا۔

تیسری بات یہ کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنی یہ تینوں غلطیاں نہایت سعادت مندی سے تسلیم کر لی تھیں تو اپنے عمال و گورنروں کو یہ ہدایت نامہ کیوں نہیں جاری فرمایا کہ اب تک میں غلطی پر تھا کہ لوگوں کے گھروں کا تجسس کیا کرتا تھا۔ اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس میں اکٹھی تین باتیں خلاف شریعت ہیں اس وجہ سے تم لوگ اندرون خانہ کے معاملات سے تعلق نہ رکھو۔ لوگ اپنے گھروں میں جو اودھم مچائیں، اگر تمہیں شبہ گزرے تو دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت مانگو، اگر اجازت ملے تو گھر کے اندر جاؤ ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آؤ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے حضرت عمر نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا بلکہ متعدد واقعات تاریخوں میں ایسے موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ ان کے عمال بھی تجسس کرتے رہے اور خود حضرت عمرؓ بھی اس حد تک تجسس کرتے تھے کہ راتوں میں دودھ پیتے بچے روتے، تو وہ ان کا سبب معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک اسلامی حکومت میں اگر کچھ لوگ اپنے گھروں میں شرابیں پئیں، بازاری عورتوں سے رنگ رلیاں منائیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم کریں یہاں تک کہ بم اور اسٹین گن کے ذخیرے بھی جمع کر چھوڑیں، تو بھی حکومت کی پولیس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے گھروں میں گھس کر ان کے عیش کو مکدر کرے، یہاں تک کہ خلیفہ وقت کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بدون اذن وہ ان کے گھروں میں داخل ہونے کی جرات کر سکے اور کبھی غلطی سے اگر ایسی جرات کر بیٹھے تو بس اتنی ہدایت فرما دیا کرے کہ آئندہ آپ لوگ اس طرح کی باتوں سے احتیاط کریں۔

یہ روایت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے تعرض کیا جاتا لیکن اس کو اس زمانے میں لوگوں نے بڑے اعتماد سے پیش کیا ہے جو رات دن اسلامی حکومت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض کرنا پڑا۔ بہر حال یہ روایت ہمارے نزدیک بالکل نا قابل اعتبار ہے۔ ایک اسلامی حکومت لوگوں کے اخلاق و کردار کی بھی محافظ ہوتی ہے اور ملک کے امن، عدل اور اس کی سلامتی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں

کہیں اس کو کوئی شبہ گزرے وہ اس کا تجسس کرے لیکن ہر حق کے استعمال پر کچھ اخلاقی وقانونی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا لحاظ حکومت کو بھی کرنا پڑتا ہے حکومت اگر ان کا لحاظ نہیں کرتی تو خواہ اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے لیکن عند اللہ وہ لوگ مجرم ٹھہریں گے جنہوں نے ایک ایسے حق کو پبلک کے بے گناہ افراد کو پریشان کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کو امن، عدل اور رعایا کی حفاظت کے لیے عطا ہوا تھا۔''

مولانا امین احسن اصلاحی ''مستحسن تجسس'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''جو تجسس کسی کی بھلائی کی خاطر، نیک ارادہ، نیک مقصد سے ہو، صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ نہایت نیکی کا کام ہے۔قرآن میں ہدایت ہے کہ غریبوں کی مدد کے لیے ان کو تلاش کر کے خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تم سے لگ لپٹ کر سوال کریں گے۔

اگر کسی شخص کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس کی در پردہ سرگرمیاں دوسرے بے گناہ افراد کے جان و مال اور آبرو کے لیے خطرہ ہیں یا ملک کے امن ،عدل اور سلامتی کو ان سے نقصان متصور ہے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔اگر اصلاح کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں یا اس کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں۔

اگر کسی شخص کی کوئی ایسی برائی علم میں آئے جو اس کی ذات ہی تک محدود ہو تو اس کو نصیحت کرے، اگر نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔اگر اس پوزیشن میں نہ ہو تو اس سے غض بصر کرے اور پردہ ڈالے۔اللہ تعالی ان لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے جو دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں۔

قرآن وحدیث کے سمجھنے میں لوگوں کو زیادہ مغالطہ اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ آیات واحادیث کا موقع محل میں معین لوگ تدبر سے کام نہیں لیتے ۔اس میں شبہ نہیں کہ بعض حدیثوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن کوئی صاحب مجرد اس حدیث کی بنا پر اگر یہ فتوی دے بیٹھیں کہ دوسروں کی نیکی بدی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہمیں صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے، کسی سے کوئی بدی ہمارے علم میں آئے بھی تو ہمیں اس پر پردہ ڈالنا چاہیے۔اللہ تعالی قیامت کے دن ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو گو اس فتوی کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے لیکن یہ فتوی ذہنوں میں بڑی الجھن پیدا کر دے گا، اس لیے کہ دوسری حدیثوں میں یہ بات بھی نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو، طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ الجھن ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیدا ہوگئی کہ دونوں حدیثوں کا موقع محل متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔اگر دونوں کا موقع محل متعین ہو جائے تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔ایک شخص کو اگر آپ دیکھتے ہیں کہ کھڑا ہو کر پیشاب کر رہا ہے تو یہ خیال کر کے غض بصر بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو۔اگر عذر نہ واضح ہو تو اس کو عمدہ طریقے سے نصیحت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ تہذیب وشائستگی اور اسلامی آداب طہارت کے خلاف ہے۔اگر نصیحت کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو اس کے اس اجڈ پن پر پردہ ڈالیے اس کا اشتہار نہ دیجیے۔ان شاء اللہ آپ کی یہ پردہ پوشی آپ کے لیے عند اللہ موجب اجر ہوگی۔لیکن ایک شخص کے متعلق اگر آپ یہ علم رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے گھر میں شراب کی بھٹی بنا رکھی ہے یا حشیش کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے یا اسلحہ چھپا رکھا ہے یا چکلہ قائم کر رکھا ہے اور آپ پولیس اور حکومت کو اطلاع دے سکنے کی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اس خیال سے اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالی آپ کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو میرے نزدیک یہ محض خوش فہمی ہے۔اس طرح کی خوش فہمی میں پڑے ہوئے لوگ ثواب کمانا تو در کنار اپنے ایمان ہی گنوا بیٹھیں گے۔''(۷)

غرض دور جدید میں دہشت گردی کے پیش نظر حکومت انٹیلی جنس کے نظام کے ذریعے مجرموں کی جاسوسی اور عوام اس کی اطلاع کر سکتے ہیں۔

---

*یہ واقعہ اوپر تفسیر تفہیم القرآن کی روشنی میں بیان ہو چکا ہے۔اس مقالہ کا ص:۱۹۸

(۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷،ص:۵۱۳-۵۱۶

۱۰۔ناپ تول میں کمی

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (الانعام ۶:۱۵۲)

ماپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اس کو طاقت ہو

ماپ اور تول میں انصاف سے مراد ہے کہ کسی دوسرے کا حق ماپنے والے کے پاس نہ رہے۔جس کا جو حق بنتا ہے اسے دے دیا جائے۔دینے والا دوسرے کے حق میں کمی نہ کرے اور لینے والا اپنے حق سے زیادہ نہ لے۔تجارت میں دھوکا دینا حرام ہے۔قرآن عظیم نے ماپ تول میں کمی کو شدید حرام قرار دیا ہے۔اس حرام کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سورہ مطففین میں سخت وعید بیان کی گئی ہے۔تطفیف صرف کم ناپنے اور ڈنڈی مارنے کے ساتھ خاص نہیں۔نماز کے ارکان میں کمی بھی تطفیف کہلائے گی۔اسی طرح کوئی ملازم اپنی ڈیوٹی پوری یا صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتا وہ بھی تطفیف کہلائے گی۔غرض تطفیف کا مفہوم بہت وسیع ہے جس کا اطلاق ہر ناجائز کمی پر ہو سکتا ہے۔ناپ تول میں کمی کرنے کی وجہ سے سابقہ امتیں اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ان میں سے حضرت شعیبؑ کی قوم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا**،یعنی ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے۔بعض روایات حدیث میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے حد اختیار تک ناپ تول کا پورا پورا حق ادا کرے تو اگر اس کے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جائے تو وہ معاف ہے کیونکہ وہ اس کی قدرت واختیار سے خارج ہے۔اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ حق کو ادا کرتے کے وقت احتیاط اس میں ہے کہ کچھ زیادہ دے دیا جائے تاکہ کمی کا شبہ نہ رہے۔آپؐ نے ایک ایسے ہی موقع پر جھکتا ہوا تولنے کا حکم دیا۔آپؐ لوگوں کو ان کے حق سے زیادہ عطا کرتے تھے۔

یہ حکم اخلاقی ہے کہ دینے میں زیادہ دے اور لینے میں کم بھی ہو تو جھگڑا نہ کرے۔لیکن یہ قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر مجبور ہو۔اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے۔یعنی دوسروں کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی جبری حکم نہیں۔اس لیے کہ عام لوگوں کے لیے ایسا کرنا آسان نہیں ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ :

ناپ تول کو ٹھیک عدل کے ساتھ پورا کرو۔ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو کہ اپنے لیے اور پیمانہ ہو، دوسروں کے لیے اور، لینے کے لیے کوئی باٹ ہو، دینے کے لیے کوئی۔نظام کائنات عدل وانصاف پر قائم ہے۔اس کائنات کی ہر چیز گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ قائم کرنے والا ہے۔اس دنیا کی درستگی اور کامیابی کے لیے انسان کو اپنے اختیار کی حد تک ترازو کے تولنے میں عدل وانصاف کو قائم کرے۔اس میں ذرا رخنہ پیدا ہونے سے ہماری زندگی اپنے مرکز سے نکل جائے گی اور تہذیب وتمدن میں فساد برپا ہو جائے گا۔عدل وانصاف کی اہمیت اور فضیلت کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا۔مولانا امین احسن اصلاحی اسے ''تمام اعمال کے لیے معیار'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا**:"یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال کے لیے مقرر فرمایا ہے کہ وہ لوگوں پر ان کی برداشت اور ان کے امکان سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔اس سے ایک بات تو یہ نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیے ہیں انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیے ہیں، ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔دوسری یہ کہ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پوری دیانت وصداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے، اگر بلا ارادہ اس کے کسی پہلو میں کوئی بھول چوک یا کوتاہی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔معیار مطلوب کی اس وضاحت سے احتیاط میں شدت وغلو کی نفی بھی مقصود ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے جی سے اس سے آگے بڑھ کر گول باندھنے کی

کی کوشش کریں جو خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ البتہ اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ہماری صوابدید پر منحصر ہے کہ ہم اپنی طاقت واستطاعت کی حد خود مقرر کریں اور پھر اسے مزعومہ طاقت واستطاعت کے پیمانہ سے ناپ کر اپنے لیے خدا کے احکام وشرائع میں سے انتخاب کریں کہ اتنا ہم سے ہوسکتا ہے یہ ہم کریں گے باقی ہماری استطاعت سے باہر ہے اس وجہ سے ہم اس کے مکلّف نہیں۔ اللہ تعالی نے اپنی شریعت کے باب میں یہ اختیار کسی کو نہیں بخشا ہے۔''(۱)

سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

''یہ اگر چہ شریعت الٰہی کا ایک مستقل اصول ہے، لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں راستی وانصاف سے کام لینے کی کوشش کرے، وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ بھول چوک یا نادانستہ کمی وبیشی ہو جانے پر اس سے باز پرس نہ ہوگی۔''(۲)

دوسرے مقام پر اسی حکم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَاَوْفُو الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاوِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۵)

پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔

یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی، بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سد باب کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''ایفائے کیل ووزن کی تاکید'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''ایفائے عہد کی تاکید کے بعد ایفائے کیل ووزن کی تاکید ہے کہ آپس کے لین دین میں جب کوئی چیز ناپو یا تولو تو ناپ تول میں کوئی خیانت نہ کرو۔ ناپو صحیح پیمانے سے اور تولو ٹھیک ترازو سے۔ یہی طریقہ بہتر اور انجام کار کے اعتبار سے یہی اچھا ہے۔ یعنی معاشی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی یہی طریقہ سودمند ہے اور مآل کار کے پہلو سے بھی یہی طریقہ بہتر ہے اس لیے کہ خدا کو پسند یہی طریقہ ہے۔ جو قوم ڈنڈی ماری کو شیوہ بنا لیتی ہے بظاہر اس کے کچھ افراد اپنی دانست میں نفع کماتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اس عدل وصداقت کی بنیاد ہی کو ڈھا دیتے ہیں جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا قیام وبقا منحصر ہے۔''(۳)

ذلك خير و احسن تاويلا :

یہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی انجام کے لحاظ سے بہتر ہے۔ دنیا میں اس کا انجام اس لیے بہتر ہے کہ اس سے باہمی اعتماد قائم ہوتا ہے، بیچنے والا اور خریدار دونوں ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں۔ آخرکار یہ چیز تجارت کے فروغ اور عام خوشحالی کا سبب بنتی ہے۔ آخرت میں انجام کی بہتری کا

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳، ص:۲۰۳

(۲) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۶۰۰

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۵۰۲

انحصار ایمان اور خدا ترسی پر ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی **ذلك خير و احسن تاويلا** کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''یہ الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کے نتائج و برکات کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔آخرت میں اس کی برکات واضح ہیں ۔دنیا میں بھی باعتبار مآل ،جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ،یہی رویہ معاش ومعیشت ،کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطۂ نظر سے بابرکت ہے۔کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے نہ پائے گی یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت ہے۔جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے،خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل وقسط کے تصور سے خالی ہے اس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔چنانچہ سنت الٰہی کے مطابق ایسی قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔''(۴)

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت اور بربادی کی خبر سنائی ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اوپر بیان ہو چکا ہے:

> **وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ O الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ O**
> **وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ (المطففين۸۳:۱،۲،۳)**
> ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی تباہی ہے کہ لوگوں سے لیں تو پورا ناپ کر لیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔

المطففين، تطفيف سے ماخوذ ہے جس کے معنی کنارہ اور جانب میں ہونے کے ہیں۔طفف لغت میں کنارہ کو کہا جاتا ہے اور کمی کرنے کو بھی کہتے ہیں۔عربی زبان میں طفیف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف ناپ تول میں خفیہ طور پر کمی کرنے کے لیے مستعمل ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا، بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بے چارے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ تاجر اسے کیا اور کتنا گھاٹا دے گیا ہے۔زجاج کے نزدیک مطفف پیمانہ اور ترازو میں کمی کرنے والے کو کہتے ہیں۔اس لیے کہ وہ اس میں سے کچھ مقدار دھوکہ کی صورت میں کم کر دیتا ہے اسی کو بخس کہتے ہیں۔''اکتیال'' کا مفہوم کوئی چیز ماپ کر لینا اور **كال يكيل** کوئی چیز ماپ کر دوسرے کو دینا کے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:

> ''پانچ گناہوں کی سزا پانچ مصیبتوں کی شکل میں انسان پر واقع ہوتی ہے۔جو شخص عہد شکنی کرتا ہے خدا اس پر اس کے دشمن مسلط کر دیتا ہے۔جو اللہ کا قانون چھوڑ کر دوسرے قانون پر فیصلے کرتے ہیں ان میں فقر واحتیاج آجاتا ہے۔جس قوم میں بے حیائی اور زنا عام ہو جائے تو اس پر طاعون اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض مسلط ہوتے ہیں اور جو ناپ تول میں کمی کریں ان پر قحط واقع ہوتا ہے اور جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان سے بارش کو روک لیتا ہے۔''(۵)

غرض قرآن مجید میں ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔سورہ رحمٰن (آیت ۸۔۹) میں تاکید کی گئی کہ تولنے میں زیادتی نہ کرو، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن کرو اور ترازو میں گھاٹا نہ دو۔قوم شعیب کے عذاب کا سبب ناپ تول میں کمی تھا۔حضرت شعیبؑ کے بار بار سمجھانے سے بھی یہ قوم ناپ تول میں کمی کرنے سے باز نہ آئی۔

---

(۴)مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۳،ص:۲۰۲،۲۰۳

(۵)المعجم الکبیر للطبرانی، باب التاء الاختلاف عن الاعمش فی حدیث عبداللہ بن العباس، رقم:۱۰۸۳۷

۱۱۔جھوٹی قسمیں کھانا

لَاتَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَ تُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ۔لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِيۡٓ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ(البقرہ ۲:۲۲۴،۲۲۵)

اور اپنی قسموں کے لیے اللہ (کے نام) کو نشانہ نہ بناؤ کہ تم حسن سلوک اور پرہیز گاری اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے باز رہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔اللہ تمہیں نہیں پکڑتا تمہاری بیہودہ قسموں پر۔لیکن تمہیں پکڑتا ہے اس پر جو تمہارے دلوں نے کمایا (ارادہ سے کیا) اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> **عرضة** کے معنی ہدف اور نشانے کے ہیں۔اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام پر بے ضرورت اور لایعنی قسمیں یا ایسی قسمیں کھائی جائیں جو نیکی وتقوی اور مقصد اصلاح کے خلاف ہوں۔خدا کے عظیم نام کو لایعنی قسموں کے لیے استعمال کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لیے توپ داغتا پھرے اور نیکی اور تقوی کے خلاف قسموں کے لیے اس کے پاک نام کو استعمال کرنا گویا اسی کے نام سے نیکی اور تقوی کی جڑ کاٹنا ہے جو تمام نیکی اور تمام خیر کا سرچشمہ ہے۔
>
> عربی زبان میں اَن سے پہلے بعض حالات میں مضاف اور بعض مواقع میں اس کے بعد حرف لا کو حذف کر دیتے ہیں ۔اس محذوف کو سیاق وسباق سے سمجھتے ہیں۔یہاں واضح قرینہ ہے کہ ان کے بعد لا محذوف ہے۔
>
> بر،تقوی اور اصلاح تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کی تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔''بر'' ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین،رشتہ داروں،مسکینوں،یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔''تقوی'' ان نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور''اصلاح'' سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہیں۔(۱)

گزشتہ آیت میں تقوی کا حکم مذکور تھا۔اب اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تقوی کا مقتضی یہ ہے کہ خدا تعالی کے نام پاک کا ادب اور احترام ملحوظ رکھو اور بات بات میں اللہ تعالی کی قسم نہ کھاؤ اور دنیاوی اغراض اور منافع کے لیے اللہ تعالی کے نام پاک کو استعمال کرو یہ سب ادب کے خلاف ہے۔
مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عبد اللہ بن رواحہؓ اور ان کے داماد بشیر بن نعمانؓ میں کسی بات پر کچھ تکرار ہوا۔عبد اللہ بن رواحہؓ نے قسم کھائی کہ میں نہ تم سے ملوں گا اور نہ تم سے کلام کروں گا اور نہ تمہاری کسی بھلائی اور برائی میں دخل دوں گا۔اس کے بعد عبد اللہ سے جب کوئی اس بارے میں بات کرتا اور کچھ کہنا چاہتا تو یہ کہہ دیتے کہ میں نے اللہ کی قسم کھالی ہے اس لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ یعنی رشتہ داروں میں سلوک اور احسان کرنے کے لیے تقوی اور پرہیز گاری کا کام کرنے کے لیے اور لوگوں میں صلح کرانے کے لیے قسم کو بہانہ نہ بناؤ اور یہ نہ کہو کہ میں نے قسم کھالی ہے اس لیے میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''(۲)

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۵۳۰

(۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۴۲۴

مولانا محمد ادلیس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کی قسم کھالے خواہ وہ اچھی ہو یا بری اس پر قائم رہنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ قسم کی وجہ سے نیک کام کو نہ چھوڑ و اور ایسی حالت میں قسم کو توڑ کر کفارہ دے دو اور نیک کام کر و تا کہ تم کو کار خیر کا اجر حاصل ہو۔ایسی قسم کے توڑنے میں اللہ تعالیٰ تمہارے عذر کو سننے والا ہے اور تمہاری نیتوں کا جاننے والا ہے کہ تمہاری نیت اللہ تعالیٰ کے کے نام کی بے حرمتی نہ تھی۔محض تعمیل حکم اور نیکی کرنے کے لیے قسم کو توڑا ہے اور بصد ہزار ندامت و پشیمانی اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کیا ہے۔حدیث میں ہے کہ جو شخص نیک عمل کے چھوڑنے اور نہ کرنے پر قسم کھالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ نیک کام کرے اور قسم توڑنے کا کفارہ دے۔

یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے کہ کس نیت سے قسم کھائی ہے۔تمہارا لفظ اور قصد کوئی بھی اس سے مخفی نہیں۔لہذا قسم کھاتے وقت لفظوں میں احتیاط رکھو اور نیت اور ارادہ کرنے میں بھی احتیاط رکھو اور قسم کے متعلق ہمارا یہ ضابطہ یادرکھو کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے ان قسموں پر مواخذہ اور گرفت نہیں کریں گے جو بلاقصد وارادہ تمہاری زبان سے نکل گئی ہیں یا قصد اور ارادہ تو تھا مگر تم اس کو اپنے گمان میں راست اور صحیح سمجھتے تھے۔ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ گناہ،لیکن اللہ تعالیٰ تم سے ان قسموں پر آخرت میں مواخذہ فرمائیں گے کہ جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے اور معصیت کرنے کا قصد وارادہ کیا ہے یا اس قسم کو کسی بر وتقوی سے علیحدہ رہنے کا ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے کہ یمین لغو پر مواخذہ نہیں فرماتا اور بڑا حلیم و بردبار ہے کہ باوجود بالقصد وارادہ جھوٹی قسم کھانے کے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا شاید توبہ کرلے۔توبہ کے لیے مہلت دیتے ہیں۔''

یمین یعنی قسم کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔یمین لغو :

''اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یمین لغو وہ ہے کہ کسی گزشتہ چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھالے اور واقع میں اس کے خلاف ہو لیکن اس نے اپنے گمان میں اس کو سچ سمجھ کر قسم کھالی ایسی قسم میں نہ کوئی کفارہ ہے اور نہ کوئی گناہ۔امام شافعیؒ کے نزدیک یمین لغو سے مراد وہ قسم ہے جو انسان کی زبان سے ارادے کے بغیر نکل جائے۔جیسے عرب میں **لا واللہ** اور **بلٰی واللّٰہ** تکیہ کلام تھا۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس میں ارادہ ہوا گر وہ نفس الامر کے خلاف ہو تو اس میں کفارہ واجب ہو گا۔اگرچہ قسم کھانے والے کے گمان میں وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔''

۲۔یمین غموس:

دوسری قسم یمین غموس ہے وہ یہ کہ کسی گزرری ہوئی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔امام اعظمؒ کے نزدیک اس قسم کی قسم پر حسب ارشاد باری **وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُم** گناہ ہے جس کا علاج توبہ اور استغفار ہے۔دنیا میں اس پر کوئی کفارہ نہیں۔اس لیے کہ کسی گزشتہ امر پر دیدہ ودانستہ قسم کھانا جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنے پر گناہ ہوتا ہے کفارہ نہیں۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ واجب ہے۔امام اعظم کے نزدیک **وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُم** میں اخروی مواخذہ مراد ہے یعنی دیدہ ودانستہ جھوٹ بولنے پر عذاب دینا مراد ہے کفارہ مراد نہیں۔

۳۔یمین منعقدہ :

یمین منعقدہ سے مراد ہے کہ آئندہ فعل کے متعلق قصداً قسم کھائے کہ کروں گا یا نہیں کروں گا۔ایسی قسم کے توڑنے پر بلا اتفاق کفارہ واجب ہوتا ہے اور سورہ مائدہ میں **وَلٰـكِـنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَاعَقَدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَام الخ** سے یہی یمین منعقدہ مراد ہے۔۔اسی قسم یعنی فعل آئندہ پر قسم کھانے کا حکم مذکور ہے کہ اگر تم آئندہ کے متعلق کسی گناہ اور خلاف بر وتقوی کام کی قسم کھا بیٹھے ہو کہ واللہ اپنے باپ یا رشتہ دار سے بات نہ کروں گا تو تم کو لازم ہے کہ ایسی قسم کا توڑ اور کفارہ دو۔جیسا کہ اس آیت کا شان نزول اس معنی کا شاہد عدل ہے۔لیکن اس آیت میں صرف اخروی مواخذہ کا ذکر ہے۔دنیاوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر سورہ مائدہ میں آئے گا اور سورہ نور کی آیت میں بھی اسی قسم کی قسم کا ذکر ہے۔

وَلَا يَــــاتِــلَ اُولُـــوا الْــفَــضْــلِ مِــنْــكُــمْ وَالسَّــعَةِ اَنْ يُــؤْتُــوْٓا اُولِـــى الْــقُــرْبٰـــى وَالْــمَسٰــكِيْــنَ وَالْــمُهَــاجِــرِيْــنَ فِــى سَبِيْــلِ الـلّٰـــهِ (الــنــور ۲۲:۲۴)

اور قسم نہ کھائیں تم میں سے فضیلت والے اور (مال میں) وسعت والے کہ وہ رشتہ داروں کو، مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دیں گے۔

ابوبکر صدیقؓ نے قسم کھالی تھی کہ میں مسطح کو خرچ نہ دوں گا اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسطح کا وظیفہ دو چند کر دیا۔(۳)

سورہ بقرہ کی زیر تفسیر آیت میں یمین لغو اور یمین منعقدہ کا ذکر ہے۔اس میں یمین غموس کا ذکر نہیں ہے۔یمین غموس کا ذکر اس آیت میں ہے:

ان الذين يشترون بعهدالله وايمانهم ثمنا قليلا۔(البقرہ۲:۷۷)

اس آیت میں یمین غموس پر اخروی موخذہ کا ذکر ہے۔دنیاوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر نہیں۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یمین غموس کی حقیقت جھوٹ اور افترا ء ہے جو اعلی درجے کا گناہ کبیرہ ہے۔جس میں توبہ اور استغفار واجب ہے مگر کفارہ نہیں۔اسی طرح اس آیت میں بھی یمین غموس کی طرف اشارہ ہے۔

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور(الحج ۲۲:۳۰)

قسم کے متعلق دوسرا حکم سورہ مائدہ میں بیان ہوا ہے،ارشاد الٰہی ہے:

لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِا للَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَاعَقَدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةَ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (المائدہ ۵:۸۹)

اللہ تمہارا مواخذہ نہیں کرتا تمہاری بے ہودہ قسموں پر لیکن مواخذہ کرتا ہے (پکڑتا ہے) جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا (پختہ قسم پر) سواس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے اوسط (درجہ) کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انہیں کپڑے پہنانا یا ایک گردن غلام آزاد کرنا پس جو یہ نہ پائے وہ تین دن روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔جب تم قسم کھاؤ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔

---

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۴۲۶

کچھ لوگوں نے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسم کھائی تھی۔اسی سلسلے میں اللہ تعالی نے قسم کا حکم بھی بیان فرما دیا کہ اگر کسی شخص کی زبان سے بغیر ارادے کے قسم کا لفظ ادا ہو گیا ہے تو اس قسم کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔اس لیے کہ ایسی قسم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔اگر جان بوجھ کر کسی نے قسم کھائی ہے تو وہ اسے توڑ کر کفارہ ادا کرے۔اس لیے کہ جس نے کسی گناہ اور نافرمانی کی قسم اٹھائی ہو اسے اپنی قسم پر قائم نہیں رہنا چاہیے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالی بندوں کی غیر ارادی قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں دل کے عزم وارادہ سے ظہور میں آئیں گی ،جن کے ذریعہ سے کوئی عہد و پیمان بندھے گا ،جن سے حقوق وفرائض پر کوئی اثر مرتب ہو گا ،جو کسی پہلو سے شریعت کی تحریم و تحلیل پر اثر انداز ہوں گی ،ان پر اللہ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔اللہ کے نام کو (جیسا کہ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے) خلاف شرع یا جھوٹی قسموں کا ہدف بنانے کی اجازت نہیں ہے۔قسم' قول وقرار ،شہادت اور عہد و پیمان کی بنیاد ہے اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی ،اجتماعی اور سیاسی حقوق وفرائض کی اساس ہے بلکہ اس عہد و میثاق کی بھی اساس ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا ہے۔اس وجہ سے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملہ میں نہایت محتاط رہے،کوئی قسم بے ضرورت اور خلاف شرع نہ کھائے ،جو قسم کھائے خلاف شرع نہ ہو تو وہ پوری کرے ،اگر کوئی قسم کھانے کے بعد توڑے تو اس کا کفارہ ادا کرے تا کہ وہ قسم کے معاملے میں سہل انگار ،بے پروا اور بالکل غیر ثقہ اور ناقابل اعتبار آدمی بن کے نہ رہ جائے ،اس لیے کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے کی ذمہ داریوں کا اہل ہے نہ میثاق الٰہی کا ذمہ داریوں کا۔'' (۴)

صحیح احادیث میں تصریح موجود ہے کہ قسم اٹھانے کے بعد آدمی کو معلوم ہوا کہ اس قسم کے توڑنے میں خیر اور اچھائی ہے تو ایسی قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیے۔قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں کپڑے پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا یا تین دن کے روزے رکھنا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کفارہ قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان قسموں پر مواخذہ کرے گا جن کو تم نے مضبوط باندھا ہے اور پکا کر لیا ہے پکی قسم سے مراد یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی پختہ طور پر قسم کھائے تو ایسی قسم کا کفارہ اگر آدمی اس کو پورا نہ کرے تو دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا کھانا دے دینا ہے جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کپڑا پہنا دینا یا کسی غلام یا باندی کو آزاد کر دینا ہے۔یعنی آدمی کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جس کو چاہے اختیار کرے پھر جس شخص کو ان تینوں میں سے کسی ایک کی بھی طاقت نہ ہو یعنی جو شخص غربت کی وجہ سے دس مسکینوں کو کھانا ،کپڑا دینے اور غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی قسم کا کفارہ تین دن کے روزے ہیں جو لگاتار رکھنے ہوں گے۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں **فصیام ثلاثۃ ایام متتابعات** کا لفظ آیا ہے اور جو قراءت متواتر نہ ہو تو کم از کم خبر واحد یا تفسیر صحابی ضرور سمجھی جائے گی جو مرفوع کے حکم میں ہو گی۔'' (۵)

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔اس سے مراد ہے کہ اگر کسی جائز معاملہ میں قسم کھائی ہے تو اسے پورا کرو۔ناجائز معاملہ میں قسم توڑ کر کفارہ ادا کرو۔ایسا نہ ہو کہ قسم توڑ و اور کفارہ ادا نہ کرو۔اس سے مراد یہ بھی لیا گیا ہے کہ قسم اٹھانے میں جلدی نہ کرو۔کسی سخت مجبوری کے علاوہ قسم نہ اٹھاؤ۔اس کا مقصود یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں اللہ کے نام کی عظمت محفوظ رہے۔جھوٹی قسمیں کھا کر اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کرو یہی شکر ہے۔

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۵۸۹

(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۵۷۹، ۵۸۰

۱۲۔عہد شکنی

عہد شکنی سے مراد ہے وعدہ توڑنا۔اسلام میں وعدہ کو پورا کرنے کا حکم ہے۔وعدہ توڑنا کفار اور منافقین کی نشانی بتائی گئی ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ oاَلَّذِيۡنَ عٰهَدْتَّ مِنۡهُمۡ ثُمَّ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَهُمۡ فِىۡ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمۡ لَا يَتَّقُوۡنَ oفَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِى الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ oوَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ (الانفال ۸:۵۵ -۵۸)

بے شک اللہ کے نزدیک سب جانوروں سے بدتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا سو وہ ایمان نہیں لاتے۔وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر بار اپنا معاہدہ توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔پس اگر تم انہیں جنگ میں پاؤ تو (انہیں ایسی سزا دو کہ)ان کے ذریعہ بھگا دو ان کو جو ان کے پیچھے ہیں،عجب نہیں کہ وہ عبرت پکڑیں۔اگر تمہیں کسی قوم سے دغا بازی کا خوف ہو تو (ان کا معاہدہ) پھینک دو ان کی طرف برابری پر (برابری کا جواب دو) بے شک اللہ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ان آیات میں یہود(بنوقریظہ) کی ظالمانہ عادات کا بیان ہے۔ان میں خاص طور پر دو وصف پائے جاتے ہیں،ایک تو یہ کہ یہ کفر پر مصر ہیں دوسرے یہ کہ یہ بدعہد ہیں۔عہد کا خیال نہیں رکھتے ہر بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں اس قدر غرق اور مست ہوئے کہ طبیعت اور فطرت ہی متغیر اور متبدل ہوگئی اور دائرہ انسانیت سے نکل کر جنس حیوانات میں داخل ہو گئے۔حتیٰ کہ بدترین حیوانات اللہ کے نزدیک یہ کافر جن سے آپ نے عہد کیا ہے۔ان کی حالت یہ ہے کہ بار بار عہد باندھتے ہیں پھر وہ ہر بار اپنے عہد کو توڑتے رہتے ہیں۔

بنوقریظہ نے حضور پرنور سے عہد باندھا کہ ہم نہ آپ سے لڑیں گے اور نہ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو مدد دیں گے۔مگر انہوں نے اس عہد کو توڑا اور بار بار اس کے خلاف کیا۔جب آپؐ نے ان سے باز پرس کی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو بھول گئے تھے اور ہم سے غلطی ہوگئی۔ایسے بدعہد،غدار اور مکار کیسے ایمان لا سکتے ہیں اور آئندہ بھی وہ عہد شکنی سے ڈرتے نہیں تو پھر ان کے بدترین حیوانات ہونے میں کیا شک ہے؟

اگر یہ دغا باز اور غدار آپؐ کے مقابل میدان جنگ میں آ جائیں تو ان میں اس قدر خونریزی کیجیے کہ ان کے قتل کا حال معلوم کر کے دوسرے کافر عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کرنے سے ڈریں۔یہ حکم تو ان لوگوں کے متعلق ہے جنھوں نے اعلانیہ عہد کو توڑا اور اگر ابھی تک علانیہ طور پر عہد تو نہیں توڑا مگر آپ کو کسی معاہد جماعت سے خیانت یعنی عہد شکنی کا اندیشہ ہو اور قرائن سے یہ محسوس ہو کہ یہ لوگ درپردہ کوئی شرارت کرنا چاہتے ہیں تو آپ ان کا عہد ان کی طرف پھینک دیں یعنی ان کو اطلاع کر دیں کہ اب ہم میں اور تم میں کوئی عہد نہیں رہا ایسی طرح کہ وہ اور تم اس علم میں برابر ہو جائیں۔محض اندیشہ اور خطرہ کی بنا پر بلا اطلاع دشمن پر حملہ کرنا ایک قسم کی خیانت ہے۔بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور نہ ان کے اس عمل کو پسند کرتا ہے۔خیانت سے مراد وہی نقض عہد ہے۔(۱)

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۳،ص:۳۴۷، ۳۴۸

عہد توڑنے کی اطلاع اس وقت دینی ہوگی جب دشمن عہد توڑنے کی تیاری کر رہا ہو۔ اگر اس نے عہد شکنی کر دی تو پھر اسے اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر بغیر اطلاع کے حملہ کرنا جائز ہے۔ جیسے قریش مکہ نے صلح حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑا تو آپؐ نے قریش کو اطلاع دیے بغیر ان پر حملہ کیا اور مکہ فتح کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اس حوالے سے تین نکات کا ذکر کرتے ہیں:

"**اولاً** قریش کی خلاف ورزی عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نقض عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا، جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقض عہد قوم کو خود بھی اپنے نقض عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ یقیناً ضروری ہے کہ نقض عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

ثـانیـا: نبی ﷺ نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتاً یا اشارتاً و کنایتاً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ایما نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک ان کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپؐ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثا: قریش کے خلاف جنگی کاروائی آپؐ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپؐ کے طرز عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔" (۲)

سید ابوالاعلیٰ مودودی عصر حاضر میں ایک طرف سے معاہدہ توڑنے کی کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یک طرفہ فسخ معاہدہ اور اعلان جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانہ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگ عظیم دوم میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کاروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کاروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھالیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے ان بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔" (۳)

دوسرے مقام پر عہد الٰہی کو پورا کرنے سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ (النحل ۹۱:۱۶)

---

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۱۵۳-۱۵۵

(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۱۵۳-۵۵

اور جب تم (پختہ) عہد کرلو تو اللہ کا عہد پورا کرو اور قسمیں پختہ کرنے کے بعد ان کو نہ توڑو
اور تحقیق تم نے اللہ کو اپنے اوپر اللہ کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں ''عہد نامہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کے ایک ایک حکم کو پوری جماعت کے سامنے پیش کرتے اور اللہ کو گواہ اور ضامن بنا کر لوگوں سے اس کی پابندی کا عہد لیتے اور قسم کھا کر اس کی پابندی کا عہد کرتے۔ اس طرح ان کی پوری شریعت کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد نامہ کی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر تورات کو عہد نامہ کہتے ہیں۔ یہ عہد نامہ جس طرح شریعت کے عام احکام وقوانین پر مشتمل ہے، اسی طرح اس میں وہ عہد بھی شامل ہے جو بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل میں پیدا ہونے والے نبی امی کی تائید ونصرت کا لیا گیا تھا۔ اوپر آیت **ان اللہ یامر بالعدل** کے تحت ہم یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ جن اساسات پر قرآن کے اوامر ومنہیات مبنی ہیں بعینہ انہی اساسات پر تورات کے احکام عشرہ مبنی ہیں۔ قرآن نے یہاں انہی عہود کو یاد دلایا ہے کہ خدا سے جو عہد تم باندھ چکے ہو اس کو پورا کرو اور پابندی عہد کی پکی پکی قسمیں کھانے اور ان پر اللہ کو ضامن اور گواہ ٹھہرانے کے بعد ان کو نہ توڑو، یاد رکھو کہ آج جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے اور کل تمہیں اس عہد کی جواب دہی کرنی ہوگی۔'' (۴)

اللہ تعالیٰ عہد توڑنے کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (النحل ۱۶:۹۲)

اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جانا جس نے اپنا سوت مضبوط کرنے (کاتنے) کے بعد ٹکڑے ٹکڑے توڑ ڈالا، تم بناتے ہو اپنی قسموں کو اپنے درمیان دخل دینے کا بہانہ کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر غالب آ جائے، اس کے سوا نہیں کہ اللہ تمہیں اس سے آزماتا ہے، اور وہ روز قیامت تم پر ضرور ظاہر کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔

عہد شکنی کر کے تم اس عورت کی مانند نہ بنو جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد توڑ ڈالا اور بوٹی بوٹی کر کے اس نے نوچ ڈالا کی تفسیر میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''قریش میں ایک عورت تھی جس کا نام ریطہ تھا وہ بڑی بے وقوف اور احمق تھی صبح سے لے کر دوپہر تک خود بھی سوت کاتتی اور اپنی لڑکیوں سے بھی کتواتی۔ جب دوپہر ہو جاتی تو وہ عورت ان کو حکم دیتی کہ جس قدر سوت تم نے کاتا ہے سب توڑ ڈالو ہمیشہ ہی اس کی عادت تھی۔ مفسرین کہتے ہیں یہ محض تمثیل ہے کسی عورت کی طرف اشارہ نہیں، اس سے فقط مثال دینا مقصود ہے کہ عہد کا توڑنا ایسا ہی ہے جیسے سوت کات کر اس کو توڑ ڈالنا۔ حق تعالیٰ نے عہد کے توڑنے کو تاگا توڑنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور نصیحت فرمائی ہے کہ جس طرح وہ احمق عورت اپنے تاگے کو توڑ دیتی تھی تم اس کی طرح اپنے عہد کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو۔

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۴۴۱، ۴۴۲

کیا تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکہ اور فریب اور دغل کا ذریعہ اور بہانہ بنانا چاہتے ہو کہ تمہاری قسم سے مطمئن ہو کر دوسرا دھوکہ کھا جائے اور تمہارا یہ قسم توڑنا محض اس بنا پر ہے کہ ایک گروہ مال و دولت اور عددی کثرت میں دوسرے گروہ سے بڑھا ہوا ہے۔عرب کے لوگ ایک قوم کے ساتھ عہد کر لیتے اور وہ قوم ان کی طرف سے اطمینان کر لیتی۔ پھر جب دوسری قوم کو ان سے مال و دولت،قوت اور عددی کثرت میں زیادہ دیکھتے تو ان سے عہد کر لیتے اور کمزور قوم کا عہد توڑ دیتے اور حیلے اور بہانے بنا کر ان سے عذر کر دیتے جیسے آج کل مغربی اقوام کا یہی شیوہ بنا ہوا ہے خدا تعالی نے اس سے منع فرمایا اور وفاء عہد کا حکم دیا۔

جز ایں نیست کہ اللہ تعالی تم کو اس حکم سے آزماتا ہے کہ دیکھیں عہد پورا کرتے ہیں یا جس کا پلہ قوت اور کثرت میں جھکا ہوا دیکھا ادھر جھک جاتے ہیں اور بے شک اللہ قیامت کے دن اس چیز کی حقیقت کو ظاہر کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے تم نے عہد توڑتے وقت یہ خیال کیا کہ جو جماعت زبردست اور کثیر التعداد ہے اس کے ساتھ ملنے میں عزت ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ عزت نہیں بلکہ ذلت ہے اور دنیا و آخرت میں فضیحت و رسوائی کا ذریعہ ہے۔قیامت کے دن اللہ تعالی تمہاری اس عہد شکنی کی حقیقت کو ظاہر کر دے گا اور سب کے سامنے تم کو فضیحت کرے گا۔''(۵)

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

یہاں خصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر موجب فساد ہوتی ہے اور جسے بڑے بڑے اونچے درجے کے لوگ بھی کار ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داد پاتے ہیں۔قوموں اور گروہوں کی سیاسی،معاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کا لیڈر ایک وقت میں دوسری قوم سے ایک معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد کی خاطر یا تو اسے اعلانیہ توڑ دیتا ہے یا در پردہ اس کی خلاف ورزی کر کے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ تک کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راست باز ہوتے ہیں اور ان حرکتوں پر یہ نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اٹھتی بلکہ ہر طرف سے ان کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس طرح کی چالبازیوں کو ڈپلومیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔اللہ تعالی اس پر متنبہ فرماتا ہے کہ ہر معاہدہ دراصل اس معاہدہ کرنے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوں گے وہ اللہ کی عدالت میں مواخذے سے نہ بچ سکیں گے۔

اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا:

''یہ فیصلہ قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنیاد پر تمہارے درمیان کش مکش برپا ہے،ان میں برسر حق کون ہے اور برسر باطل کون؟لیکن بہر حال،خواہ کوئی سراسر حق پر ہی کیوں نہ ہو،اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پرست ہی کیوں نہ ہو،اس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلے میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہوگا،کیونکہ حق پرستی صرف نظریے اور مقصد ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی،طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے۔یہ بات خصوصیت کے ساتھ ان مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جارہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرف دار ہیں اور

---

(۵)مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن(لاہور:مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۲۴ھ)ج:۴،ص:۳۹۹،۴۰۰

ہمارا فریق مقابل خدا کا باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقے سے بھی ممکن ہو زک پہنچائیں۔ ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفائے عہد کا لحاظ رکھیں۔ ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ **لیس علینا فی الامیین سبیل**: یعنی مشرکین عرب کے معاملے میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے، ان سے ہر طرح کی خیانت کی جاسکتی ہے، جس چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو زک پہنچے وہ بالکل روا ہے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔(۶)

قسم بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہے لہذا اسے مکر وفریب کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل ۱۶:۹۴)

اور تم نہ بناؤ اپنی قسموں کو اپنے درمیان دخل کا بہانہ کہ کوئی قدم اپنے جم جانے کے بعد پھسل جائے اور تم اس کے نتیجہ میں وبال چکھو کہ تم نے روکا اللہ کے راستہ سے، اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے عہد پر قائم رہنے کی تاکید اور بدعہدی کی تحدید فرماتے ہیں۔ اور مت بناوا پنی قسموں کو آپس میں دغا اور دخل اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا قدم جم جانے کے بعد پھسل جائے گا۔ یہ ایک مثل ہے ایسے شخص کی جو سیدھی راہ پر تھا پھر اس کا قدم ڈگمگا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جھوٹی قسموں کو مکر وفریب کا ذریعہ بنا کر راہ راست سے نہ ہٹو۔ استقامت کے بعد طریق ہدایت سے ہٹنا بہت برا ہے اور تم چکھو دنیا میں سزا اس بات کی کہ تم نے عہد شکنی کر کے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا کیونکہ تمہیں دیکھ کر دوسرے بھی عہد شکنی کریں گے اور غیر مسلم سمجھیں گے کہ جب مسلمان عہد شکن ہیں تو ان کا مذہب بھی عہد شکنی کی تعلیم دیتا ہوگا۔ یا کم از کم ان کے مذہب میں عہد شکنی کی ممانعت نہ ہوگی۔ یہ دیکھ کر غیر مسلم اسلام سے متنفر ہو جائیں گے اور جس کا اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ بھی ہوگا وہ اسلام میں داخل نہ ہوگا اس طرح تم لوگوں کو راہ خدا سے روکنے کا ذریعہ بنو گے۔ اور تم کو دنیا میں اس کی برائی چکھنی ہوگی اور آخرت میں تمہارے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا۔ جو دنیا کے عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہوگا اور چونکہ انسان بعض مرتبہ مال ومنال اور جاہ وجلال کو دیکھ کر حرص وطمع میں عہد شکنی کرتا ہے اس لیے آئندہ آیت میں اس کی ممانعت فرماتے ہیں۔''(۷)

غرض عہد تین قسم کے ہیں۔ اللہ سے، اپنے نفس سے اور لوگوں سے کیے گئے عہد۔ اللہ رب العزت نے ہر قسم کے وعدے کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ عہد شکنی منافقین کی علامت ہے۔ مسلمان عہد کو پورا کرتا ہے۔ یہود ثمن قلیل کی وجہ سے عہد الٰہی کو توڑتے تھے۔ ان کی تحریف شدہ کتابیں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ یہود بنو قریظہ کو ان کی اپنی کتاب کے مطابق بدعہدی کی سزا دی گئی جو کہ ان کا قتل عام تھا۔ وعدہ کر کے توڑ ڈالنا اپنی محنت کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر دینے کی مانند ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ پورا کرنے کا اجر جبکہ بدعہدی کی سزا دے گا۔

---

(۶) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص: ۵۶۷، ۵۶۸

(۷) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۴، ص: ۴۰۰، ۴۰۱

۱۳۔ بہتان تراشی

بہتان سے مراد ہے کسی پر جھوٹا الزام لگانا۔ کسی برے کام کو کسی ایسے آدمی سے منسوب کرنا جس نے وہ کام نہ کیا ہو۔ حسد، دشمنی اور ضد کی وجہ سے اس پر الزام لگا دینا۔ قرآن عظیم نے بہتان کی تعریف کا تعین کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَااكْتَسَبُوْا
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُبِيْنًا (الاحزاب ۳۳:۵۸)

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں، بغیر اس کے
کہ انہوں نے کچھ کیا ہو تو البتہ انہوں نے اٹھایا بہتان اور صریح گناہ

نبی مکرم ﷺ نے بہتان کی تعریف کرتے ہوئے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِی اَخِی مَااَقُوْلُ قَالَ اَنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ اِغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابہؓ کہنے لگے اللہ اور اس کا رسولؐ خوب جانتے ہیں۔ فرمایا تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔ عرض کیا گیا اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جو میں نے کہا؟ فرمایا: اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔''

یہ آیت اور حدیث بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہیں کہ کسی آدمی کی طرف ایسا عیب یا جرم منسوب کرنا جو اس نے کیا ہی نہ ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک یہ مسلمانوں کی اخلاقی ساخت کو مجروح کرنے کے لیے منافقین کی مہم تھی:

''ان منافقین کے دلوں پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کو دوسرے تمام گروہوں کے مقابل میں غیر معمولی اخلاقی برتری حاصل ہے جو ان کی دعوت کی مقبولیت میں بڑے اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے حسد کے جنون میں اس کا یہ توڑ نکالا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے خلاف بے سروپا الزامات تراشیں اور لوگوں میں ان کو پھیلائیں تا کہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ مجروح اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ واقعہ افک کی تفصیلات سورہ نور کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ فتنہ بھی اسی مقصد سے اٹھایا گیا تھا۔ یہاں اللہ تعالی نے ان کی اس سعی نامراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹے الزامات میں ملوث کر رہے ہیں وہ صریح بہتان اور کھلے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اس روش سے اگر باز نہ آئے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔'' (۲)

---

(۱) صحيح مسلم ،كتاب البر والصلة والآداب،باب تحريم الغيبة ،رقم :۲۵۸۹

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۲۶۸

قرآن مجید نے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے حوالے سے حضرت مریمؑ سے متعلق بہتان عظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا (النسآء ۴:۱۵۶)

اوران کے کفر اور مریمؑ پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے (ان کو سزا ملی)

سید ابوالاعلی مودودی اس بہتان کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حضرت عیسیٰؑ کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰؑ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء اور فقہا کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ! زانیہ ہیں اور عیسیٰؑ ابن مریم ولد زنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہے کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالی نے اسے ظلم اور جھوٹ کی بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا، نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔''(۳)

یہودیوں کے کفر پر کفر کرنے اور حضرت مریمؑ پر بہت بڑا جھوٹا الزام لگانے کی وجہ سے وہ اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا شکار ہوئے۔ اس عظیم بہتان کو سن کر آدمی کے رنگ اڑ جاتے ہیں اور انسان حیران ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی اہانت اور تکذیب کے لیے حضرت مریمؑ پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔ کسی کی ماں کو زانیہ کہنا اس کی اہانت ہے۔ العیاذ باللہ اس شخص کو زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کہا جا رہا ہے۔ جو کہ اس کی کھلم کھلا توہین ہے۔ پھر نعوذ باللہ من ذلک نبی کے حق میں ایسا تصور بدترین کفر ہے۔ اس میں تکذیب یعنی جھٹلانے کا پہلو یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت مریمؑ کی پاکیزگی اپنی الہامی کتابوں میں اور عیسیٰؑ کی تیسرے دن کی معجزانہ تقریر سے واضح کر دی۔ اللہ تعالی انبیاء کے نسب کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس لیے حضرت مریمؑ پر بہتان عظیم لگانا ان کی پاکیزگی اور اللہ کی طرف سے کی جانے والی براءت اور نزاہت کو جھٹلانا ہے۔ اس لیے اللہ تعالی نے عیسیٰؑ کی تیسرے دن کی معجزانہ تقریر سے اس شبہے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی جو ولادت مسیحؑ کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ناراض ہوتا اور اسے طلاق دے کر کسی اور عورت سے نکاح کرنا چاہتا تو پہلی بیوی پر جھوٹی تہمت لگاتا اور مختلف طریقوں سے اس کو ستاتا تاکہ مجبور ہو کر پہلی بیوی مہر واپس کر دے اور یہ مہر کی رقم نئے نکاح میں کام آئے۔ اس کی ممانعت میں یہ آیت نازل ہوئی:

اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا (النسآء ۴:۲۰)

کیا تم وہ (مہر) لیتے ہو بہتان (لگا کر) اور کھلے گناہ سے

---

(۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص: ۴۱۷، ۴۱۸

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ اگر عورتیں بے قصور ہوں اور بدکار اور نافرمان نہ ہوں اور تم ان کو محض اپنی رغبت سے چھوڑنا چاہو تو پھر ان کو ستا کر اور اور تنگ کر کے اپنا دیا ہوا مہر ان سے واپس لینا تمہارے لیے روا نہیں خواہ وہ دیا ہوا مہر کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو کیونکہ جب وہ بے قصور ہیں تو ان کو ایذا پہنچانا حرام ہے۔ اگر تم پہلی بیوی کو جو بے قصور ہے اور تم صرف اپنی طبعی رغبت کی بنا پر اسے طلاق دے کر دوسری بیوی کرنا چاہو تو پہلی بیوی کو مال کا ایک خزانہ دے چکے ہو تو تم اس دیے ہوئے مال میں سے کوئی چیز واپس نہ لو کیا تم اس دیئے ہوئے مال کو تہمت لگا کر اور صریح گناہ کے ذریعے واپس لینا چاہتے ہو۔ یعنی اگر تم بلاوجہ اور بے قصور پہلی بیوی سے مہر واپس لو گے تو یہ ناحق اور کھلا گناہ ہوگا۔ اگلی آیت میں فرمایا:

وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا (النسآء ۴:۲۱)

اور تم وہ (مہر) کیسے واپس لو گے اور البتہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ چکا (صحبت کر چکا) اور انہوں نے تم سے پختہ عہد لیا۔
امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کہ جب میاں اور بیوی ایک جگہ خلوت میں جمع ہو جائیں اور کوئی امر شرعی جماع سے مانع نہ رہا ہو تو عورت کا پورا مہر مرد کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے خواہ جماع متحقق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ افضاء کے معنی فضاء یعنی خالی جگہ جانے کے ہیں معلوم ہوا محض افضاء یعنی خلوت ہو جانے سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک ہمبستری یعنی جماع کے بعد پورا مہر واجب ہوتا ہے اور اگر جماع سے پہلے طلاق دیدے تو اس کے ذمہ آدھا مہر ہوگا ۔ ایک سخت عہد (ایجاب وقبول) کے بعد مہر واپس لینا اس عہد کی خلاف ورزی، سخت بے مروتی اور عہد شکنی ہے۔'' (۴)

کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا قذف کہلاتا ہے۔ یہ ایک قابل تعزیر جرم ہے جس کے بارے میں ارشاد الہی ہے:

وَالَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِيۡنَ جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ
(النور ۲۴:۴،۵)

اور جو لوگ تہمت لگائیں پاک دامن عورتوں پر، پھر وہ اس پر چار گواہ نہ لائیں تو تم انہیں اسی کوڑے مارو اور تم قبول نہ کرو کبھی ان کی گواہی یہی نافرمان لوگ ہیں۔ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور انہوں نے اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کی جامع تفسیر کی ہے۔ وہاں سے مختصرا لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) **والذین یرمون** کے معنی ہیں وہ لوگ جو الزام لگائیں۔ اس کا سیاق وسباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد زنا کا الزام ہے۔ علماء امت کا اجماع ہے کہ **یرمون المحصنٰت** سے مراد وہ الزام ہے جو پاک دامنی کے خلاف ہو۔ جس کے لیے علماء نے قذف کی مستقل اصطلاح مقرر کر دی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانون اسلامی میں صرف زنا کا نصاب شہادت ہے۔ قذف کے سوا دوسری تہمتوں کی سزا قاضی خود تجویز کر سکتا ہے، یا مملکت کی مجلس شوریٰ حسب ضرورت ان کے لیے توہین اور ازالہ حیثیت عرفی کا کوئی عام قانون بنا سکتی ہے۔

---

(۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۱۷۰،۱۷۱

(۲) آیت میں اگر چہ الفاظ **یرمون المحصنٰت** (پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں) استعمال ہوئے ہیں، لیکن فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ حکم صرف عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے ۔۔۔عورتیں بھی اگر جرم قذف کی مرتکب ہوں تو وہ اسی حکم کی سزاوار ہوں گے ۔ کیونکہ جرم کی شناعت میں قاذف یا مقذوف کے مرد یا عورت ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لہذا قانون کی شکل یہ ہوگی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاکدامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے اس کا یہی حکم ہے ۔محصن اور محصنہ سے شادی شدہ نہیں بلکہ پاک دامن مرد اور عورتیں ہیں ۔

(۳) غیر محصن پر الزام لگانے کی صورت میں اس سزا کا اطلاق نہیں ہوسکتا ۔غیر محصن اگر بدکاری میں معروف ہو تب تو اس پر الزام لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلا ثبوت الزام لگانے والے لیے قاضی خود سزا تجویز کر سکتا ہے، یا ایسی صورتوں کے لیے مجلس شوریٰ حسب ضرورت قانون بنا سکتی ہے ۔

(۴) کسی فعل قذف کے مستلزم سزا ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بدکاری کا بلا ثبوت الزام لگایا ہے ، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں، اور کچھ مقذوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) میں ،اور کچھ خود فعل قذف میں پائی جانی ضروری ہیں ۔

قاذف میں جو شرطیں موجود ہوں، وہ یہ ہیں:

اول : یہ کہ وہ بالغ ہو ۔بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جا سکتی ہے ،مگر اس پر حد جاری نہیں کی جا سکتی ۔

دوم : یہ کہ وہ عاقل ہو۔مجنون پر حد قذف جاری نہیں ہوسکتی ۔اسی طرح حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں مثلاً کلوروفارم کے زیر اثر الزام لگانے والے کو بھی مجرم نہیں ٹھیرایا جا سکتا ۔

سوم : یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (فقہا کی اصطلاح میں طائعا) یہ حرکت کی ہو ۔کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

چہارم : یہ کہ وہ مقذوف کا اپنا باپ دادا نہ ہو، کیونکہ ان پر حد قذف جاری نہیں کی جا سکتی ۔

ان کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ وہ ناطق ہو گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حد قذف کا مستوجب نہ ہوگا ۔لیکن امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، تو وہ قاذف ہے، کیونکہ اس کا اشارہ ایک شخص کو بدنام و رسوا کر دینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔اس کے برعکس حنفیہ کے نزدیک محض اشارے کی صراحت اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ایک آدمی کو اسی کوڑوں کی سزا دے ڈالی جائے ۔وہ اس پر صرف تعزیر دیتے ہیں ۔

مقذوف کے اندر جو شرطیں پائی جانی چاہییں ، وہ یہ ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عاقل ہو یعنی اس پر بحالت عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو ۔مجنون پر (خواہ بعد میں عاقل ہو گیا ہو یا نہ ہوا ہو) الزام لگانے والا حد قذف کا مستحق نہیں ہے ۔کیونکہ مجنون اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حد زنا کا مستحق ہوتا ہے، نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے ۔لہذا اس پر الزام لگانے والا بھی حد

قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیے۔لیکن امام مالکؒ اورامام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ بہرحال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔یعنی اس پر بحالت بلوغ زنا کا ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو بچے پر الزام لگانا، یا جوان پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتکب ہوا تھا حد قذف کا موجب نہیں کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کرسکتا، نہ وہ حد زنا کا مستوجب ہوتا ہے اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔لیکن امام مالک کہتے ہیں کہ سن بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذف حد کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرانے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو، تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہوجاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہوجاتا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو یعنی اس پر بحالت اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالت کفر اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، موجب حد نہیں ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔لونڈی یا غلام پر الزام، یا آزاد پر یہ الزام کہ وہ بحالت غلامی اس کا مرتکب ہوا تھا ،موجب حد نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔خود قرآن میں بھی غلامی کی حالت کو احصان کی حالت قرار نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ سورہ نسآء میں محصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔لیکن داؤد ظاہری اس دلیل کو نہیں مانتے۔وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حد کا مستحق ہے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبہ زنا سے پاک ہو۔زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرم زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔شبہ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح فاسد، یا خفیہ نکاح یا مشتبہ ملکیت یا شبہ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالات زندگی ایسے ہوں جن میں اس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں ہوسکتا ہو اور نہ زنا سے کم تر درجے کی بداخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی عفت مجروح ہوجاتی ہے، اور ایسی عفت پر الزام لگانے والا ۸۰ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہوسکتا۔حتیٰ کہ اگر حد قذف جاری ہونے سے پہلے مقذوف کے خلاف کسی جرم زنا کی شہادت قائم ہوجائے ،تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔مگر ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجنون یا بچے یا کافر یا غلام یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزام زنا لگا دینے والا مستحق تعزیر بھی نہیں ہے۔

اب وہ شرطیں لیجیے جو خود فعل قذف میں پائی جانی چاہییں۔

ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز قذف بنا سکتی ہے۔یا تو قاذف نے مقذوف پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقذوف پر حد واجب ہوجائے۔یا پھر اس نے مقذوف کو ولد الزنا قرار دیا ہو۔لیکن دونوں صورتوں میں الزام صاف اور صریح ہونا چاہیے۔کنایات کا اعتبار نہیں ہے، جن سے زنا یا طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے۔مثلاً کسی کو فاسق، فاجر، بدکار، بدچلن وغیرہ الفاظ سے یاد کرنا، یا کسی عورت کو رنڈی، کسبن یا چھنال کہنا یا کسی سید کو پٹھان کہہ دینا کنایہ ہے، جس سے صریح قذف لازم نہیں آتا۔اس طرح جو الفاظ محض گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً حرامی یا حرام زادہ وغیرہ، ان کو بھی صریح قذف نہیں قرار دیا جاسکتا۔

البتہ تعریض کے معاملے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے یوں کہے کہ ''ہاں، مگر میں تو زانی نہیں ہوں'' یا ''میری ماں نے زنا کرا کے مجھے نہیں جنا ہے۔'' امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض جس سے صاف سمجھ میں آجائے کہ قائل کی مراد مخاطب کو زانی یا ولد الزنا قرار دینا ہے، قذف ہے، جس پر حد واجب ہوتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، اور امام شافعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن شبرمہ اور حسن بن صالح اس بات کے قائل ہیں کہ تعریض میں بہر حال شک کی گنجائش ہے اور شک کے ساتھ حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ تعریض اگر لڑائی جھگڑے میں ہو تو قذف ہے اور ہنسی مذاق میں ہو تو قذف نہیں ہے۔

خلفاء میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تعریض حد جاری کی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''نہ میرا باپ زانی تھا نہ میری ماں زانیہ تھی۔'' معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا: آپ لوگ اس سے کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا: اس نے اپنے باپ اور ماں کی تعریف کی ہے، اس کے ماں باپ پر تو حملہ نہیں کیا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا: اس کے لیے اپنے ماں باپ کی تعریف کرنے کے لیے کیا یہی الفاظ رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ کو اس موقع پر استعمال کرنے سے صاف مراد یہی ہے کہ اس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے گروہ سے اتفاق کیا اور حد جاری کر دی *۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کسی پر عمل قوم لوط کے ارتکاب کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اسے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

(۵) جرم قذف قابل دست اندازی سرکار (cognizable offence) ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن ابی لیلی کہتے ہیں کہ یہ حق اللہ ہے، اس لیے قاذف پر بہر حال حد جاری کی جائے گی، خواہ مقذوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنی میں تو حق اللہ ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پر مقدمہ چلانا مقذوف کے مطالبے پر موقوف ہے اور اس لحاظ سے یہ حق آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ اور امام اوزاعیؒ کی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم قابل دست اندازی سرکار ہے، ورنہ اس پر کاروائی کرنا مقذوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

(۶) جرم قذف قابل راضی نامہ (compoundable offence) نہیں ہے۔ مقذوف عدالت میں دعوی لے کر نہ آئے تو یہ دوسری بات ہے لیکن عدالت میں معاملہ آجانے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔ نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود مقذوف۔ نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے، نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔

(۷) احناف کے نزدیک حد قذف کا مطالبہ یا تو مقذوف کر سکتا ہے یا پھر وہ جس کے نسب پر اس سے حرف آتا ہو۔ جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مقذوف مر جائے تو اس کا ہر شرعی وارث حد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنی قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے۔ نیز بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ دونوں دلیلیں کمزور ہیں۔ مطالبہ حد کو قابل توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، خود قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ایک کو مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملے میں چاہے صحیح ہو، مگر بیوی کے معاملے میں قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام لگایا جائے، اس کی تو پوری اولاد کا نسب مشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حد قذف صرف نسب پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے، اور ایک شریف مرد یا عورت کے لیے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بدکار قرار دیا جائے۔ لہذا اگر حد قذف کا مطالبہ قابل توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

(۸) یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز اسے حد سے بچا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انہوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ چار گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہییں اور انہیں بیک وقت شہادت دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا اور اس کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام شافعی اور عثمان البتی نے کہی ہے کہ گواہوں کو بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ دوسرے مقدمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔ حنفیہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر قاذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو وہ حد قذف سے بچ جائے گا اور ساتھ ہی مقذوف بھی حد زنا سے محفوظ رہے گا، کیونکہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر، اندھے، غلام یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کر کے قاذف سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مگر امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قاذف اگر فاسق گواہ پیش کرے تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے۔ اور یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔ گواہ اگر عادل بھی ہو تو قاذف جرم قذف سے بری ہو جائے گا اور مقذوف پر جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ لیکن اگر گواہ عادل نہ ہوں تو قاذف کا قذف اور مقذوف کا فعل زنا اور گواہوں کا صدق وکذب ساری ہی چیزیں مشکوک قرار پائیں گی اور شک کی بنا پر کسی کو بھی حد مستوجب قرار نہ دیا جا سکے گا۔

(۹) جو شخص ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے جرم قذف سے بری کر سکتی ہو، اس کے لیے قرآن نے تین حکم ثابت کیے ہیں:

(۱) اسے ۸۰ کوڑے مارے جائیں

(۲) اس کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے

(۳) وہ فاسق ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں کہ اللہ غفور اور رحیم ہے

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فقرے میں توبہ اور اصلاح سے جس معافی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے؟ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں ہے، یعنی توبہ سے حد ساقط نہ ہوگی اور مجرم کو

سزائے تازیانہ بہر حال دی جائے گی۔فقہاء اس پر بھی متفق ہیں کہ اس معافی کا تعلق آخری حکم سے ہے،یعنی توبہ اور اصلاح کے بعد مجرم فاسق نہ رہے گا اور اللہ تعالی اسے معاف کر دے گا۔(اس میں اختلاف اس پہلو سے ہے کہ آیا مجرم نفس قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔امام شافعیؒ اور لیث بن سعدؒ کے نزدیک وہ نفس قذف سے فاسق ہو جاتا ہے،اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں۔اس کے برعکس احناف اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے،اس لیے وہ نفاذ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں۔لیکن حق یہ ہے کہ مجرم کا عنداللہ فاسق ہونا نفس قذف کا نتیجہ ہے اور عندالناس فاسق ہونا اس پر موقوف ہے کہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو اور وہ سزا پا جائے)۔

قاذف کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے فقہاء کے درمیان اس پر بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا **الا الذین تابوا** کے فقرے کا تعلق اس حکم سے بھی ہے یا نہیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ اس فقرے کا تعلق صرف آخری حکم سے ہے یعنی جو شخص توبہ اور اصلاح کر لے گا وہ عنداللہ اور عندالناس فاسق نہ رہے گا لیکن پہلے دونوں حکم اس کے باوجود برقرار رہیں گے یعنی مجرم پر حد بھی جاری کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت بھی رہے گا۔اس گروہ میں قاضی شریح،سعید بن مسیّب،سعید بن جبیر،حسن بصری،ابراہیم نخعی،ابن سیرین،مکحول،عبدالرحمٰن بن زید،ابوحنیفہ،ابو یوسف،زفر،محمد،سفیان ثوری اور حسن بن صالح رحمھم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ **الا الذین تابوا** کا تعلق پہلے حکم سے تو نہیں ہے مگر آخری دونوں حکموں سے ہے،یعنی توبہ کے بعد قذف کے سزا یافتہ مجرم کی شہادت بھی قبول کی جائے گی اور وہ فاسق بھی شمار نہ ہوگا۔اس گروہ میں عطاء،طاوس،مجاہد،شعبی،قاسم بن محمد،سالم،زہری،عکرمہ،عمر بن عبدالعزیز،ابن ابی نجیح،سلیمان بن یسار،مسروق،ضحاک،مالک بن انس،عثمان البتی،لیث بن سعد،شافعی،احمد بن حنبل اور ابن جریر طبری رحمھم اللہ جیسے بزرگ شامل ہیں۔"(۵)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ آیت قذف پر لغوی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نیز **وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ** کی جزا **فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا** پر پوری ہوئی اور **وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** جملہ مستانفہ ہے جو قذف کے جزا اور سزا کو بیان کرنے کے بعد لایا گیا ہے اور اسلوب کلام بھی بدلا ہوا ہے۔اس لیے کہ **فاجلدوهم** اور **ولا تقبلوا لهم شهادة** دونوں خطاب کے صیغے ہیں اور دونوں جملے جملہ انشائیہ میں ایک امر ہے اور ایک نہی ہے اور جملہ **وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** ایک مستقل جملہ ہے جو سابق خطاب کے ختم کے بعد لایا گیا ہے اور یہ جملہ خبریہ اسمیہ ہے۔پہلے دو جملوں کی طرح جملہ انشائیہ فعلیہ نہیں۔لہذا بہتر یہ ہے کہ اس جملہ اسمیہ خبریہ (**وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ**) کا عطف شروع جملہ اسمیہ خبریہ یعنی **والذين يرمون المحصنٰت** پر کیا جائے اور **وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا** جو کہ جملہ انشائیہ فعلیہ ہے اس پر اس کا عطف نہ ہو کیونکہ جملہ انشائیہ فعلیہ پر جملہ اسمیہ خبریہ یعنی **وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** کا عطف باعتبار قواعد بلاغت جائز یا مناسب نہیں۔"(۶)

---

(۵) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۳،ص:۳۴۷-۳۵۲

(۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۵،ص:۴۰۰

(۱۰) ایک آدمی اگر مقذوف سے معافی مانگ لے اور آئندہ اس حرکت سے توبہ کر لے تو کیوں نہ اسے چھوڑ دیا جائے؟

توبہ دراصل ت و ب ہ کے تلفظ کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کے احساس ندامت اور عزم اصلاح اور رجوع علی الخیر کا نام ہے ،اور اس چیز کا حال اللہ تعالی کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا۔اسی لیے توبہ سے دنیاوی سزائیں معاف نہیں ہوتیں بلکہ صرف اخروی سزا معاف ہوتی ہے،اور اسی لیے اللہ تعالی نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو تم انہیں چھوڑ دو، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ توبہ کر لیں گے میں ان کے حق میں غفور اور رحیم ہوں۔اگر توبہ سے دنیوی سزائیں بھی معاف ہونے لگیں،تو آخر وہ کون سا مجرم ہے جو سزا سے بچنے کے لیے توبہ نہ کر لے گا؟

(۱۱) یہ بھی سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنے الزام کے ثبوت میں شہادت نہ لاسکنا لازماً یہی معنی تو نہیں رکھتا کہ وہ جھوٹا ہو۔کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا الزام واقعی صحیح ہو اور وہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے صرف ثبوت نہ دے سکنے کی بنا پر فاسق ٹھیرایا جائے،اور وہ عندالناس ہی نہیں،عنداللہ بھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنے آنکھوں سے بھی کسی کو بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو،پھر بھی وہ اس کا چرچا کرنے اور شہادت کے بغیر اس پر الزام عائد کرنے میں گناہ گار رہے۔شریعت الہی یہ نہیں چاہتی کہ ایک شخص اگر ایک گوشے میں نجاست لیے بیٹھا ہو تو دوسرا شخص اسے اٹھا کر سارے معاشرے میں پھیلانا شروع کر دے۔اس نجاست کی موجودگی کا اگر اس کو علم ہے تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں: یا اس کو جہاں وہ پڑی ہے وہیں پڑا رہنے دے،یا پھر اس کی موجودگی کا ثبوت دے تاکہ حکومت اسلامی کے حکام اسے صاف کر دیں۔ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ اس کے لیے نہیں ہے۔اگر وہ پبلک میں چرچا کرے گا تو محدود گندگی کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کا مجرم ہوگا اور اگر وہ قابل اطمینان شہادت کے بغیر حکام تک معاملہ لے جائے گا تو حکام اس گندگی کو صاف نہ کر سکیں گے۔نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اس مقدمے کی ناکامی گندگی کی اشاعت کا سبب بھی بنے گی اور بدکاروں میں جرات بھی پیدا کر دے گی۔اسی لیے ثبوت اور شہادت کے بغیر قذف کا ارتکاب کرنے والا بہر حال فاسق ہے ،خواہ وہ اپنی جگہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۲) حد قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی بہ نسبت ہلکی مار ماری جائے۔یعنی تازیانے تو ۸۰ ہی ہوں،مگر ضرب اتنی سخت نہ ہونی چاہیے جتنی زانی کو لگائی جاتی ہے۔اس لیے کہ جس الزام کے قصور میں اسے سزا دی جارہی ہے ،اس میں اس کا جھوٹا ہونا بہر حال یقینی نہیں ہے۔

(۱۳) تکرار قذف کے بارے میں حنفیہ اور جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو،اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی اور اگر اجرائے حد کے بعد وہ اپنے سابق الزام ہی کی تکرار کرتا رہے تو جو حد اسے لگائی جاچکی ہے وہی کافی ہوگی۔البتہ اگر اجرائے حد کے بعد وہ اس شخص پر ایک نیا الزام زنا عائد کر دے تو پھر نئے سرے سے مقدمہ قائم کیا جائے گا۔مغیرہؓ بن شعبہ کے مقدمے میں سزا پانے کے بعد ابوبکرہؓ کھلے بندوں کہتے رہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ مغیرہ نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ان پر پھر مقدمہ قائم کریں۔مگر چونکہ وہ سابق الزام ہی کو دوہرا رہے تھے،اس لیے حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اس پر دوسرا مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا،اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے قبول کر لی۔اس کے بعد فقہا میں اس بات پر قریب قریب اتفاق ہوگیا کہ سزا یافتہ قاذف کو صرف نئے الزام ہی پر پکڑا جاسکتا ہے،سابق الزام کے اعادے پر نہیں۔

(۱۴) قذف جماعت کے معاملے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پر بھی الزام لگائے،خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں،تو اس پر ایک ہی حد لگائی جائے گی،الا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔اس لیے کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں۔اس سے معلوم ہوا کہ ایک فرد ہی نہیں،ایک جماعت پر الزام لگانے والا بھی صرف ایک ہی حد کا مستحق ہوتا ہے نیز اس لیے بھی کہ زنا کا کوئی الزام ایسا نہیں ہوسکتا جو کم از کم دو شخصوں پر نہ لگتا ہو۔مگر اس کے باوجود شارع نے ایک ہی حد کا حکم دیا،عورت پر الزام کے لیے الگ اور مرد پر الزام کے لیے الگ حد کا حکم نہیں دیا۔بخلاف اس کے امام شافعی کہتے ہیں کہ ایک جماعت پر الزام لگانے والا خواہ ایک لفظ میں الزام لگائے یا الگ الگ الفاظ میں،اس پر ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔یہی رائے عثمان البتی کی بھی ہے اور ابن ابی لیلی کا قول،جس میں شعبی اور اوزاعی بھی ان کے ہم نوا ہیں یہ ہے کہ ایک لفظ میں پوری جماعت کو زانی کہنے والا ایک حد کا مستحق ہے اور الگ الگ الفاظ میں ہر ایک کو کہنے والا ہر ایک کے لیے الگ حد کا مستحق۔(۷)

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بہتان لگانا،کسی قسم کا بھی ہو سنگین برائی ہے لیکن جس بہتان کا تعلق جنسی امور سے ہو اس کی سنگینی دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔اس لیے کہ اس طرح کا بہتان اس شخص کی (خواہ مرد ہو یا عورت) حیثیت عرفی پر نہایت خطرناک حملہ ہے جس پر بہتان لگایا گیا ہے۔اس سے معاشرے کے اندر بسا اوقات ایسے فتنے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دبانا ناممکن ہو جاتا ہے۔بہتان کوئی مرد لگائے یا عورت دونوں ہی کے لیے گناہ ہے اور شریعت میں دونوں ہی کے لیے اسے جرم قرار دیا گیا ہے عورتوں کا بہتان اور وہ بھی جنسی نوعیت کا ایک ایسا خطرناک وار ہے جس کا دفاع نہایت مشکل ہے۔''(۸)

غرض بہتان کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے ساتھ ایسے جرم یا برے فعل کو منسوب کر کے جھوٹا الزام لگا دینا جو اس نے کیا بھی نہ ہو۔اس میں انتہائی مقام یہ ہے کہ کسی پر زنا کا جھوٹا الزام لگا دینا۔جیسے منافقین نے واقعہ افک میں طیبہ طاہرہ اور صدیقہ کائنات حضرت عائشہؓ پر بہتان عظیم لگایا۔اللہ تعالی نے سورہ نور کی دس آیات میں ان کی پاکیزگی کی گواہی دی اور قذف سے متعلق احکامات نازل کیے۔قذف سے مراد ہے کسی پر زنا کا جھوٹا الزام لگانا۔قرآن مجید نے ایسے شخص کے بارے میں حکم دیا کہ اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے اسی کوڑے مارے جائیں۔کسی کی عزت کو خراب کرنا اور معاشرے میں اسے بدنام کرنا ایک سنگین جرم ہے۔قرآن مجید نے صرف چار چیزوں کی سزا بیان کی ہے جس میں قذف بھی شامل ہے۔یہ حدود اللہ میں سے ہے۔اس سزا میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔زنا کے علاوہ دیگر جھوٹے الزامات میں منصف کو اجازت ہے کہ وہ جو سزا دینا چاہے دے سکتا ہے۔الزام لگانے والا فاسق یعنی اعلی درجے کا گناہگار ہے۔

کسی خاتون پر زنا کا الزام اس کی عزت پر ایک خطرناک حملہ ہے جس سے بچنا انتہائی مشکل ہے۔اللہ تعالی کی دو برگزیدہ خواتین حضرت مریمؑ اور حضرت عائشہ جیسی پاکیزہ خواتین پر یہ الزام لگایا گیا۔لیکن ان کا کیا مقام ہے کہ ان کی پاکیزگی کی گواہی اللہ رب العزت نے دی اور اس الزام سے بری کر دیا۔اس لیے ضروری تھا کہ اس قبیح جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔تاکہ نیک عورتوں پر تہمت لگانے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے اور کسی کو ان کی عزت خراب کرنے کا موقع نہ ملے۔

---

(۷) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۳،ص:۳۵۳-۳۵۵

(۸) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۸،ص:۳۴۴

۱۴۔فحش گوئی

فحش گوئی سے مراد ہے بیہودہ اور بے حیائی کی باتیں کرنا۔اللہ تعالیٰ فحش گوئی سے منع فرماتے ہوئے ارشادفرماتے ہیں:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ (البقرہ ۲:۱۹۷)

حج کے کئی مہینے ہیں معلوم جس نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج میں۔

اس آیت میں دیے گئے حکم کے تحت حج کے مہینوں میں احرام باندھنے کے بعد ان مہینوں اور احرام کے تقاضوں کا مکمل احترام کرے۔اس لیے اسے زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالنی چاہیے جو فحاشی اور بے حیائی پر مبنی ہو۔فحش بات کی دوقسمیں ہیں۔ایک تو وہ جو پہلے سے حرام ہیں وہ حج کے دوران بھی حرام ہیں۔دوسری وہ جو پہلے جائز تھیں اب حج کی وجہ سے حرام ہیں۔مثال کے طور پر میاں بیوی کے درمیان شہوت کی ترغیب کے لیے بے حیائی اور بے حجابی کی باتیں جائز تھیں۔لیکن اب حج کی وجہ سے ایسی بات کہنا حرام ہے۔اسی طرح دوستوں کے ساتھ جھگڑا کرنا حج کی وجہ سے زیادہ برا ہے ۔لڑائی جھگڑے میں یہاں تک کہ اپنے خادم کو ڈانٹنا منع ہے۔رفث فسوق اور جدال سے بچنا ادنی مرتبہ جبکہ نیک کام کرتے رہنا اعلیٰ درجہ ہے۔
مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''یہاں رفث ،فسوق اور جدال تین چیزوں کی نفی ہے۔رفث سے مراد شہوانی باتیں ہیں ،فسوق کے معنی خدا کی نافرمانی کے ہیں اور جدال سے مراد آپس کے لڑائی جھگڑے ہیں۔ان تینوں چیزوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔حج میں ان چیزوں کی قطعی ممانعت کے بعض خاص وجوہ ہیں۔
>
> ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترک دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب ومرغوب ہے اور جو تربیت وتزکیہ کے لیے ضروری ہے اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔
>
> دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر دو چند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔
>
> تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔''(۱)

فحش گوئی سے متعلق دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۔اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (النسآء ۴:۱۴۸،۱۴۹)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کے ترجمہ اور مختصر تفسیر کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۴۸۴، ۴۸۵

''اللہ تعالی بری بات زبان پر لانے کو (کسی کے لئے) پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے (کہ اپنے ظالم کی نسبت کچھ حکایت شکایت کرنے لگے تو وہ گناہ نہیں) اور اللہ تعالی (مظلوم کی) بات خوب سنتے ہیں (اور ظالم کے ظلم کی حالت) خوب جانتے ہیں (اس میں اشارہ ہے کہ مظلوم کو خلاف واقع کہنے کی اجازت نہیں اور ہر چند کہ ایسی شکایت جائز تو ہے لیکن) اگر نیک کام اعلانیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو (جس میں معاف کرنا بھی آ گیا) یا (بالخصوص) کسی کو معاف کر دو (تو زیادہ افضل ہے کیونکہ) اللہ تعالی (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں (باوجودیکہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح انتقام لے سکتے ہیں مگر پھر بھی اکثر معاف کر دیتے ہیں پس اگر تم ایسا کرو تو اول تو تخلق باخلاق الہیہ ہے پھر تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرنے کی امید ہوگی)۔'' (۲)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ کو یہ پسند نہیں کہ کسی کی برائی کو ظاہر کیا جائے مگر مظلوم کو اپنے ظلم وستم کے اظہار و بیان کی اجازت ہے کہ بغیر اس کے اس کو چارہ نہیں لہذا اگر مظلوم اپنے ظالم کی شکایت کرے تو وہ گناہ نہیں۔ جہر سے آواز بلند کرنا مراد نہیں بلکہ مطلق اظہار مراد ہے اگرچہ آواز بلند نہ ہو اور اللہ تعالی مظلوم کی دعا کو سنتا ہے اور اس کو معلوم ہے کہ ظالم نے کتنا ظلم کیا ہے اور وہ کتنی سزا کا مستحق ہے اگرچہ مظلوم اپنی زبان سے کچھ نہ کہے اور اس کو بھی یہ معلوم ہے کہ مظلوم کی شکایت ظالم کے ظلم کی مقدار کے مطابق ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ پھر آگے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگرچہ مظلوم کو شکایت کی اجازت ہے مگر برائی کرنے والے کے ساتھ احسان یا عفو کا معاملہ خدا کے یہاں اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے اگر تم برائی کرنے والے کے ساتھ کوئی بھلائی کرو خواہ اس بھلائی کو ظاہر کرو یا چھپاؤ تو یہ بہت بلند مقام ہے۔'' (۳)

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک:

''اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجے کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بت پرست، سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقے سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصے کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو، اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کر کیے چلا جاتا ہے۔ لہذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔'' (۴)

---

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۴۲۰

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۳۴۳-۳۴۷

(۴) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۴۱۳، ۴۱۴

مولانا امین احسن اصلاحی اسے جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اس وجہ سے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت وشناعت، اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تا کہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد، عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو مجرد اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ اشخاص تہمتوں کے ہدف بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار وفساد پیدا ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں، دیکھ لیجیے، بالکل عام صیغے سے بیان ہوئی ہیں اور مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔''(۵)

ایک اور مقام پر فحش گوئی سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام ۶:۱۰۸)

اور دشنام مت دو (برا نہ کہو) ان (معبودان باطلہ کو) جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر (غصہ میں آ کر) اللہ تعالی کی شان میں گستاخی کریں گے (اور اس کا تعجب نہ کیا جاوے کہ ایسی گستاخی کرنے والوں کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی (کیونکہ) ہم نے (دنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل (بھلا ہو یا برا) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنا طریقہ پسند ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ عالم اصل میں ابتلا کا ہے پس اس میں سزا ضرور نہیں)۔ پھر (البتہ اپنے وقت پر) اپنے رب ہی کے پاس ان (سب) کو جانا ہے سو (اس وقت) وہ ان کو بتا دے گا جو کچھ بھی وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (اور مجرمین کو سزا دے گا)۔(۶)

مشرکین مکہ کا وفد جناب ابو طالب کے پاس آیا اس نے آپؐ سے یہی مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہنے سے باز آ جائیں ورنہ ہم آپؐ کو اور آپؐ کے خدا کو برا بھلا کہیں گے۔ اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ لفظ **لا تسبُّو** ا ''سَبَّ'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گالی دینا کے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنی پاکیزہ فطرت کی بنا پر بچپن میں بھی کسی کو گالی نہیں دی۔ ممکن ہے کسی صحابی نے کبھی کسی بت کے بارے میں سخت کلمات کہہ دیے ہوں، جن کو مشرکین مکہ نے گالی قرار دیا ہو۔ اس آیت میں خطاب عام تمام مسلمانوں کو ہے کہ وہ کسی کے جھوٹے خدا کو گالیاں نہ دیں۔ اس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ وہ جہالت کی بنیاد پر تمہارے سچے خدا کو گالیاں نہ دینے لگ جائیں۔

معبودان باطلہ کو گالیاں دینے اور ان کے عیوب ونقائص اور بے بسی کو بیان کرنے میں فرق ہے۔ یہ ثابت کرنا کہ یہ بے حقیقت اور حقیر چیزیں

---

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۴۱۳،۴۱۴

(۶) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۵۸۰

الوہیت کے قابل اور عبادت کے لائق نہیں جائز ہے۔مناظرے اور مباحثے کے ذریعے کسی جھوٹے معبود کے اوصاف اور نقائص کو تحقیق سے ثابت کرنا گالیاں دینے سے مختلف ہے۔قرآن عظیم میں مختلف مقامات پر جھوٹے معبودوں کی کمزوریوں کو بیان کرنے سے ان کی الوہیت اور معبودیت کا باطل کرنا مقصود ہے۔ان مضامین کا ظاہر کرنا شریعت میں واجب اور مطلوب ہے۔مسلمانوں کو حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے مشرکوں کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔بتوں کو برا کہنا اپنی ذات میں مباح امر ہے لیکن جب یہ امر مباح ایک حرام امر (اللہ تعالی کی گستاخی) کا ذریعہ بن جائے تو اس سے بھی روک دیا گیا ہے۔اس سے شریعت اسلامی کا یہ قانون معلوم ہوا کہ مباح جب حرام کا سبب بن جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔کئی فروعات کے احکام اور فیصلے اسی قانون سے معلوم ہوتے ہیں۔اگر مسلمان تبلیغ دین کے دوران مشرکین کے خداؤں کو گالیاں دیں گے تو کافر حق سے مزید دور ہو جائیں گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس طرح کی ہدایت سورہ نسا(۴:۸۶،۱۴۸) میں بیان ہو چکی ہے۔جہاں منافقین کے رویہ پر شدید تنقید کے ساتھ مسلمانوں کو ان سے سلام کلام ختم کرنے اور متعین افراد کے علاوہ باقی لوگوں کو برا بھلا کہنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ممانعت کا سبب یہ تھا کہ کہیں یہ چیز ذاتیات کے اندر داخل نہ ہو جائے۔اسی طرح اس آیت سے پہلے مشرکین اور ان کے شرک پر تنقید شدید کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ پر جوش مسلمان شرک کے رد میں کہیں مشرکوں کے معبودوں کو سخت سست نہ کہنے لگ جائیں۔آیات میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ گرما گرم بحث ومباحثہ جاری تھا۔عام طور پر بحث کی گرما گرمی میں حدود کے احترام نہیں رہتا۔اور سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مسلمانوں پر دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے میں حدود سے آگے نہ بڑھنا لازم ہے۔

اس حکم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دعوت کے لحاظ سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول عقائد تک محدود ہو تاکہ سننے والے کے اندر بے فائدہ دشمنی کا جاہلانہ جذبہ پیدا نہ ہو۔اگر یہ ثابت ہو جائے کہ توحید عقل اور فطرت کا تقاضا ہے اور شرک بے ثبات اور بے بنیاد ہے تو ان معبودان باطلہ کی خدائی خود بخود ختم ہو جائے گی۔پھر ان کو گالیاں دینے اور برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس کے برعکس اگر بحث کے دوران جذبات کی رو میں بہ کر ان خداؤں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا جائے جن کی عقیدت ومحبت آباؤاجداد سے مشرکین کے دلوں میں رچ بس چکی تھی تو وہ نفسیاتی طور پر مشتعل ہو کر (نعوذ باللہ) اللہ تعالی کو گالیاں دیتے اور دین وہدایت کی کوئی بات بھی سننا گوارا نہ کرتے۔

عدوا بغیر علم میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشرکین خدا کو معبود مانتے ہیں لیکن اشتعال دلانے کی وجہ سے وہ حدود کو توڑ دیں گے، خاص طور پر جب وہ خدا کی صفات اور اس کے حقوق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

ان کو برا بھلا نہ کہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ معبودان باطلہ صرف خیال اور وہم کا ہی نام ہیں تو سایہ سے لڑنے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور اگر وہ انبیاء، اولیاء اور فرشتوں میں سے ہیں تو ان کو کون برا کہتا ہے۔غرض معبودان باطلہ کو گالی دینا عقل وانصاف اور دعوتی نقطہ نظر دونوں پہلوؤں سے غلط ہے اور اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ مشرکوں کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے دراصل سچے خدا کو گالیاں دینے کا راستہ کھولتے ہیں۔

قرآن مجید میں بتوں کی کمزوری، بے بسی اور کسی حقیقت سے متعلق نہ ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ اس حکم میں شامل نہیں کیونکہ یہ فرضی اور واقعی ہستیوں کی تنقید اور وضاحت ہے ان پر سب وشتم نہیں۔'' (۷)

---

(۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳،ص:۱۳۴-۱۳۶

سورہ حجرات میں فحش گوئی کی مختلف صورتوں سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الحجرٰت ۴۹:۱۱)

اے مومنو! تم میں سے ایک گروہ (کچھ مرد) دوسرے گروہ (کچھ مردوں) کا مذاق نہ اڑائیں، کیا عجب! کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور باہم برے القاب سے نہ چڑاؤ (نام نہ بگاڑو) ایمان کے بعد گناہ (کا نام) برا نام ہے، اور جو باز نہ آیا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت میں تمسخر کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مذاق کی دو قسمیں ہیں (۱) تمسخر (۲) مزاح

تمسخر: سے مراد وہ ہنسی ہے جس کا مقصد دوسرے کو اپنے سے کم تر ثابت کرنا یا اس کا دل دکھانا ہو۔

مزاح: جس ہنسی سے دوسرے کا دل خوش ہو وہ مزاح کہلاتا ہے، یعنی کسی کی طبیعت کو خوش کرنا اور مزاح یا خوش طبعی جائز ہے۔

آیت میں قوم اور نسآء فرمانے سے یہ مراد نہیں کہ کئی مرد کئی مردوں کا اور کئی عورتیں کئی عورتوں سے تمسخر نہ کریں بلکہ اس سے مرد اور عورت کی جنس مراد ہے چاہے وہ ایک ہو یا ایک سے زیادہ ہوں۔ مرد اور عورت کے باہمی تمسخر کا بھی یہی حکم ہے۔ اس حکم کو خاص اس لیے کیا گیا ہے کہ عموماً تمسخر ہم جنسوں میں ہی واقع ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم جنس سے تمسخر کرنے کی ممانعت مخالف جنس سے تمسخر کرنے کی ممانعت پر ایک درجہ زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس تمسخر کے علاوہ ایک بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور اگر دوسرا آدمی اپنے عمل سے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو مگر چونکہ خاتمہ دونوں کا ممکن ہے اس لیے عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ کا ہر حال میں مصداق ہوگا۔ (۸)

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

اس آیت میں ان بڑی برائیوں سے روکا جا رہا ہے جو ایک انسانی معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ کسی کی عزت پر حملہ اور کسی دوسرے کا دل دکھانا وغیرہ ہی انسانی دشمنیوں کا سبب بنتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے فساد پیدا ہوتے ہیں۔ ہتک عزت کے مغربی قوانین اتنے نامکمل اور خراب ہیں کہ مدعی کی عزت میں مزید کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون ہر شخص کی بنیادی عزت کا علمبردار ہے۔

مذاق اڑانے سے مراد صرف زبان سے ہی کسی کا مذاق اڑانا نہیں ہے بلکہ کسی کی نقل اتارنا، کسی کی طرف اشارے کرنا، کسی کی بات، صورت، کام یا لباس پر ہنسنا، یا کسی کے عیب یا نقص پر لوگوں کو متوجہ کرکے ہنسانا، سب مذاق اڑانے میں شامل ہیں۔ اصل ممانعت تضحیک کرنے کی ہے کیونکہ تضحیک سے لازمی طور پر تکبر، دوسرے کو حقیر سمجھنے اور ذلیل کرنے کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جو اخلاقی طور پر سخت معیوب ہیں۔ (۹)

---

(۸) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۴۴۰

(۹) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵، ص:۸۵

غرض کسی کو گھٹیا سمجھ کر اس سے مذاق کرنے کی اجازت نہیں ہے۔اللہ تعالی کے نزدیک چار چیزیں معیار فضیلت ہیں۔ایمان، علم، تقوی اور جہاد۔اسلام میں ایمان اور عمل صالح کو انسان کی کامیابی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ایمان اور عمل صالح کا وزن قیامت کے دن اللہ تعالی کی قائم کردہ عادلانہ ترازو سے معلوم ہوگا۔اس دن ابرار نعمتوں کے مزے حاصل کریں گے جب کہ فجار جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ہوسکتا ہے جسے ہم دنیا میں حقیر سمجھ کے اس سے تمسخر کرتے ہوں وہ اللہ کے نزدیک عزت والوں میں سے ہوں۔اسے مذاق کرنے والوں کی نسبت بلند مقام ملے۔اس آیت میں عورتوں کے ذکر خاص کا مقصد انہیں فتنے سے بچانا ہے۔مردوں کی نسبت عورتوں میں تمسخر کم پایا جاتا ہے۔مال، نسب اور حسن و جمال میں برتری رکھنے والی خواتین جن عورتوں کو اپنے سے کم تر سمجھتی ہیں، ان کے ساتھ ان کا انداز گفتگو تحقیر آمیز ہوتا ہے۔اس فتنے کا شکار مرد و خواتین اس تکبر کا اپنے قول و فعل سے اظہار کرتے ہیں۔یہاں تک کہ یہ فتنہ ان کے ہاں راسخ ہو کر روایت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ اسے مذہب قرار دے دیتے۔اس موقع پر قرآن مجید نے اسی فتنے سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''ہندوؤں میں برہمنوں نے، یہود میں بنی لاوی نے اور عربوں میں قریش کو ایسا ہی مقام تقدس حاصل ہو گیا جس کو چیلنج کرنا دوسروں کے لیے ناممکن تھا۔مساوات انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود یہی حال ہر قوم کا ہے۔یہاں تک کہ مسلمان جنہیں اس فتنہ کو ختم کرنا تھا وہ خود آج برادریوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک ''ہمچو من دیگرے نیست'' (ہمارے جیسا دوسرا نہیں ہے) کے نشہ میں مست ہے۔جو ہر قوم و قبیلہ کے عوام و خواص کے بیانات اور نعروں سے ظاہر ہے، جس سے فطری طور پر دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی ہوتی ہے۔جس کے نتیجے میں بالآخر خون خرابہ اور تقسیم و تفریق ہوتی ہے۔''(۱۰)

وَلَا تَلۡمِزُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ: سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

> ''**لمز**'' کے مفہوم میں طعن و تشنیع کے علاوہ چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب تلاش کرنا، اعلانیہ یا خفیہ یا اشارے سے کسی کو ملامت کا نشانہ بنانا وغیرہ بھی شامل ہیں۔اللہ تعالی کے کلام کی بلاغت یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ایک دوسرے پر طعن نہ کرو بلکہ یہ کہا کہ اپنے اوپر طعن نہ کرو۔اس سے یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ دوسروں پر زبان طعن دراز کرنے والا دراصل خود کو طعنہ دیتا ہے۔ظاہر ہے کوئی شخص اس وقت تک کسی کو برا نہیں کہتا جب تک اس کے دل میں برے جذبات کا لاوا خوب پک کر پھٹنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔اس طرح ان جذبات کو پالنے والا دوسروں سے پہلے اپنے آپ کو برائی کا ٹھکانہ بنا لیتا ہے۔پھر جب وہ دوسروں پر زبانی حملہ کرتا ہے تو وہ دوسروں کو اپنے اوپر زبانی حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ کوئی اپنی شرافت کی وجہ سے اس کے حملوں کا جواب نہ دے، مگر اس نے تو اپنی طرف سے اس شخص کے لیے حملہ کرنے کا دروازہ کھول دیا جسے اس نے اپنے زبان کے تیروں کا نشانہ بنایا۔''(۱۱)

تلمزوا میں میم کو زیر اور پیش کے اعراب کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔دونوں طرح کی قرات سے اس کا معنی ہے کہ کسی پر طعن نہ کرو اور عیب نہ

---

(۱۰) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷، ص:۵۰۵، ۵۰۶

(۱۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵، ص:۸۵، ۸۶

لگاؤ۔ بعض مفسرین کے نزدیک کوئی ایسا کام نہ کرو جس کی وجہ سے تمہیں طعنہ دیا جائے۔ غرض "لمز" کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں کے اشارے سے طنز آمیز فقرے کسنا۔ مثلاً منافقین کے متعلق ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (التوبہ ۹:۷۹)

کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان پر زہریلے فقرے کسنا اس کے تکبر، حسد اور غرور کی ترجمانی کرتا ہے۔

انفسکم سے مراد کسی دوسرے مسلمان پر طعن کرنا دراصل اپنے اوپر طعن کرنا ہے۔ اس لیے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور اپنے بھائی پر زبان درازی کرنا یا الزام لگانا اپنے خنجر سے اپنے سینے کو زخمی کرنے کے مترادف ہے۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ:

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "**تنابز بالالقاب** کا مطلب ہے کسی کو ایسے برے لقب سے پکارنا جو اسے ناگوار گزرے۔ یعنی کسی کو ایسے لقب سے نہ پکارو جو اس کے دل کو دکھانے کا سبب ہو۔ جیسے کسی کی کوئی چڑ بنا لیتے ہیں اور پھر اسی سے اس کو چھیڑتے ہیں اور وہ ایک مومن کی ناگواری کا سبب ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی ایسے لقب یا نام سے پکارا جائے جو خوش گوار ہو جیسے کچھ لوگ کسی لقب سے خوش ہوتے ہیں تو ایسے لقب سے پکارنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"(۱۲)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

> ''اس حکم سے مراد ہے کہ کسی شخص کو ایسے لقب سے نہ پکارا جائے جو اسے ناگوار ہو اور جس سے اس کی تحقیر و تنقیص ہو۔ مثلاً کسی کو فاسق، منافق، لنگڑا، اندھا یا کانا کہنا، کسی کو اس کے ذاتی، آبائی یا خاندانی عیب یا نقص سے ملقب کرنا، کسی کو مسلمان ہو جانے کے بعد اس کو سابقہ مذہب کے حوالے سے یہودی یا عیسائی کہنا، کسی شخص، خاندان، برادری یا گروہ کی مذمت یا تذلیل کے لیے نام رکھنا۔ اس حکم میں وہ القاب شامل نہیں ہیں جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے تو برے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا مقصد مذمت کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ انہی القاب سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے فن اسماء الرجال میں سلیمان الاعمش (چندے سلیمان) اور واصل الاحدب (کبڑے واصل) جیسے القاب کو جائز رکھا ہے۔ ایک جگہ پر اگر ایک نام کے بہت سے لوگ موجود ہوں اور ان میں سے کسی شخص کی پہچان اس کے خاص لقب سے ہوتی ہو تو وہ برا لقب استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ایک مقام پر بہت سے عبداللہ نام کے افراد موجود ہوں اور ان میں سے ایک نابینا ہو تو اس کی پہچان کے لیے نابینا عبداللہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح وہ القاب بھی اس حکم میں شامل نہیں ہیں جن میں تنقیص کا پہلو موجود ہو مگر اصل میں وہ محبت کی وجہ سے رکھے جاتے ہیں اور انہیں پسند ہو جنہیں اس لقب سے پکارا جائے جیسے ابوہریرہؓ، ابوترابؓ وغیرہ۔''(۱۳)

---

(۱۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۷، ص:۴۹۹

(۱۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵، ص:۸۶

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک:

"**تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ** کے معنی باہم ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرنا۔ جس طرح اچھے القاب کے ساتھ پکارنے سے کسی فرد یا قوم کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح کسی کو برے القاب کے ساتھ پکارنے سے اس کی بہت زیادہ توہین اور تذلیل ہوتی ہے۔ ہجو یہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور ان کا اثر نہایت دوررس اور نہایت پائدار ہوتا ہے۔ ان سے وجود پانے والی تلخیاں کئی نسلوں تک موجود رہتی ہیں۔ اگر معاشرتی سطح پر اپنے مخالفین کے لیے برے القاب ایجاد کرنے کا شوق پیدا ہو جائے تو پھر اس قوم میں اتحاد ختم ہو جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں یہ ذوق کمال درجے کے ساتھ اپنے عروج پر تھا۔ اس زمانے میں قبیلے کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب اسے تسلیم کیا جاتا تھا جو اپنے قبیلے کے مفاخر اور مخالفین کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ ان کے ہجو یہ اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں انہیں کتنا نمایاں مقام حاصل تھا؟ اور اسی وجہ سے وہ ایک قوم نہ بن سکے کیونکہ وہ اپنوں کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے انہیں انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آگاہ کیا جس کی وجہ سے وہ دنیا کی ہدایت اور قیادت کے قابل ہوئے۔ اس مقام پر قرآن مجید نے انہیں زمانہ جاہلیت کے فتن سے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی ایمان و اسلام کی برکات کی قدر کرو۔ شیطان کے گمراہ کرنے سے پھر انہی برائیوں میں مبتلا نہ ہو جانا جن سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں بچایا ہے۔"(۱۴)

آخر میں فرمایا کہ مسلمان کے لئے ایمان کے بعد سب سے برا نام فسق کا ہے۔ اس سے مراد کسی مسلمان کو اے فاسق، اے یہودی یا اے زانی وغیرہ کہہ کر پکارنا ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے برا لقب فسق کا لقب ہے اور اس میں سارے گناہ شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو برا لقب دینے سے تمہارا اپنا لقب فاسق ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی کو برا لقب دینے سے پہلے غور و فکر کرو کہ اس گناہ سے تمہارا لقب فاسق ہو جائے گا۔ مومن کے لیے انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ وہ بدزبانی میں مشہور ہو جائے۔ عمل فسق ایک کافر کے کفر کو تو زیب دے سکتا ہے لیکن ایک مومن کے ایمان کو کبھی زیب نہیں دے سکتا۔ مومن کو تو فسق کے نام سے بھی نفرت ہونی چاہیے بجائے اس کے کہ وہ فسق پر مبنی عمل کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اوپر جن اعمال سے منع کیا گیا ہے وہ فسق میں داخل ہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والا فاسق یعنی اعلیٰ درجے کا گناہگار ہے۔ ایسی ناشائستہ اور ممنوعہ حرکتوں سے باز نہ آنے والے اور توبہ نہ کرنے والے ہی ظالم ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی برکتیں اور کفر و فسق کے نتائج سے خوب آگاہ کر دیا ہے۔ اس لیے اب ظلم اللہ کی طرف سے نہیں ہوگا بلکہ بندہ ان گناہوں کا ارتکاب کر کے خود اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

---

(۱۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج: ۷، ص: ۵۰۷، ۵۰۸

باب سوم:

منتخب اردو تفاسیر میں اصلاح اخلاق کی ترغیبات و محرکات

اللہ رب العزت نے قرآن عظیم میں انسانوں کو اخلاق درست کرنے کا حکم دیا ہے۔لیکن انسان کی فطرت اور عقل کا تقاضا بھی ہے کہ انسان کو اس کے اخلاق کی جزا اور بدلہ ملنا چاہیے۔االلہ تعالی کا قانون بھی یہی ہے کہ وہ اچھے اخلاق کی اچھی جزا اور برے اخلاق کی بری جزا بیان کرتا ہے۔انسانی اخلاق کو درست کرنے کے لیے تین چیزوں کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے۔ایک یہ کہ اچھے اخلاق سے اللہ تعالی کی رضا حاصل ہوگی۔دوسرا یہ کہ نیک اعمال کے بدلے میں جنت ملے گی۔تیسرا یہ کہ انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اسے مرنے کے بعد ایک دن دوبارہ زندہ ہونا ہے ،اللہ تعالی کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔اس سوال کا احساس بھی انسان کو اپنا اخلاق اچھا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔

مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے اخلاق کا کوئی دنیاوی مقصد نہیں بلکہ ان کا مقصد اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔اللہ تعالی کی رضا کا حصول انسانی کامیابی کی نوید ہے۔انسان اپنے نفس کو نیکی کے عوض بیچ دیتا ہے اور نتیجے میں اسے اللہ تعالی کی رضا حاصل ہوتی ہے۔وہ قریبی رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کے حقوق ادا کر کے اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے۔نماز ،روزہ ،زکوۃ سے اللہ تعالی کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔بعض مرتبہ صبر کر کے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔

قرآن عظیم میں مختلف مقامات پر مومنوں کے نیک اعمال کے صلے میں ایک خاص مکان یعنی جنت عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے جس کے نیچے نہریں لہریں لے رہی ہوں گی۔انسان فطری طور پر اپنے عمل کا بدلہ چاہتا ہے۔اللہ تعالی نے اپنے فرمانبردار اور نیک بندوں کے لیے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ایمان اور عمل صالح والے ہی اصحاب الجنۃ ہوں گے۔انسان کی ہر خواہش وہاں پوری ہوگی اور وہ جو چاہے گا اسے ملے گا۔

تیسری چیز جو ایک مسلمان کو اچھا اخلاق اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہے وہ ان سوالات کا احساس ہے جو قیامت کے دن ہم سے کیے جائیں گے۔انسان کے پاس اس کا جسم ،اس کی زندگی ،اس کی جوانی ،اس کا مال ،اس کا علم ہر چیز ایک امانت ہے۔قیامت کے دن ان امانتوں کا جواب دیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔انسان کے اعضاء سے بھی اسکے اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔انسان کے اخلاق مثلا وعدے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ان سوالات کے جوابات کے لیے ہم نے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔اگر ہم نے اللہ تعالی کے احکامات کے مطابق زندگی گزار کر جواب دیے تو کامیاب ہو جائیں گے ورنہ ناکام۔

محرک سے مراد ایسی چیز جو انسان میں نیکی کی تحریک پیدا کرتی ہے اور اس کے اخلاق کو درست کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ان میں سرفہرست اسلامی عقائد ہیں۔صحیح عقائد صحیح اخلاق کو جنم دیتے ہیں۔اسلامی عقائد میں خاص کر عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت ایک مسلمان کو نیکی کی راہ پر چلاتے ہیں ،اس کے اعمال و اخلاق کو سنوارتے ہیں۔عقائد کے علاوہ عبادات بھی انسانی زندگی میں اعلی اخلاق کو پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔مثلا نماز میں باقاعدگی اختیار کر کے بے حیائی اور برائی سے بچا جا سکتا ہے۔مسلمانوں کے مال میں سے زکٰوۃ کے ذریعے انہیں پاک کیا جاتا ہے اور نیکی کے راستے میں انہیں بڑھایا جاتا ہے۔زکٰوۃ ادا کرنا کامیاب مومنوں کی صفات میں سے ہے۔روزہ انسان میں ضبط نفس اور تقوی پیدا کرتا ہے روزہ کے ذریعے انسان کو تقوی کی عملی مشق کرائی جاتی ہے۔ویسے تمام عبادات کا مقصود تقوی ہے۔تقوی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کے اخلاق اور اعمال کو درست کر دیتا ہے۔

ان کے علاوہ مکافات عمل کا تصور بھی انسان میں اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔مکافات عمل سے مراد ہے''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔'' دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے یعنی انسان جو اس دنیا میں بوئے گا وہی آخرت میں کاٹے گا۔یعنی اپنے عمل کی بنیاد پر جزا پائے گا۔

فصل اول:

منتخب اردو تفاسیر میں اصلاح اخلاق کی ترغیبات

قرآن مجید نے اصلاح اخلاق کے لیے درج ذیل ترغیبات دی ہیں:

(ا) رضائے الٰہی:

اصلاح اخلاق کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتے ہیں۔ مومن اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے احکامات میں لگا کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ (البقرہ ۲:۲۰۷)

اور لوگوں میں سے جو اللہ تعالیٰ کی خوشی تلاش کرنے میں اپنی جان بیچتا ہے اور اللہ (ایسے) بندوں پر نہایت مہربان ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي** کے بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ یشری سے بیع یعنی فروخت کرنے کے معنی مراد ہیں اسطرح ترجمہ ہوگا کہ اپنی جان کو جنت کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یشری بمعنی یشتری یعنی خریدنا کے معنی میں ہے، اس طرح ترجمہ ہوگا کہ کچھ لوگ نیک اعمال کر کے اپنی جان کو خرید لیتے ہیں یعنی اپنی جان کو خطرات اور خوفناک چیزوں سے بچا لیتے ہیں۔ قابل ترجیح پہلا قول ہی ہے کہ یشری کا معنی بیچنا کے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اپنی جان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی احمت سے وہ جان پھر انہی کے قبضے میں رہنے دیتے ہیں اور جان کی حفاظت انہی کے سپرد کر دیتے ہیں کہ یہ ہماری امانت ہے اور ہماری اجازت کے بغیر اس میں کوئی تصرف نہ کرنا۔ نیز بندہ کا اپنی جان کو اللہ کے ہاتھ فروخت کرنا اور اللہ کو اس کا خریدنا محض ظاہر کے اعتبار سے ہے کہ ظاہری طور پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی جان کا مالک ہوں ورنہ حقیقت میں سب چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"(۱)

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک:

"یہاں مخلص مومنوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی تلاش کرنے کے لیے اپنا سب کچھ لگا دیا۔ یہاں دو پہلوؤں سے اس کا ذکر ہے۔ ایک تو منافقین کو غیرت دلانے کے لیے کہ سب تم جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے بھی ہیں جو اپنا تن، من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر چکے ہیں اور یہی ان کا مقصد زندگی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان مومنوں کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقوں کے برعکس اللہ ہی کیلیے جینے اور مرنے والے ہیں۔ اس کے جانباز اور وفادار بندے ہی اس کی رافت اور رحمت کے مستحق ہیں۔

وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ: میں اشارہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیچنے اور خریدنے کا وعدہ بڑا مشکل ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی لگا دینا ایک عظیم جہاد ہے۔ جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے

---

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۳۹۹

بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان سے ہونے والی بھول چوک کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لیے اس نے توبہ واصلاح کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ (۲)

اللہ رب العزت ان لوگوں کی مثال بیان کرتے ہیں جو اپنا مال اللہ تعالی کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (البقرہ ۲:۲۶۵)*

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ تثبیت کے معنی مضبوط کرنے، جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مال کو اللہ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔ من یہاں گویا تثبیتا کے مفعول پر داخل ہے۔ جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقوی کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک ریاضت ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات نکلی کہ تمام دوسری عبادات کی طرح انفاق کا حقیقی فائدہ بھی خدا کے طرف نہیں بلکہ بندے ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ سب سے اعلی انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانے میں ہو، غربت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے ہو، جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو اور خاص طور پر ان حقداروں کے لیے ہو جن سے آدمی کا دل خوش نہ ہو، اس لیے کہ یہی انفاق ہے جس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو خواہشات نفس کے خلاف چلانے میں جتنا مشاق ہو جاتا ہے اتنا ہی اس کے لیے خدا کا قرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔" (۳)

رضائے الہی کے متعلق ارشاد الہی ہے:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النسآء ۴:۱۱۴)

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی، ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ وخیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۴۹۷

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۶۱۸

*اس آیت کا ترجمہ تشریح ''انفاق'' کے عنوان کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

''عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (ثواب و برکت) نہیں ہوتی ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیر خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کردینے کی ترغیب دیتے ہیں (اور اس تعلیم وترغیب کی تکمیل وانتظام کے لیے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں یا خود ہی صدقہ وغیرہ کی دوسروں کو خفیہ ترغیب دیتے ہیں کیونکہ بعض اوقات ان کے مشوروں میں خفیہ ہی کہنا مصلحت ہوتا ہے۔ البتہ خیر (یعنی ثواب و برکت ہے) اور جو شخص یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) حق تعالی کی رضا تلاش کرنے کے لیے (نہ کہ ریاست وشہرت کی غرض سے) سو ہم اس کو عنقریب (آخرت میں) اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔''(۴)

اس آیت کے آخر میں میں فرمایا کہ یہ نیکیاں، صدقہ، امر بالمعروف اور لوگوں کے درمیان صلح کرانا اسی وقت معتبر اور مقبول ہوسکتی ہے جب ان کو اخلاص کے ساتھ محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو۔ اسی طرح حسن اخلاق میں رضائے الٰہی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَاٰتِ ذَى الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم۳۰:۳۸)

پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر (کو اس کا حق)، یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں اور وہی کامیاب ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مومن کو چاہیے کہ تنگی یا فراخی ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہے اور اس کی رضا اور خوشنودی کا طلب گار رہے اور اپنے فائدے پر نظر نہ رکھے۔ جب انسان کو یہ معلوم ہوگیا کہ اصل رازق اللہ تعالی ہے تو اس کے عطا کیے ہوئے رزق کو اس کے حکم کے مطابق خرچ کرے لہذا قریبی رشتہ دار کو قرابت کا حق دے اور صلہ رحمی کر اور مسکین اور مسافر کو ان کا حق دے یعنی اگر اللہ تجھے فراخی دے تو یہ تین کام کر۔ شریعت کے مطابق قریبی رشتہ داروں اور فقراء کے ساتھ سلوک کر یعنی شریعت کے مطابق مالی حقوق ادا کرنا بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے طلب گار ہیں اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں جو محض اللہ تعالی کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں نہ کہ نام آوری اور کسی دنیاوی غرض کے لیے۔ صرف اللہ تعالی کی رضامندی کے لیے قریبی رشتہ داروں، فقیروں اور مسکینوں کی مدد اعلی ترین تمدن ہے۔''(۵)

اللہ تعالی کی رضا کے لیے زکوٰۃ دینے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم۳۰:۳۹)

اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں

---

(۴) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۴۰۳

(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۳،ص:۱۵۷

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس بڑھوتری کی کوئی حد مقرر نہیں جتنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبہ ایثار اور جس قدر شدید طلب رضائے الٰہی کے ساتھ کوئی شخص راہ خدا میں مال صرف کرے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دے گا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص راہ خدا میں ایک کھجور بھی دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر احد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔'' (٦)

قرآن مجید میں اہل عقل کی صفت اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے صبر کرنا بیان ہوئی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد ۲۲:۱۳)

اور وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے صبر کرتے ہیں۔

وہ صبر باعث ثواب ہے جو اختیاری ہو، اللہ کے خوف سے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ وہ صبر قابل تعریف ہے کہ اپنے اختیار سے خلاف طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض و واجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات و مکروہات سے بچنا ہو۔
سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

''وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے جذبات اور میلانات کو حدود کا پابند بناتے ہیں، خدا کی نافرمانی میں جن جن فائدوں اور لذتوں کا لالچ نظر آتا ہے انہیں دیکھ کر پھسل نہیں جاتے اور خدا کی فرماں برداری میں جن جن نقصانات اور تکالیف کا خطرہ ہوتا ہے انہیں برداشت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی ساری زندگی درحقیقت صبر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ رضائے الٰہی کی امید اور آخرت کے نتائج کی توقع پر اس دنیا میں ضبط نفس سے کام لیتا ہے اور گناہ کی جانب نفس کے ہر میلان کا صبر سے مقابلہ کرتا ہے۔'' (٧)

جو صرف اپنے رب کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے، تو اس کے اخلاص و تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کا مال قبول فرمائیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (الیل ۹۲: ۱۸-۲۱)

اور عنقریب اس سے پرہیزگار بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے (اپنا دل) پاک صاف کرنے کو اور کسی کا اس پر احسان نہیں جس کا بدلہ دے، مگر اپنے بزرگ و برتر رب کی رضا چاہنے کو اور وہ عنقریب راضی ہو گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وہ شخص جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر صرف اس لیے اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے (یہ اس پرہیزگار آدمی کے خلوص کی مزید

---

(٦) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص:۶۰۷

(٧) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۴۵۶

وضاحت ہے کہ)وہ اپنا مال جن لوگوں پر خرچ کرتا ہے، ان کا کوئی احسان پہلے سے اس پر نہ تھا کہ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آیندہ ان سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور ان کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے ان پر کوئی احسان تھا اور نہ آیندہ ان سے کسی احسان کی توقع رکھتا ہے ۔اس کی بہترین مثال حضرت ابوبکرؓ کا یہ عمل ہے کہ مکہ معظّمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اس وجہ سے ان کے مالک ان پر بہت زیادہ ظلم کر رہے تھے، ان کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے تا کہ ظلم سے بچ جائیں ۔ابن جریر اور ابن عسا کر نے حضرت عامر بن عبداللہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر پیسے خرچ کرنے پر ان کے والد نے کہا کہ بیٹا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو ۔اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے ۔اس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ ابا جان میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے ۔''(۸)

غرض کسی بھی نیک عمل کی نیت اور مقصود اللہ تعالی کی رضا ہونی چاہیے ۔ہم کوئی نیک کام اس لیے سرانجام دیں کہ میرا رب میرے اس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کسی برے عمل سے اس لیے بچیں کہ اللہ نے اس سے بچنے کا حکم دیا ہے ۔ایسے عمل کو اللہ تعالی خوشی سے قبول فرماتے ہیں ۔

(۲)جنت کا حصول :

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان لوگوں کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہیں ۔ارشاد الٰہی ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرہ ۲:۲۵)

اور خوشخبری سنادو ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیے کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۔

جنت کو حاصل کرنے کے لیے ایمان اور عمل صالح کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ایمان سے مراد اللہ تعالی، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں ،اس کے فرشتوں اور یوم آخرت اور ان کے متعلقات کو ماننے کا نام ہے ۔عمل صالح اس عمل کو کہا جاتا ہے جو دکھاوے سے پاک خالص اللہ تعالی کی رضا کے لیے کیا جائے ۔اسی طرح وہ عمل جس میں علم ،نیت ،صبر اور اخلاص موجود ہو عمل صالح کہلائے گا۔ جنت کی خوشخبری انہی لوگوں کے لیے ہے جن کے ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ موجود ہوں گے ۔ جنت لغت میں باغ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں ایک خاص مکان کا نام ہے جو نشاۃ آخرت میں ہمیشہ کے لیے نیک لوگوں اور متقیوں کو عنایت کیا جائے گا۔قرآنی آیات اور احادیث نبویہ نے جنت اور جہنم کے احوال و اوصاف جس قدر بیان کیے ہیں ان پر ایک حرف بھی زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ عالم غیب میں قیاس نہیں چلتا ۔(۹)
اسی طرح قرآن مجید میں نیک عمل کرنے والے مومن اور کافر کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲:۸۱،۸۲)

---

(۸)مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء)ج:۶،ص:۳۶۵

(۹)مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ)ج:۱،ص:۱۰۳

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے۔ سو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ایسے لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک

''احاطہ کا معنی ''کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے کیے ہیں''۔ اور یہ معنی کفار کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا بلکہ اگر کفر سے پہلے کے کچھ اعمال ہوں تو وہ بھی حبط اور ضبط ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کفار میں سب برائی ہی برائی ہوگی۔ اس کے برعکس اول تو مومنین کا ایمان خود نیک کاموں میں سے ایک بہت بڑا عمل صالح ہے اور دوسرا یہ کہ اعمال فرعیہ بھی ان کے نامہ اعمال میں درج ہوتے ہیں اس لیے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں۔''(۱۰)

جس شخص نے اتنے گناہ کیے کہ گناہوں نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا اور کوئی طرف گناہ سے خالی نہیں رہی۔ جدھر دیکھے اسے اپنے گناہ ہی گناہ نظر آتے ہیں جن میں نیکی کا نام ونشان بھی نہیں۔ گناہوں کے گھیرے سے اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ ایسے ہی لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہ گناہگار اور دوزخ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ ان کے برعکس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے جس سے اعضاء اور جوارح روشن ہوئے ایسے لوگ جنت کے ساتھی ہیں۔ یہ ابرار اور جنت ایک دوسرے سے کبھی علیحدہ نہیں ہوں گے۔ ابرار و متقین ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے۔ ایمان نہ لانے کی وجہ سے اعمال صالحہ بے کار ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (المآئدہ۵:۵)
اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے یعنی ایمان کے بعد مرتد ہوجائے تو اس شخص کے تمام اعمال غارت اور برباد ہوئے اور وہ شخص آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوا۔

ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل قابل قبول نہیں۔ کافر کے اچھے اعمال، اعمال صالحہ نہیں بلکہ اعمال صالحہ جیسے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں عمل صالح کی روح ''ایمان'' موجود نہیں ہے۔ جیسے ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً (النور ۳۹:۲۴)
اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چمکتے ریت کے دھوکے کی طرح ہیں چٹیل میدان میں، پیاسا اسے پانی گمان کرتا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ جس کے پاس ایمان نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ گناہوں میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے برعکس مومن کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہوں میں گھرا ہوا نہیں ہے۔ اگر بالفرض کوئی نیک عمل اس کا معاون اور مددگار نہیں ہے تو ایمان ضرور اس کا نگہبان اور پاسبان ہے، جو شیطان کے قاتلانہ وار کو روکے ہوئے ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے نزدیک گناہ کے گھیر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حال کافر کا ہوسکتا ہے مومن کا نہیں۔

---

(۱۰) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۵۱

اہلسنت والجماعت کے نزدیک جوفریق ایمان لایا اور اعمال صالحہ بھی کیے اس کا ثواب دائمی اور غیر متناہی ہے۔ جوفریق نہ ایمان لایا اور نہ اعمال صالحہ کیے اس کا عذاب دائمی اور غیر متناہی ہے۔ جوفریق ایمان لایا مگر اعمال صالحہ نہیں کیے اس کا بدلہ ثواب اور عذاب سے مرکب ہے۔ لیکن اول عذاب دیں گے پھر بہشت میں داخل کریں گے۔ کیونکہ بہشت میں داخل کر کے پھر بہشت سے نکال کر دوزخ میں ڈالنا حکمت کے خلاف ہے۔ جیسے عزت دینے کے بعد ذلت کے گڑھے میں ڈالنا لطف وعنایت کے خلاف ہے۔ چوتھا احتمال یہ کہ اعمال صالحہ تو ہوں مگر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ صورت شرعا محال ہے اس لیے کہ شریعت میں کوئی عمل صالح ایمان کے بغیر معتبر نہیں۔ ہر عمل صالح کے لیے ایمان شرط ہے۔

وَاِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ جب شرط فوت ہوئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔(۱۱)

ہر شریعت میں قاعدہ رہا ہے کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور گناہگار مومن چند دن دوزخ میں عذاب پا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النسآء ۴:۴۸)

اللہ (اس کو) نہیں بخشتا جو اس کا شریک ٹھہرائے اور اس کے سوا جس کو چاہے بخش دے۔

بنی اسرائیل اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے سمجھتے تھے۔ انبیاء کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جنت کا حقدار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر جنت جانا پڑا تو صرف گنتی کے چند دن ہی جائیں گے۔ قرآن مجید نے ان کے تمام نظریات کی تردید کی اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پیغمبروں یا تم سے کوئی وعدہ کیا ہے یا تمہاری پاس موجود الہامی کتابوں میں اس سے متعلق کوئی شہادت ہے تو لے آؤ۔ اللہ نے تو جنت کسی خاندانی نسبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر عطا کرنی ہے۔ شرک ایک نا قابل معافی جرم ہے۔ مشرک ہو جانے کی وجہ سے تمہاری معافی نہیں ہو سکے گی۔

اللہ رب العزت مومنین اور متقین کو جنت کی طرف دوڑنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (ال عمران ۳:۱۳۳)

اور اپنے پروردگار کے سامان مغفرت کی طرف دوڑو اور بہشت کی طرف دوڑو جس کا عرض یعنی پھیلاؤ آسمان اور زمین ہے تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لیے۔

اس آیت میں مومنوں کو ایسے نیک کام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مغفرت کر کے انہیں جنت عطا کر دیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں۔ اس سے متعلق صحابہ وتابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ مغفرت سے وہ تمام اعمال صالحہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بخشش کا سبب بنتے ہیں۔ مغفرت اور جنت کی طرف دوڑنے سے مراد اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی طرف دوڑنا ہے، جن سے اللہ کے وعدے کے مطابق جنت ملتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْن ماضی کے صیغہ میں فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جنت متقیوں کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ فطرت انسانی کے مطابق انسان کی رغبت اور رجحان کسی موجود چیز کی طرف ہوتا ہے لاموجود کی طرف نہیں ہوتا۔ جنت موجود ہے تاکہ مومن جنت کی طرف کشش محسوس کرے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

---

(۱۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۲۱۹-۲۲۱

ایک اہم بات اس آیت میں قابل غور یہ ہے کہ اللہ تعالی نے مغفرت کو جنت سے مقدم کیا،اس میں اس امر کی طرف اشارہ ممکن ہے کہ مغفرت الٰہی کے بغیر جنت حاصل کر لینا ناممکن ہے ۔اس لیے کہ انسان اگر ساری عمر نیکیاں کرے اور گناہوں سے دور رہے تو بھی اس کے اعمال جنت کی قیمت نہیں بن سکتے ۔جنت میں لے جانے والے اللہ تعالی کا فضل اور اس کی بخشش ہی ہیں ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَدِّدُوْ ا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا فَاِنَّهٗ لَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ اَحَدًا عَمَلُهٗ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِی اللّٰه مِنْهُ بِرَحْمَةٍ (۱۲)

راستی اور حق اور درمیانی راہ اختیار کرو اور (اللہ کے فضل) کی بشارت حاصل کرو، کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچائے گا ،لوگوں نے کہا نہ آپؐ کا یا رسول اللہ، آپؐ نے فرمایا، نہ میرا عمل جنت میں پہنچائے گا مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔

غرض یہ کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں بن سکتے۔اللہ کی سنت یہی ہے کہ اللہ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو اعمال صالحہ کرتا ہے ۔اعمال صالحہ کی توفیق اس بات کی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہیں۔اس لیے نیک اعمال کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

اس سے اگلی آیات (ال عمران ۳:۱۳۴،۱۳۵) میں متقین کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) محسنین (۲) تائبین ۔ان کی تشریح میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

(۱)اعلی درجہ کے متقی وہ لوگ ہیں کہ جو آسائش اور سختی ،خوشی اور تکلیف میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں یعنی بڑے سخی اور کریم ہیں اور غصہ کے پی جانے والے یعنی صابر اور حلیم اور بردبار ہیں اور لوگوں کی تقصیر کو معاف کرنے والے بلکہ مزید برآں اور نیکی سے پیش آنے والے اور اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے کہ جنہوں نے اپنی قوت شہویہ اور قوت غضبیہ کو قوت روحانیہ اور عقلیہ کے تابع کر دیا ہے۔

(۲) دوسرے درجے کے متقی وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی وہ برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر کوئی ظلم کر گزرتے ہیں تو فوراً اللہ کی عظمت وجلال کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالی سے اپنے گناہوں کی معافی اور بخشش چاہتے ہیں۔کیونکہ ان کو خوب معلوم ہے کہ کون ہے جو اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کر سکے اور جو گناہ ان سے صادر ہو جاتا ہے جان بوجھ کر اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ نادم اور شرمسار رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش اور معافی ہے اور باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور نیک کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر وثواب ہے یہ اجر اور بدلہ تائبین کا ہے۔قسم اول کے متقی یعنی محسنین کو مقام محبوبیت حاصل ہے اس لیے محسنین کے لیے کسی اجر اور ثواب کا ذکر نہیں فرمایا، مقام محبوبیت کے بعد اجر وثواب کا ذکر کیا۔(۱۳)

ارشاد الٰہی ہے:

---

(۱۲)صحیح مسلم ،کتاب صفة القيامة و الجنة والنار ،باب لن يدخل احد الجنة بعمله بل برحمة الله تعالى ،رقم: ۵۰۴۹

(۱۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۵۳

کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ اور اس کے اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر فائز ہو جاؤ حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ممتاز نہیں کیا ان لوگوں کو جو تم میں سے مجاہد ہیں اور نہ جدا کیا صابرین کو(آل عمران ۳:۱۴۲)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

''کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر بغیر جہاد کیے اور بغیر تکلیف اٹھائے ہی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ خوب جان لو کہ جب تک حق تعالیٰ تمہارا امتحان لے کر مجاہدین کو غیر مجاہدین سے اور صابرین کو غیر صابرین سے لوگوں کی نظر میں واضح طور پر جدا اور ممتاز نہ کر دے اس وقت تک درجات عالیہ کی تمنا ایک خیال خام ہے۔''(۱۴)

اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی سے پرہیز کرنے والوں کو گروہوں کی شکل میں جنت میں داخل کرے گا۔اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَـنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا وَقَالَ لَهُمۡ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِيۡنَ ۝ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ صَدَقَنَا وَعۡدَهٗ وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَـنَّةِ حَيۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ (الزمر ۳۹:۷۳،۷۴)

اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے، انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے، تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم پر! بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے۔ اور وہ کہیں گے: شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں، پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس آیت کی جامع تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسے لوگ جو اپنے خدا سے ڈرے اور اپنے رب پر ایمان لائے ان کو نہایت ہی عزت و اکرام سے چلایا جائے گا اور انہیں گروہوں کی شکل میں جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ اہل جنت کے گروہ وہی جماعتیں ہوں گی جن پر خدا کا انعام ہے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے گروہ ہیں، جو ایک دوسرے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ جماعتیں مراتب تقویٰ کے لحاظ سے جدا جدا ہوں گی۔ ہر جماعت کی ایک علیٰحدہ شان ہوگی وہ اس شان کے ساتھ جنت کی طرف لے جائے جا رہے ہوں گے جیسے بادشاہ کو اس کے مصاحبین لیے جاتے ہوں۔ ان کے لیے جنت کے دروازے کھلے ہوں گے جیسے کہ معزز مہمانوں کے آنے سے پہلے ان کے استقبال کے لیے دروازے کھلے رکھے جاتے ہیں اور ان کو دیکھتے ہی جنت کے نگران ان سے کہیں گے تم پر اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کے ساتھ سلامتی ہو۔ اور خوش رہو تم۔ پس داخل ہو جاؤ اس جنت میں اس شان سے کہ تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو گے۔ ہر جانب سے تم پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی نہ کبھی کوئی تعب و مشقت پیش آئے گی اور نہ کسی قسم کا رنج و غم واقع ہو گا۔ اس موقع پر جنتی خوشی سے کہیں گے شکر ہے اس خدا کا جس نے

---

(۱۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۵۸

ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچا کر دکھایا یعنی ہمارے ایمان لانے پر جو جنت کا وعدہ تھا وہ وعدہ محض اپنے فضل سے پورا کر دیا اول تو محض وعدہ ہی اس کا فضل تھا پھر اس مہربانی پر مزید یہ کہ ہم کو اس نے ایمان کی توفیق دی پھر یہ انعام کہ ہم کو اس پر قائم رکھا۔ پھر اور کرم بالائے کرم یہ کہ اس کو قبول فرمایا اور خوشنودی کا ذریعہ بنایا لہذا یہ سب کچھ اس کا فضل ہی فضل ہے اس پر جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے اور ہم کو اس سرزمین کا وارث بنا دیا کہ ہم عالم جنت میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانہ بنالیں کوئی روک ٹوک نہیں حالانکہ دنیا میں تو کوئی ایک بالشت زمین کا ٹکڑا بھی جہاں چاہے حاصل نہیں کر سکتا تھا پھر یہاں ہر شوق اور خواہش پوری ہو رہی ہے ہر طلب پوری کی جا رہی ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۳۱)

آخر اس سے بڑھ کر کیا انعام واکرام کا درجہ ہو سکتا ہے؟ پس کیا ہی اچھا ہے اجر وثواب نیک عمل کرنے والوں کا۔'' (۱۵)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس آیت کی تشریح میں ''جنت کے دروازے اعمال کی مناسبت سے متعین ہوں گے'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

احادیث سے ثابت ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی باب الصلوۃ ہوگا۔ کوئی دروازہ باب الصدقہ ہوگا۔ کوئی باب الصیام جس کو باب الریان فرمایا گیا، کوئی باب الحج ہوگا علی ھذا القیاس۔ ان دروازوں میں ہر ایک دروازہ سے داخل ہونے والے وہ ہوں گے جو اپنی زندگی اور عمل سے خاص شغف رکھنے والے ہوں گے مثلاً جن پر نماز کا رنگ غالب ہوگا وہ باب الصلوٰۃ سے اور جن پر صدقہ وخیرات کا رنگ غالب ہوگا وہ باب الصدقہ سے داخل ہوں گے اور جن پر جہاد کا رنگ غالب تھا وہ باب الجہاد سے اور اسی لحاظ سے ان کو پکارا جائے گا۔ (۱۶)

سورہ مومنون کے آغاز میں کامیاب مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے انہیں جنت الفردوس کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ان صفات کا تعلق عبادات اور اخلاق سے ہے۔ سید ابوالاعلی مودودی ان آیات (۱ - ۱۱) سے چار اہم مضامین اخذ کرتے ہیں:

(۱) جو لوگ بھی قرآن اور محمد ﷺ کی بات مان کر یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرلیں گے اور اس رویے کے پابند ہو جائیں گے، وہ دنیا اور آخرت میں فلاح پائیں گے، قطع نظر اس سے کہ کسی قوم، نسل یا ملک کے ہوں۔

(۲) فلاح محض اقرار ایمان یا محض اخلاق اور عمل کی خوبیوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ جب آدمی خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مانے، پھر اس کے مطابق اخلاق اور عمل کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرلے، تب وہ فلاح سے ہم کنار ہوگا

(۳) یہ کہ فلاح محض دنیوی اور مادی خوشحالی اور محدود وقتی کامیابیوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک وسیع تر حالت خیر کا نام ہے، جس کا اطلاق دنیا و آخرت میں پائدار و مستقل کامیابی وآسودگی پر ہوتا ہے۔ یہ چیز ایمان وعمل صالح کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور اس کلیے کو نہ تو گمراہوں کی وقتی خوشحالیاں اور کامیابیاں توڑتی ہیں، نہ مومنین صالحین کے عارضی مصائب کو اس کی نقیض ٹھیرایا جا سکتا ہے۔

(۴) مومنین کے ان اوصاف کو نبی ﷺ کے مشن کی صداقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہی مضمون آگے کی تقریر سے ان آیات کا ربط قائم کرتا ہے۔ تیسرے رکوع کے خاتمے تک کی پوری تقریر کا سلسلہ استدلال اس طرح پر ہے

---

(۱۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۷، ص:۱۱۵

(۱۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۷، ص:۱۱۷

کہ آغاز میں تجربی دلیل ہے، یعنی یہ کہ اس نبی کی تعلیم نے خود تمہاری ہی سوسائٹی کے افراد میں یہ سیرت و کردار اور اخلاقی اوصاف پیدا کر کے دکھائے ہیں، اب تم خود سوچ لو کہ یہ تعلیم حق نہ ہوتی تو ایسے صالح نتائج کس طرح پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے بعد مشاہداتی دلیل ہے، یعنی یہ کہ انسان کے اپنے وجود میں اور گرد و پیش کی کائنات میں جو آیات نظر آتی ہیں، وہ سب توحید اور آخرت کی اس تعلیم کے برحق ہونے کی شہادت دے رہی ہیں جسے محمد ﷺ پیش کرتے ہیں۔ پھر تاریخی دلائل آتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ نبی اور اس کے منکرین کی کشمکش آج نئی نہیں ہے بلکہ انہی بنیادوں پر قدیم ترین زمانے سے چلی آ رہی ہے اور اس کشمکش کا ہر زمانے میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا رہا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ فریقین میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔''(۱۷)

اللہ رب العزت نے سورہ رعد میں اہل عقل کی صفات بیان فرمائی ہیں اور ان کے لیے دار آخرت اور ہمیشگی کے باغات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ عقل، دل کے اندر چھپی ہوتی ہے اس لیے اس کا اندازہ صفات سے ہو سکتا ہے کہ عقل موجود ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو کس درجہ کی ہے؟ اہل عقل کی مندرجہ ذیل صفات ہیں:

(۱) وہ اللہ تعالی کے عہد ربوبیت کو پورا کرتے ہیں جو انہوں نے میثاق کے دن اللہ تعالی سے باندھا تھا۔
(۲) عہد کو توڑنے یعنی نافرمانی سے باز رہتے ہیں۔
(۳) صلہ رحمی کرتے ہیں اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کرتے ہیں۔
(۴) اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی کام ہم سے عہد کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔
(۵) سخت محاسبہ (حساب کی سختی) سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے کہ جس حساب میں مناقشہ اور چھان بین ہوئی وہ ہلاک ہوا۔
(۶) جن لوگوں نے محض اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لیے جادہ طاعت پر قائم رہنے میں صبر کیا یعنی شرائع عبودیت کی پابندی کی اور نفس کی مخالفت کی وجہ سے مشقت برداشت کی۔
(۷) ٹھیک وقت اور ٹھیک آداب کے ساتھ نماز کو ادا کیا۔
(۸) جو مال و منال، علم اور فضل و کمال ہم نے ان کو دیا اس میں سے کبھی پوشیدہ اور کبھی ظاہر جیسا موقع ہوا خرچ کیا۔
(۹) وہ بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں یعنی برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں اور سیئہ کی ظلمت کو حسنہ کے نور سے زائل کر دیتے ہیں۔ **(الرعد۱۳:۲۰-۲۴)**

ایسے ہی عقل مندوں کے لیے دار آخرت ہے یعنی ان کے لیے ہمیشگی کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد، ان کی بیویاں اور ان کی اولاد جو نیک ہیں وہ بھی ان کے ساتھ ان باغات میں داخل ہوں گے۔ اگر چہ ان کے اعمال اولوالالباب جیسے نہ ہوں مگر معاملہ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوگا۔ یہ اولوالالباب کی خاص کرامت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا ایمان درست ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور ۵۲:۲۱)

---

(۱۷) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳ ص:۲۶۸، ۲۶۹

اور جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد
کوان کے ساتھ ملا دیا اور ہم نے ان کے عمل سے کچھ کمی نہیں کی، ہر آدمی اپنے اعمال میں رہن ہے۔

اللہ رب العزت اہل جنت کوان کے دنیاوی اعمال کے بدلے میں جنت کی وراثت عطا کرے گا، ارشاد الٰہی ہے:

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الزخرف ۴۳:۷۲)

اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے اپنے اعمال کے صلے میں۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''جنت مجرد انعام کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ملے گی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اللہ تعالی اہل جنت کو یہ عظیم خوشخبری سنائے گا کہ یہ جنت تمہارے اعمال کے صلہ میں تم کو عطا ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض تم پر انعام نہیں بلکہ یہ تمہارا حق بھی ہے۔ اگر کوئی عزت افزائی استحقاق کے بغیر ہو تو دل کو اس سے سچی خوشی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالی نے انسانی فطرت کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس نے جنت کو مجرد فضل واحسان کی بجائے اہل جنت کا حق اوران کی ان محنتوں کا ثمرہ قرار دیا ہے جو حق کی راہ میں انہوں نے برداشت کی ہیں۔'' (۱۸)

اسی طرح کی ایک آیت سورہ اعراف میں بھی آئی ہے۔ وہاں ارشاد الٰہی ہے:

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الاعراف ۷:۴۳)

اورانہیں ندا دی گئی کہ تم اس جنت کے وارث ہو گے (ان اعمال کے) صلہ میں جو تم کرتے تھے

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

''یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہل جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی، بلکہ وہ خدا کی حمد وثنا اور شکر واحسان مندی میں رطب اللسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالی ان پر اپنا احسان نہ جتائے گا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلے میں پایا ہے، یہ تمہاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمہیں دی جارہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں بلکہ تمہاری سعی کا اجر ہے، تمہارے کام کی مزدوری ہے اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوت بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اس انداز بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی وکوشش کا نتیجہ ہے اور اسی بنا پر وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ متکبر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجالاتے ہیں۔ جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع، رحیم وشفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے حسن عمل پر غرور کی بجائے اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے ہیں۔ اپنے عمل کی بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔'' (۱۹)

---

(۱۸) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۷، ص:۲۵۳

(۱۹) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۳۱، ۳۲

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ اللہ تعالی کی طرف سے اہل جنت کے لیے عام منادی ہوگی کہ اس جنت کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ۔اہل جنت کا خود اپنا احساس یہ نقل ہوا کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی وعمل کے بجائے صرف خدا کے فضل واحسان کا ثمرہ سمجھیں گے، لیکن اللہ تعالی اس کو ان کے سعی وعمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں ۔آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے لیکن رب کریم اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا ۔کون اندازہ کرسکتا ہے اس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہوگا کہ یہ اس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے۔انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کو نعمتیں حاصل ہوں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اس کی اپنی ہوں۔اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالی جنت میں اس کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔

اس آیت میں وراثت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس میں ایک لطیف تلمیح ہے اس ماجرے کی طرف جو اوپر آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا مذکور ہوا ہے۔ وہاں یہ ارشاد موجود ہے کہ اولاد آدم میں سے وہی لوگ اپنے باپ کی اس جنت کے وارث ٹھہریں گے جو شیطان کی تمام فتنہ آرائیوں کے علی الرغم ایمان وعمل صالح کی صراط مستقیم پر قائم رہیں گے ۔یہاں **اورثتموها** کا لفظ استعمال کر کے گویا شاباش دے دی کہ بے شک تم نے بازی جیت لی اور اب تم حقدار ہو کہ تم اس جنت کے وارث بنائے جاؤ۔''(۲۰)

اس ساری تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنت لغت میں باغ کو کہتے ہیں لیکن شریعت اسلامی میں یہ اس مقام کا نام ہے جو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال انسانوں کے انعام کے طور پر تیار کی گئی ہے۔ جنت کے حصول کے لیے ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہے۔ عمل صالح نہ ہونے کی صورت میں برے اعمال کی سزا پانے کے بعد اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ بخش دے گا۔ جنت حاصل کرنے کے لیے ابرار اور متقین کی ان صفات کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ جنت کے دروازے اعمال کے حساب سے ہوں گے۔ جنت صرف ایمان اور عمل صالح کی بنا پر ہی نہیں ملنی بلکہ اللہ کے فضل کا شامل حال ہونا بھی ضروری ہے۔ اللہ کے فضل کے بغیر محض ہمارے اعمال ہمیں جنت میں نہیں لے جا سکتے ۔اس لیے ضروری ہے کہ نیک اعمال کے ساتھ اللہ کے فضل کو مانگا جائے۔

(۳) احساس مسئولیت:

انسان اپنے اعمال کے بارے میں اللہ تعالی کے سامنے جوابدہ ہے۔ارشاد الہی ہے:

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ o عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الحجر ۱۵: ۹۲، ۹۳)

سو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب (اگلوں اور پچھلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے)۔

---

(۲۰) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳، ص:۲۵۹، ۲۶۰

مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں حق تعالیٰ اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ان سب اگلوں پچھلوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی ۔صحابہ کرامؓ نے آنحضورؐ سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملے سے متعلق ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا قول لا الہ الا اللہ کے متعلق، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد اس عہد کو عملی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کیونکہ زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و ہیئت بنانے سے اور دین محض تمنائیں کرنے سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا ہو اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان کو اللہ کے محارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے۔''(۲۱)

بعث بعد الموت (مرنے کے بعد جی اٹھنا) سے ہماری اخلاقی جدوجہد کو تقویت ملتی ہے۔ جب ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ آزاد اور با اختیار ہونے کے ساتھ ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے افعال کے جوابدہ ہیں تو اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ ہم اپنے اختیار اور ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ یعنی برائی سے اجتناب کریں اور اچھائی کو اپنا شعار بنائیں۔ اسی طرح خیر و شر کے بارے میں ہمارے تمام شکوک دور ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ ہمارے ذہن کی ہی تخلیق نہ ہوں اور کائنات کے اس وسیع نظام سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اخلاقی اقدار جب معروضی حیثیت اختیار کر لیں تو اس سے وہ شوق اور لگن پیدا ہوتی ہے جو اخلاقی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آخرت میں جزا کی امید اور سزا کا خوف ہمیں دنیا میں بہترین اخلاقی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔

بختیار حسین صدیقی لکھتے ہیں:

''اخلاقیات کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے جرمن مفکر کانٹ نے خدا کے وجود، ارادے کی آزادی اور موت کے بعد زندگی کو لازمی مفروضات قرار دیا ہے۔ جبکہ قرآن عظیم کی رو سے یہ مفروضات نہیں بلکہ مسلمہ حقائق ہیں۔ مفروضات پر یقین وہ سوز پیدا نہیں کر سکتا جو حقیقت پر ایمان لانے کی لازمی خصوصیت ہے اور نہ ہی اخلاقی اقدار کو وہ معروضیت حاصل ہو سکتی ہے جو حقیقت پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ جرم کرنے کے باوجود ہم انسانی عدالتوں کی گرفت سے تو بچ سکتے ہیں لیکن خدا کی عدالت سے اس طرح بچنے کا کوئی امکان نہیں، اس جذبے کی نشو و نما کرتا ہے کہ ہم دل کی گہرائی سے برائی کے بارے میں نہ سوچیں، عملی طور پر اس کا ارتکاب کرنا تو بڑی بات ہے۔ جیسا کہ اخلاقیات کا دعویٰ ہے کہ اعمال کی قدر و قیمت کا انحصار نیت پر ہے، تو اسے درست اور ٹھیک رکھنے کے لیے جتنی قوت مرنے کے بعد جی اٹھنے کے دینی نظریے سے ملتی ہے مابعد الطبیعات کے کسی مفروضے سے نہیں ملتی۔''(۲۲)

انسانی اعضاء سے بھی اعمال کے بارے میں سوال ہوگا، ارشاد الٰہی ہے:

---

(۲۱) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵،ص:۳۰۲

(۲۲) بختیار حسین صدیقی، اسلامی فلسفہ اخلاق (لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ۱۹۷۲ء) ص:۹۰، ۹۱

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ سے بھی ان اعضاء کے متعلق سوال ہوگا اور خود ان اعضاء سے بھی پوچھا جائے گا۔ مثلاً کان سے سوال ہوگا کہ تو نے زندگی میں کیا کیا سنا ؟ آنکھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے زندگی میں کیا کیا دیکھا؟ دل سے سوال کیا جائے گا کہ اس میں کیسے خیالات جنم لیتے رہے اور کن چیزوں پر یقین کیا؟ اگر کان سے ایسی باتیں سنیں جن کا سننا شرعاً جائز نہیں تھا جیسے کسی کی غیبت یا حرام گانا بجانا وغیرہ یا آنکھ سے ایسی چیزیں دیکھیں جن کا دیکھنا شرعاً حرام تھا جیسے غیر محرم عورت، کسی کم عمر لڑکے کو بری نظر سے دیکھنا وغیرہ یا دل میں قرآن وسنت کے مخالف عقیدہ جمانا یا کسی کے متعلق اپنے دل میں دلیل کے بغیر کوئی الزام قائم کر لیا تو اس سوال کے نتیجے میں عذاب میں گرفتار ہوگا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی تمام نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا:

لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (التکاثر ۱۰۲:۸)

پھر ضرور اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی

ان، آنکھ، دل ان نعمتوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں، اس لیے ان کا بطور خاص ذکر فرمایا۔

تفسیر قرطبی اور مظہری میں اس کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے پہلے حصے میں ارشاد ہے کہ جس چیز کا تمہیں علم اور تحقیق نہیں اس پر عمل نہ کرو۔ اس کے ساتھ متصل کان، آنکھ اور دل سے سوال کرنے کا مطلب یہ ہے بغیر تحقیق مثلاً کسی شخص پر کوئی الزام لگایا یا کسی بات پر بغیر تحقیق کے عمل کیا۔ اگر وہ ایسی چیز ہے جو کان سے سنی جاتی ہے تو کان سے سوال ہوگا اور آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ اور دل سے سمجھنے کی چیز ہے تو دل سے سوال ہوگا کہ یہ شخص اپنے الزام اور اپنے دل میں جمائے ہوئے خیال میں سچا ہے یا جھوٹا اس پر انسان کے یہ اعضاء خود شہادت دیں گے جو حشر کے میدان میں بے تحقیق الزام لگانے والے اور بے تحقیق باتوں کے لیے بڑی رسوائی کا سبب بنے گا۔

جیسا کہ سورہ یٰس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یسٓ ۳۶:۶۵)

یعنی آج قیامت کے دن ہم مجرموں کے مونہوں پر مہر لگا کر بند کر دیں گے اور ان کے ہاتھ بولیں گے اور پاؤں گواہی دیں گے کہ اس نے ان اعضاء سے کیا کیا کام اچھے یا برے لیے ہیں۔

مفتی محمد شفیعؒ آنکھ، کان اور دل کی وجہ تخصیص بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

یہاں کان، آنکھ اور دل کی تخصیص شاید اس بنا پر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ حواس اور دل کا شعور وادراک اسی لیے بخشا ہے کہ جو خیال یا عقیدہ دل میں آئے ان حواس اور ادراک کے ذریعہ اس کو جانچ سکے کہ یہ صحیح ہے تو اس پر عمل کرے اور غلط ہے تو باز رہے۔ جو شخص ان سے کام لیے بغیر بے تحقیق باتوں کی پیروی میں لگ گیا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی۔

پھر وہ حواس جن کے ذریعہ انسان مختلف چیزوں کو معلوم کرتا ہے پانچ ہیں: کان، آنکھ، ناک، زبان کی قوتیں اور پورے بدن میں وہ احساس جس سے کسی چیز کا سرد و گرم وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے مگر عادۃ انسان کو زیادہ معلومات کان یا آنکھ سے ہوتی ہیں ۔ناک سے سونگھنے، زبان سے چکھنے اور ہاتھ سے چھونے کے ذریعہ جن چیزوں کا علم ہوتا ہے وہ سننے اور دیکھنے والی چیزوں کی نسبت سے بہت کم ہے، اس جگہ حواس خمسہ میں سے صرف دو کے ذکر پر اکتفا کرنا شاید اسی وجہ سے ہو، پھر ان میں بھی کان کو آنکھ پر مقدم کیا گیا ہے اور قرآن کریم کے دوسرے مواقع میں بھی جہاں کہیں ان دونوں چیزوں کا ذکر آیا ہے ان میں کان کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہی ہے کہ انسان کی معلومات میں سب سے بڑا حصہ کان سے سنی ہوئی چیزوں کا ہوتا ہے، آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزیں ان سے نسبتاً بہت کم ہیں۔ (۲۳)

اخلاق کے متعلق براہ راست بھی سوال ہوگا۔ جیسے وعدہ کے بارے میں فرمایا:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴)

عہد کے حکم میں ہم اس کے متعلق لکھ آئے ہیں کہ قیامت کے دن معاہدات یا وعدوں کے بارے میں بھی سوال ہوگا اور یہی احساس مسئولیت انسان کو وعدے کی پابندی پر مجبور کرتی ہے۔

''غرض قدم قدم پہ اخروی محاسبے اور جوابدہی کا احساس انسان کو نیک سیرت بناتا ہے۔ یہ خوف کہ ایک دن اس سے حساب لیا جانا ہے اسے ہر قسم کی خیر کے قریب اور ہر قسم کے شر سے دور کر دیتا ہے۔ جیسے اہل عقل کی صفات میں ہے: **وَيَخَافُوۡنَ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ (الرعد ۱۳:۲۱)** یعنی یہ لوگ برے حساب سے ڈرتے ہیں۔ برے حساب سے مراد حساب میں سختی اور جزرسی ہے ،حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمت الہی سے ہوسکتی ہے کہ حساب اعمال کے وقت اختصار اور عفو و درگزر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص کا پورا پورا، ذرہ ذرہ کا حساب لے لیا جائے اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و خطا کبھی سرزد نہ ہوا ہو۔'' (۲۴)

احساس مسئولیت ایک مسلمان کو فرائض ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اسے گناہوں سے بچاتا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے اسے اعلی درجے کا انسان بناتا ہے۔ اس طرح وہ ناکامی کے خوف اور کامیابی کی امید کے ساتھ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے نیک عمل کرتا رہتا ہے۔

---

(۲۳) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵، ص:۴۷۰، ۴۷۱

(۲۴) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵، ص:۱۷۹

فصل دوم:

اصلاح اخلاق کے محرکات

(۱)عقائد اسلامی بطور محرک اخلاق :

عقائد،عقیدہ کی جمع ہے جو عقد سے ماخوذ ہے۔عقد کے معنی ہیں''گرہ لگانا''۔عقیدہ کے معنی ہوئے''باندھی ہوئی یا گرہ لگائی ہوئی چیز''۔
انسان کے پختہ اوراٹل نظریات عقائد کہلاتے ہیں۔ان کو ایمانیات بھی کہا جاتا ہے۔
سید سلیمان ندویؒ''عقائد'' کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

> ''انسان کے تمام اعمال،افعال اور حرکات کا مرکز اس کے خیالات ہیں یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں
> ،یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ،غیر متزلزل اور غیر مشکوک انسانی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں،ان
> ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔''(۱)

انسان کے دل و دماغ پر نظریات کی حکومت ہوتی ہے اور یہی نظریات انسانی اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔انسان کے تمام اعمال و افعال اس کے افکار و نظریات کے زیر اثر ہوتے ہیں۔انسان کی ہدایت اور گمراہی کا انحصار اس کے اس کے قلبی جذبات اور ذہنی افکار پر ہوتی ہے۔عقیدہ کی مثال ایک بیج کی سی ہے اور عمل اس بیج سے اگنے والا پودا ہے۔ظاہر ہے جو بیج کی خاصیتیں ہیں وہی پودے میں موجود ہوں گی اسی طرح جو عقیدہ کے خواص ہیں وہ عمل میں موجود ہوں گے۔عقیدہ اگر صحیح اور اچھا ہے تو عمل بھی صحیح اور اچھا ہوگا،عقیدہ اگر باطل اور خراب ہے تو عمل بھی باطل اور خراب ہوگا۔

اسلام میں نیک اعمال کے لیے ایمان کا ہونا پہلی شرط ہے۔قرآن مجید نے کئی مقامات پر یہ بات واضح کی ہے کہ ایمان کے بغیر نیک عمل کا تصور ناممکن ہے۔قرآن مجید میں نیکی کے لیے''بر'' کی جامع اصطلاح استعمال کی گئی جس میں اسلامی عقائد کو اولیت حاصل ہے۔نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں آپؐ نے عقائد کی تبلیغ کی۔جب آپؐ کے متبعین کے عقائد اور ایمان پختہ ہوگئے تو پھر احکام نازل ہوئے،ایمانی پختگی کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے اس پر فوراً عمل فرمایا اور عملی لحاظ سے ایک مثالی معاشرہ قائم ہوا۔

ارشاد نبویؐ کے مطابق ہمارے تمام اعمال کی بنیاد''ارادہ'' ہے اور ارادے میں تحریک خیالات اور جذبات پیدا کرتے ہیں۔باطنی عقائد ہمارے خیالات اور جذبات پر حکومت کرتے ہیں جسے عام طور پر لفظ''دل'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انسانی اخلاق کے ضمن میں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اسی کی طرف حضورؐ نے اپنی احادیث میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔دل کی اندرونی کیفیت کی اصلاح کے لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے دیکھ رہی ہے۔ہم مجمع عام میں ہوں یا تنہائی میں،اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں،غرض جہاں بھی ہوں کوئی ہے جو اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہا ہے۔دنیا کی تمام قوتیں جسم پر حکمران ہیں مگر وہ قدیر دل کی دنیا پر حکمران ہے۔دوسرا یہ تصور کہ انسان کو اس کے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی۔ان دو خیالات کے علاوہ اچھے ارادے سے اچھے اعمال کا وجود قطعی محال ہے۔وحی محمدی نے ایمان باللہ و بالآخرہ کو ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دیا ہے۔صحیح ایمان سے حسن نیت پیدا ہوتی ہے۔

کفر ایمان کی قطعی ضد ہے۔ایمان اور کفر کے درمیان تضاد ہی وہ معیار مہیا کرتا ہے جس کے مطابق تمام انسانی عادات کو اخلاقی طور پر دو مختلف

---

(۱)علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،سیرۃ النبی ﷺ (لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب،۱۹۹۱ء)ج۴،ص:۲۱۸

حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔مومن اور کافر میں جوفرق موجود ہے، یہی اسلام کے اخلاقی نظام کی بنیاد ہے۔ایمان کی عملی شہادت اللہ تعالی کے احکام کی اطاعت اور برائیوں کوترک کر کے نیک کام کرنے سے دی جاسکتی ہے۔اسی لیے اللہ تعالی نے حقیقی اور کامیاب مومنین کی پہچان کے لیے ان کی اخلاقی صفات کاذکر کیا ہے۔

اسلامی عقائد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ حق ہیں اور انسانی عمل کی صحیح بنیاد فراہم کرتے ہیں ۔ یہ عقائد انسان میں نیک عمل کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اسے ہرصورت میں برائی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں ۔عقیدہ توحید مسلمانوں میں تقوی اور خوف خدا جیسی صفات پیدا کرتا ہے اور خدا کے رنگ میں رنگنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔عقیدہ رسالت انسان کو اعلی اخلاق کی تشریح اور بہترین عملی نمونہ فراہم کرتا ہے۔ایمان بالملائکہ انسانوں میں نیکی کے قریب ہونے اور برائی سے دور ہونے کا شعور پیدا کرتا ہے۔الہامی کتابوں کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ اخلاقیات کی تعلیم پر مشتمل ہے۔عقیدہ آخرت میں جوابدہی کا احساس انسان کو نیکی کی راہ پر چلائے رکھتا ہے۔اس طرح اسلامی عقائد مسلمانوں میں نیکی کی ایک تحریک پیدا کر دیتے ہیں۔

ا۔عقیدہ توحید بطور محرک اخلاق:

عقیدہ توحید ایک مسلمان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ میرا رب میرے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور نیکی میں اصل اہمیت اسی شعور کی ہے کہ اللہ تعالی ہماری کارگزاری دیکھ رہے ہیں،اس سلسلے میں ارشاد الہی ہے:

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ(البقرہ ۲:۲۱۵)

اور جوتم نیکی کا کام کرو گے تو اللہ تعالی اس کو خوب جانتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی سلسلے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ(البقرہ ۲:۲۲۰)

اللہ تعالی خرابی کرنے والے کو سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

> ''اور اللہ تعالی مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو الگ الگ جانتے ہیں (پس مخالطت (یتیم کے مال میں اپنا مال ملانا) اس قسم کی نہ ہونی چاہیے کہ جس میں ان کی مصلحت ضائع ہو جائے مثلا اپنا حصہ برائے نام تھوڑا سا ملا دیا باقی سب انہی کا کھایا جوایسا کرے گا اللہ تعالی سے اس کی بدنیتی چھپ نہیں سکتی اور مخالطت میں ان کی مصلحت کی رعایت رکھے بالفرض اگر علم اور ارادے کے بغیر کچھ کمی بیشی بھی ہو جائے تو چونکہ اللہ تعالی کو اس کی نیک نیتی معلوم ہے اس لیے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔''(۲)

اگر چہ یہاں پر بات یتیم کے حوالے سے ہورہی ہے کہ اللہ تعالی جانتے ہیں کہ کس نے یتیم کے مال میں خیانت اور اسے خراب کرنے کے ارادے سے شمولیت کی اور کس نے یتیم کی مصلحت اور خیر خواہی کا ارادہ کیا ہے؟ لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارا ہر اچھا یا برا عمل اللہ تعالی کے علم میں ہے۔

عقیدہ توحید انسان میں نیکیوں کے بادشاہ یعنی تقوی کو اجاگر کرتا ہے۔تقوی کا جذبہ انسان کو برائیوں سے بچاتا اور نیکیوں پر ابھارتا ہےکیونکہ مومن یہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالی اس کے ہر عمل کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے بارے میں جانتے ہیں، نیز اس کا کوئی عمل اس کے رب سے چھپ نہیں سکتا اور قیامت کے دن اس کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔اس طرح عقیدہ توحید انسانی زندگی کے بلند ترین مقصد یعنی اطاعت الہی کا

---

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۱۴۳

تعین کرتا ہے اور اللہ کا عبد ہونے کے حوالے سے اس میں احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے کہ اللہ تعالی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ اور اس تعلق باللہ کے تقاضے کیا ہیں؟ زمین پر خلیفۃ اللہ ہونے کے ناطے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں؟ یہی وہ علم ہے جو انسانی عمل کی راہوں کا تعین کرتا ہے، جس کی نشاندہی سورہ فاتحہ میں کر دی گئی ہے۔

عقیدہ توحید کے اخلاقی پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ذاتی واجتماعی افعال کا سرچشمہ اللہ تعالی ہے۔توحید کا عقیدہ اور تصور ہی انسان کو فرض کی ادائیگی پر آمادہ کرتا ہے مثلا پانچ وقت کی نماز با جماعت کا اہتمام، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کا فریضہ، پھر تمام محرمات ومنکرات سے دور رہنا اور سنت ونفل اعمال انجام دینا۔ان تمام صالح امور کی انجام دہی اور گناہوں سے اجتناب کے انتظام پر انسانی عقیدے کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔عقیدہ توحید کے اخلاقی پہلو کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ ۲:۲۸۴)

تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ (بہر حال ان کا) تم سے حساب لے گا۔

جو اخلاق اور اعمال تمہارے دل میں اور ضمیر میں مضمر اور پوشیدہ ہیں ان کو زبان یا اعضاء وجوارح سے ظاہر کر دیا یا دل میں ہی چھپائے رکھو، ان سب پر اللہ تعالی قیامت کے دن تم سے حساب لے گا اور پھر محاسبہ کے بعد جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔اگر چاہیں تو صغیرہ پر بھی عذاب دے سکتے ہیں اور چاہیں تو کبیرہ کو بھی بلا توبہ معاف فرما دیں۔تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ اعمال قلبیہ، قالبیہ، افعال نفسانیہ اور جسمانیہ خواہ صغائر ہوں یا کبائر سب پر محاسبہ حق ہے اور جزا اور سزا سب اللہ کے اختیار ہیں کوئی شے اس پر واجب نہیں۔صحابہ کرامؓ الفاظ کے ظاہری مفہوم کو دیکھ کر گھبرا گئے (کہ دل کے خیالات کا بھی حساب ہوگا) اور اللہ کے رسولؐ سے عرض کی یا رسول اللہ! یہ حکم سخت مشکل ہے اختیاری امور سے تو بچ سکتے ہیں مگر خطرات قلبیہ اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا مشکل ہے؟

حضورؐ نے ان کے اس قول کو سن کر فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو اور دل وجان سے اس کے حکم کو قبول کرو اور اللہ تعالی سے مدد مانگو۔صحابہ کرامؓ نے فوراً ہی سمعنا وطعنا کہا۔اللہ تعالی کو صحابہ کی یہ بات پسند آئی اور اگلی آیات میں ان کی تعریف کے بعد ان کے اشکال کا جواب دیا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ۔کہ جو چیز انسان کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے انسان اس کا مکلف نہیں۔لہذا دل میں جو گناہ کا خیال اور خطرہ آ جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک خود اپنے اختیار اور ارادہ سے اس پر عمل نہ کرے یا زبان سے اس کا تکلم اور تلفظ نہ کرے اور بھول چوک پر بھی کوئی مواخذہ نہیں البتہ جو باتیں انسان کی قدرت اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا۔(۳)

دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل کے جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آ سکے۔مثلا ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آ سکے لیکن اللہ تعالی کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

اس پوری آیت کے محل وقوع پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمے کی

---

(۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۵۴۴،۵۴۵

نہایت جامع اور موثر تمہید ہے۔اوپر والی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ شہادت کو نہ چھپاؤ جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل آلودہ معصیت ہوجاتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ یہ مضمون کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا تو گویا بات پوری طرح مدلل و مکمل ہوگئی۔

آگے سے اس کا ربط یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔احکام وقوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساس دین کا مقام حاصل ہے چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لیے تعلیم شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے، اس کے بعد نماز کا۔اب خاتمے پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لیے توحید کی پھر یاددہانی کی اور یاددہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گراں باریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کی بجائے صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کے آگے جواب دہی کے لیے تیار رہے۔(۴)

اللہ تعالی کے مبارک نام اور اس کی صفات کا عقیدہ دین اسلام میں عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی چند مخصوص صفات الہیہ کے علاوہ باقی اوصاف الٰہی انسانی اخلاق کا معیار ہیں۔انسان اگر اپنے رب سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو ان اوصاف کے ذریعے نسبت پیدا کرے اور ان خوبیوں کو انتہائی اعلی معیار سمجھ کر ان کی نقل اور پیروی کی خواہش کرے۔انسان اس دنیا میں اللہ تعالی کا خلیفہ ہے اور نائب میں اصل کی صفات کا عکس جتنا نمایاں ہوگا وہ اتنے زیادہ بہتر طریقے سے فرض نیابت ادا کر سکے گا اور وہ خدا کے رنگ میں رنگ کر نمایاں ہوجائے گا۔

صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةًوَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ (البقرہ ۲:۱۳۸)

ہم نے رنگ لیا اللہ کا اور کس کا رنگ اللہ سے بہتر ہے اور ہم اس کی بندگی پر ہیں۔

تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود ''خدا کا دین فطرت'' ہے۔(۵)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

اے مسلمانو!تم ان سے یہ کہہ دو کہ ہم کو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اس کی اطاعت اور فرماں برداری کا رنگ ہمارے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے؟ جو اس کی طرف نظر کی جائے اور یہ رنگ ہم سے زائل نہیں ہوسکتا اس لیے کہ ہم خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔عبادت کی وجہ سے وہ رنگ اور پختہ ہوجاتا ہے اور اخلاص کی وجہ سے دوسرے رنگ کا اس پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پاتا۔عبادت اور اخلاص کی وجہ سے وہ اور زیادہ چمکتا ہے۔

ظہور اسلام کے وقت یہود ونصاری میں اصطباغ کی رسم جاری تھی۔پہلے اس رسم کا رواج یہود میں ہوا اور پھر عیسائیوں نے بھی اسے جاری رکھا اور اب تک عیسائیوں میں یہ رسم موجود ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا یا کوئی عیسائیت کو قبول کرتا تو اس کو زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے ہیں یا اس کے سر پر اس میں سے کچھ پانی ڈال دیتے ہیں کہ اور کہتے ہیں کہ اب سچا عیسائی ہوگیا اسی رسم کا نام اصطباغ ہے جس کو آج کل بپتسمہ دینا کہتے ہیں۔چونکہ یہود ونصاری مسلمانوں سے کہتے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ، اس طرح وہ ان کو اصطباغ کی دعوت دیتے تھے اس پر اللہ تعالی نے یہ آیت **صِبۡغَةَ اللّٰهِ** نازل کی اور مسلمانوں کو ان کی دعوت اصطباغ کا یہ جواب سکھایا کہ ہم تمہارا اصطباغ لے کر کیا کریں گے؟ ہمیں تو اللہ کے دین کا رنگ کافی ہے۔

---

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۶۴۷

(۵) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج ۴، ص:۲۷۵

اس سے زیادہ اور بہتر کون سا رنگ ہوسکتا ہے اور تم لوگ حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا اور اپنا خداوند سمجھنے کی وجہ سے شرک کے ناپاک رنگ میں رنگے ہو تم اہل توحید اور اہل اخلاص کو کس رنگ کی دعوت دیتے ہو؟‘‘(۶)

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک اس آیت کے دو ترجمے* ہو سکتے ہیں:

’’ایک یہ کہ ’’ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا۔‘‘ دوسرا یہ کہ ’’اللہ کا رنگ اختیار کرو۔‘‘ مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا اسے غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دھل گئے اور اس نے زندگی کا نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کر لی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اصطباغ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے ۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔(۷)

صوفیہ کا مقولہ ہے: **تخلقوا باخلاق الله** (خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو)۔

ایمان بالملائکہ کا اخلاقی پہلو:

فرشتوں پر ایمان لانے سے انسان یہ مانتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس پر اپنے دو نگران معزز فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو انسان کے نامہ اعمال کو تیار کر رہے ہیں۔ ان کا نام ’’کراما کاتبین‘‘ ہے۔ فرشتے انسان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور برائی لکھ رہے ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد الہی ہے:

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ o كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ o يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ (الانفطار ۸۲: ۱۰، ۱۱، ۱۲)

حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔

یعنی تم لوگ چاہے دارالجزا کا انکار کرو، یا اس کو جھٹلاؤ، یا اس کا مذاق اڑاؤ، اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس نے تم میں سے ایک ایک آدمی پر نہایت راست باز نگران مقرر کر رکھے ہیں، جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمہارے تمام اچھے اور برے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں، اور ان سے تمہارا کوئی کام چھپا ہوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، خلوتوں میں، سنسان جنگلوں میں یا اور کسی ایسی حالت میں اس کا ارتکاب کرو جہاں تمہیں پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ ان نگران فرشتوں کے لیے اللہ تعالی نے **كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ** کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں۔ کسی سے ذاتی محبت اور عداوت نہیں رکھتے، کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلاف واقعہ ریکارڈ تیار کریں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئے بغیر بطور خود غلط سلط اندراجات کر لیں۔ رشوت خور بھی نہیں ہیں کہ کچھ
لے دے کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ ان کا مقام ان ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک اور بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہو گی اور کسی کے ذمے کوئی ایسی برائی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔

پھر ان فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے وہ جانتے ہیں، یعنی ان کا حال دنیا کی سی آئی ڈی اور اطلاعات

---

*صبغۃ اللہ کے اعراب میں مفسرین کا اختلاف ہے جو مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

(۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص: ۳۰۰، ۳۰۱

(۷) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص: ۱۱۶

(Intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ تمام تگ ودو کے باوجود بہت سی باتیں ان سے چھپی رہ جاتی ہیں۔وہ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہیں، ہر جگہ، ہر حال میں، ہر شخص کے ساتھ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اسے یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے اور انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیت سے کوئی کام کیا ہے۔اس لیے ان کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے، جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔اسی کے متعلق ارشاد ہے:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکھف ۴۹:۱۸)

قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامہ اعمال پیش کیا جارہا ہے، اس میں کوئی چھوٹی بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی، جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب جوں کا توں ان کے سامنے حاضر ہے۔(۸)

جب مسلمان کا یقین اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے نیک اور برے تمام اعمال لکھے جارہے ہیں اور کراما کاتبین ہر وقت اس کے ساتھ ہیں وہ جو عمل بھی کرے گا لکھ لیا جائے گا تو پھر انسان گناہ سے بچنے اور نیکیوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔فرماں برداری اور تابعداری چونکہ فرشتوں کی سرشت میں ہے اس لیے ان پر ایمان لانے سے طاعت الٰہی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

عقیدہ آخرت کا اخلاقی پہلو:

''عقیدہ آخرت انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ زندگی اور موت کی تخلیق کا مقصد انسان کے نیک اعمال کی آزمائش ہے *۔مکی دور کی ابتدائی سورتوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابل قدر ہیں، اور کہیں اعمال واخلاق کی ان برائیوں کا ذکر ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے ان دونوں کا ذکر اس لحاظ سے نہیں کیا گیا کہ ان کا اچھا یا برا نتیجہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں نکلنا ہے بلکہ یہ ذکر اس حیثیت سے ہے کہ آخرت کی ابدی اور پائدار زندگی میں ان کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا، قطع نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔''(۹)

غرض انسان کی یہ زندگی اس کے لیے ایک امتحان ہے۔اس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (الدھر۷۶:۳)

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''یہ ہے دنیا میں انسان کی اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصد تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانون فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔نیز یہ

---

(۸) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۶ ص: ۲۷۵، ۲۷۶

*اس کی وضاحت انسانی زندگی میں اخلاق کی ضرورت واہمیت کے ضمن میں ہو چکی ہے۔

(۹) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲ ص:۱۸۳

دنیا اس کے لیے نہ دارالعذاب ہے جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزا ہے جیسا کہ تناسخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں اور نہ رزم گاہ جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیروکار سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اس کے لیے امتحان گاہ ہے۔

وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے، حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں جن حیثیتوں میں بھی وہ یہ کام کر رہا ہے اور جو تعلقات بھی اس کے اور دوسروں کے درمیان ہیں وہ اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔

اس کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدا یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جوابدہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامہ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہوا اور آخرت کی جواب دہی کو پیش نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا (۱۰)

یہ تصور کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں اور کسی ایک شعبہ حیات میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے، یہ اخلاق کے دائرے کو اتنا ہی پھیلا دیتا ہے جتنا کہ امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل، اس کے ذرائع علم، اس کی ذہنی و فکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں سب کی سب امتحان میں شریک ہیں، یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے جن اشیاء پر وہ تصرف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت و نیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی و خود مختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصور اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے جو ایک ایک میدان زندگی سے متعلق ہے۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کامیابی و ناکامی وہ ہے جو وہاں ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لیے حسن و قبح صحت اور غلطی، حق اور باطل، کامیابی اور ناکامی کے قطعی، اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے اس لیے قانون اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی ان نتائج پر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس تصور کو قبول کر لے گا وہ قانون اخلاق کی

---

(۱۰) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱٦ء) ج: ٦ ص: ۱۸٦، ۱۸۷

پیروی پر بہر حال ثابت قدم رہے گا خواہ اس دنیا میں اس کا نتیجہ بظاہر اچھا ہو یا برا، کامیابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیاوی نتائج بالکل ہی ناقابل لحاظ ہوں گے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ ان کا نہیں بلکہ آخرت کے پائدار نتائج کا کرے گا اور اپنے لیے صحیح صرف اس طرز عمل کو سمجھے گا جو ان نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذت، خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں۔ بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنی قطعی وحتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کیسی ہے۔ اس طرح اس کا نظام اخلاق ترقی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصول اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے اور نہ اس کی سیرت ہی تلون پذیر ہوگی۔

پس اخلاق کے نقطہ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصور دو اہم فائدے عطا کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصول اخلاق کو غایت درجے کا استحکام نصیب ہوتا ہے جس میں تزلزل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے جس میں (بشرط ایمان) انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان مواقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرز عمل اختیار کر سکتا ہے لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر لازماً ایک ہی طرز عمل اختیار کرے گا۔ دنیاوی نتائج کا اعتبار کیجیے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے کبھی خیر اور کبھی شر بنتی رہتی ہے اور اس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے۔ لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھیے تو خیر اور شر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخرۃ آدمی کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بد انجام یا شر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔(۱۱)

عقیدہ آخرت ایک مسلمان میں یہ شعور اجاگر کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بے کار پیدا نہیں کیا گیا، یہ دنیا اس کے لیے دارالامتحان ہے، اس کے تمام اعمال لکھے جا رہے ہیں اور وہ ہر وقت خدا کی نظر میں ہے، قیامت کے دن اس کو اپنے رب کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ جوابدہی کا یہی احساس اس کو نیکی کے راستے پر چلاتا ہے اور وہ اپنے رب کے سامنے شرمندہ ہونے اور ناکامی کے خوف سے دنیا میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ایسی قومیں جو آخرت کی منکر تھیں انہوں نے اپنے برے اعمال کی وجہ سے دنیا میں ہی عذاب الٰہی کو دعوت دی، تباہی اور بربادی ان کا مقدر ٹھیرا۔ عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت انسانی کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے اجتناب صرف اسی عقیدے کی بدولت ممکن ہے ورنہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حیوان بن جاتا۔ نیز یہ بھی ناممکن ہے کہ انسان کو اپنی تمام نیکیوں اور گناہوں کی سزا اس دنیا میں مل جائے اس لیے انسانی عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک ایسا دن ہونا چاہیے جس دن انسان کو اس کے تمام اعمال کا بدلہ مل سکے ورنہ انسانی زندگی بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔

عقیدہ آخرت انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار ہے، کیونکہ اس عقیدے کی روح یہ ہے کہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہیں اور محفوظ ہو رہے ہیں، قیامت کے دن ایک ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر برائی بھی اس کے سامنے ہوگی۔ صرف دوسری زندگی کا تصور ہی انسانی زندگی کو نیک نہیں بناتا بلکہ اصل چیز جو انسان کو نیکی کے راستے پر چلائے رکھتی ہے وہ عقیدے اور عمل کے متعلق باز پرس کا احساس ہے۔ جو ایمان اور عمل صالح (اخلاق حسنہ) کی دولت سے مالا مال ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس دولت سے محروم ہوا وہ ناکام ہو جائے گا۔ اس لیے انسان اچھے اعمال اور اخلاق اپنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتے ہوئے آخرت میں کامیاب ہو سکے۔

---

(۱۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۴ء) ص: ۲۱، ۲۲

۲۔عبادات بطور محرک اخلاق

ا۔عبادت کا مفہوم:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

عبادت کا لفظ تین مفاہیم پر مشتمل ہے یعنی پرستش،عبدیت اور اطاعت۔

(۱) پرستش : خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکر گزار رہو،اسی سے دعائیں مانگے اور اسی کے آگے محبت وعقیدت سے سر جھکائے۔

(۲) عبدیت: خدا کے واحد مالک وآقا ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ انسان اس کا بندہ اور غلام بن کر رہے،اس کے مقابلے میں خودمختارانہ رویہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی ذہنی یا عملی غلامی قبول نہ کرے۔

(۳) اطاعت : خدا کے واحد فرماں روا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے۔نہ خود اپنا حکمران بنے اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے۔(۱)

نماز،روزہ،حج اور زکوٰۃ ظاہری عبادات ہیں جبکہ تقوی،اخلاص،توکل،صبر،شکر قلبی عبادات ہیں*۔اس طرح اعلیٰ اخلاقی اقدار تو خود عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔اب ہم ان عبادات کے اخلاقی پہلو کا ایک جائزہ پیش کریں گے:

(۱)نماز بطور محرک اخلاق :

قرآن مجید میں نماز کو محرک اخلاق کے طور پر بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕاِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (العنکبوت۲۹:۴۵)

اور نماز قائم کرو یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے

رذائل اخلاق سے متعلق احکام کی توضیح میں فحشاء کی تعریف گزر چکی ہے۔یہاں ہم منکر کا مفہوم بیان کریں گے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے نزدیک:

’’منکر کے معنی نامعقول اور ناپسندیدہ کے ہیں۔منکر سے وہ امور مراد ہیں جو شریعت کے نزدیک نامعقول اور ناپسندیدہ ہوں اور قوت غضبیہ اور سبعیہ کے اشارہ سے سرزد ہورہے ہوں جیسے کسی کو قتل کردینا یا کسی کا مال غصب کر لینا۔قوت غضبیہ اور سبعیہ ہی انسان کو ایذارسانی پر آمادہ کرتی ہے اور یہ امر تمام عقلاء کے نزدیک ’’منکر‘‘یعنی ناپسندیدہ ہے۔‘‘(۲)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

’’منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ

---

(۱)مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۲،ص:۲۶۳،۲۶۴

* تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی کی کتاب سیرت النبی ﷺ جلد:۵

(۲)مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۴،ص:۳۹۷

برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔''(۳)

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک:

''منکر'' معروف کی ضد ہے۔معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو۔مثلاً مہمانداری، مسافر نوازی اور اس قبیل کی دوسری نیکیاں۔منکر اس کا ضد ہے تو اس سے مراد وہ باتیں ہوں گی جو معروف اور عقل وعرف کے پسندیدہ طریقہ اور آداب کے خلاف ہوں۔(۴)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بخالت، غصب حقوق، تعدی، عہد شکنی، فخر وغرور اور اس قبیل کی ساری چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔(۵)

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"**اقم الصلوة** سے تبلیغ فعلی کا حکم ہے یعنی تشریع قولی کے ساتھ تشریع فعلی بھی کیجیے کہ ان کو دین کے کام کر کے دکھایئے خاص کر نماز کی پابندی رکھئے جو کہ اعظم عبادت ہے تا کہ اور لوگ بھی اس کا اتباع کریں اور اس اتباع کی ترغیب کے لیے اس کی فضیلت بیان کی جاتی ہے کہ نماز اپنی وضع کے اعتبار سے بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے یعنی حال کی زبان سے کہتی ہے کہ جس معبود کی تو اتنی تعظیم کرتا ہے فحشاء اور منکر کی کے ارتکاب سے اس کی بے تعظیمی نہایت نازیبا ہے اور اسی طرح جتنے اعمال خیر ہیں سب پابندی کے قابل ہیں کیونکہ وہ سب زبانی یا عملی طور پر اللہ کی یاد ہیں۔''(۶)

نماز افضل ترین عبادت اور تمام قولی وعملی عبادات کا خلاصہ ہے، جو تسبیح، تحمید، تلاوت قرآن، آداب عبودیت، قیام، رکوع اور سجود پر مشتمل ہے۔نماز کی ابتدا میں بہت زیادہ خشوع اور خضوع کے ساتھ اللہ تعالی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور نماز کے آخر میں دوزانو ہو کر خدا کے سامنے بیٹھنا اور مانگنا ہے۔بیشک نماز جیسی عظیم عبادت اگر اپنی شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کی جائے اور حقیقت میں وہ صحیح نماز ہو تو ایسی نماز بلاشک وشبہ بے حیائی اور ہر قسم کے ناپسندیدہ فعل سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔جو شخص ہمیشہ نماز پڑھے گا تو ایک نہ ایک دن نماز اس کو نافرمانیوں اور برائیوں کو چھوڑنے کی طرف لے جائے گی۔مسلمان جتنا نماز کے قریب ہوتا جائے گا اتنا ہی بے حیائی اور برائی سے دور ہوتا جائے گا کیونکہ نماز مقام مناجات اور محل ادب ہے۔نماز اول سے آخر تک اللہ تعالی کی عظمت، محبت اور عبودیت کیا قرار اور اعتراف پر مشتمل ہے لہذا ایسے اقرار واعتراف کے بعد فحشاء اور منکر کا ارتکاب اپنے سابق اقرار واعتراف کی تکذیب کے مترادف ہے، اس کے علاوہ نماز کی حقیقت اور صورت اول تا آخر ذکر الٰہی ہے۔

اس تفسیری تقریر سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ بہت سے لوگ اس کے باوجود کہ نماز کے پابند ہیں مگر پھر بھی برے کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اس کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں نماز کی خاصیت بیان کی ہے جیسے کہ طبیب بیان کرتے ہیں کہ فلاں دوا سے بخار رک جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ دوا تب موثر ہوگی جب نسخہ کے تما اجزا اصلی ہوں، ایک خاص مقدار اور خاص مدت کی پابندی کے ساتھ نسخہ کا استعمال کیا جائے اور

---

(۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۵۶۶

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۴۳۹

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۶، ص:۱۳۲

(۶) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۲، ص:۱۱۳

خاصیت دوا کے منافی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے۔اسی طرح ہمارے روحانی طبیب (یعنی اللہ تعالیٰ نے) ہماری روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے نماز کا نسخہ تجویز کیا، اس کو کامل اور صحیح اجزا یعنی خشوع وخضوع اور آداب عبودیت کے ساتھ ایک مدت تک استعمال کرو اور جو چیزیں روح کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہیں ان سے پرہیز کرو۔

نماز میں صرف ظاہری طور پر قیام، رکوع اور سجود کر لینا یہ نماز کی حقیقت نہیں بلکہ نماز کی ظاہری صورت ہے اور ظاہر ہے کہ دوا کا نام اور اس کی صرف ظاہری صورت بیماری کو دور نہیں کر سکتی۔نماز کی روح اللہ کا ذکر اور اس کی یاد ہے۔جب تک نماز میں اللہ تعالیٰ کی جلال وعظمت موجود نہ ہو وہ نماز بے جان ہے اس لیے امام رازیؒ قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ 'اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرْ :صلٰوۃ سے مطلق نماز مراد نہیں بلکہ وہ نماز مراد ہے جو شرعاً صحیح ہو اور عنداللہ قابل قبول ہو اور نماز کے لیے کپڑوں کا پاک صاف ہونا شرط ہے اس لیے ضروری ہے کہ نمازی کا باطنی لباس یعنی تقویٰ بھی بالکل پاک ہو اور اس پر فحشاء اور منکر کی نجاست نہ لگی ہو اور جب نماز کے لیے اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو تو یہ سمجھے کی میں بادشاہوں کے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوں، معاذ اللہ میں بھنگی نہیں ہوں جو بیت الخلاء کی نجاستوں کو اپنی بالٹی میں جمع کرتا ہے پس جو شخص نماز کی حقیقت اور اپنے مقام کو سمجھ لے گا تو وہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد فحشاء اور منکر کی جانب جانے سے ایسے نفرت کرے گا جیسے ایک عقلمند بادشاہ دربار سے نکلنے کے بعد بیت الخلاء اور کوڑی کو دیکھنے سے بھی نفرت کرتا ہے۔غرض اس سے وہ نماز مراد ہے جو شرعاً صحیح، آداب عبودیت اور ظاہری وباطنی شرائط کی جامع ہو، بلاشبہ ایسی نماز کا اثر یہ ہے کہ فی الحال یا فی المآل، فوراً یا دیر سے فحشاء اور منکر سے ضرور روک دے گی۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضورؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ فلاں شخص رات میں نماز پڑھتا ہے اور دن میں چوری کرتا ہے اور برے کام کرتا ہے آپؐ نے فرمایا: عنقریب نماز اس کو اس چیز سے روک دے گی جو تو کہہ رہا ہے چنانچہ کچھ روز نہ گزرے تھے کہ اس شخص نے توبہ کی اور اس کا حال درست ہو گیا۔آنحضورؐ نے فرمایا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا*۔(۷)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

مکے کے اس ماحول میں مسلمانوں کو جن شدید مزاحمتوں کا سامنا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انہیں مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی۔اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور نشوونما کے لیے تلاوت قرآن اور اقامت صلوٰۃ کی تدابیر کی نشاندہی کی گئی۔اقامت صلوٰۃ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے تم ان برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جو قبل از اسلام تم میں موجود تھیں اور اب اہل عرب اور عرب سے باہر کا جاہلی معاشرہ اس وقت مبتلا تھا۔

پاکیزہ اخلاق ہونے سے ان لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہوتی ہے جو کئی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور برائیوں کی پرورش کرنے والے اس جاہلی نظام کو قائم رکھنے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہوں۔فحشاء اور منکر کا جن برائیوں پر اطلاق ہوتا ہے انہیں انسانی فطرت اور معاشرے اصولی طور پر برا سمجھتے ہیں۔نزول قرآن کے وقت عرب کے معاشرے میں بھی اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی سمجھا جاتا تھا۔شاید ہی کوئی ایسا ہو جو برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھتا ہو۔اس خراب معاشرے میں لامحالہ ایسی تحریک کا اثر تھا جس سے وابستہ ہو کر افراد معاشرہ اخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنے ہم عصروں پر اخلاقی طور پر برتری حاصل کریں۔یہ ناممکن تھا کہ عرب کے عوام اس برائیوں کو مٹانے اور نیک انسان بنانے والی اس تحریک کا وزن محسوس نہ کرتے۔اس کے مقابلے میں صرف جاہلی تعصب کے کھوکھلے نعروں کی بنیاد پر اخلاقی برائیوں میں مبتلا لوگوں کا ساتھ دیتے اور برائیوں کی صدیوں پرورش کرنے والے جاہلی نظام کے بقا کی جنگ لڑتے۔اس موقع پر قرآن مجید نے مسلمانوں کو مادی وسائل اور قوتیں فراہم کرنے کی بجائے نماز کی تلقین کی تا کہ یہ مٹھی بھر لوگ وہ اخلاقی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور ہتھیاروں کے بغیر دشمن کو شکست دے۔

---

*مولانا ادریس کاندھلویؒ نے یہ حدیث تفسیر قرطبی جلد ۱۳، ص ۳۴۷ کے حوالے سے لکھی ہے۔

(۷) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۶، ص:۱۱۴، ۱۱۵

نماز کی اس خوبی کے دو پہلو ہیں:

(۱) وصف لازم: نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے

(۲) وصف مطلوب

نمازی واقعی فحشاء اور منکر سے رک جائے گا۔ انسان کو برائیوں سے روکنے کے لیے کارگر بریک نماز ہے۔ نماز اسے ہر روز پانچ مرتبہ اللہ تعالی کی بندگی اور اس کے سامنے جواب دہی کا احساس دلاتی ہے۔ نماز کے ذریعے اسے عملی طور پر یہ مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے۔

جب آدمی جسم اور لباس طہارت سے لے کر نماز کے ارکان واذکار تک قانون خداوندی کی شرائط کے مطابق ہر روز پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں اس نماز کے ذریعے سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جارہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جارہا ہے ، اسے فرض شناس انسان بنایا جارہا ہے اور اسے عملی طور پر یہ مشق کرائی جارہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبہ اطاعت کے زیر اثر خفیہ اور اعلانیہ ہر حال میں اس قانون کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فحشاء منکر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی ایسا دوسرا طریق تربیت نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملے میں اس درجہ موثر ہو۔

بدعمل نمازی کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص ہر کھانا کھانے کے بعد قے کر دیتا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غذا سے جسمانی نشو ونما نہیں ہوتی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔ اسی طرح بدعمل نمازی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نماز برائی سے نہیں روکتی بلکہ یہی کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی۔ اس کو متعدد احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔۔۔ امام جعفر صادقؒ کا قول ہے:

> ”جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں، اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشاء اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔“ (۸)

نبی مکرم ﷺ اور مومنوں کو کفار مکہ کے معاملے میں جلدی نہ کرنے ، صبر کے ساتھ ان کی زیادتیاں برداشت کرنے اور نصیحت کا حق ادا کرنے کے لیے نماز کی تاکید کی گئی۔ اس سے مومنوں میں صبر و تحمل ، قناعت اور احتساب کی وہ صفات پیدا ہوں گی جو دعوت اسلام کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ تعالی نے اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرنے کا حکم دیا۔ اس کی حکمت یہ تھی کہ کفار کی عیش و عشرت دیکھ کر تمہارے تنگ دست اور خستہ حال گھر والے ہمت نہ ہاریں ۔نماز ان کے زاویہ نگاہ ، معیار قدر اور توجہات کا مرکز بدل دے گی۔ وہ حلال اور پاکیزہ رزق پر صبر کریں گے۔ ایمان اور تقوی سے حاصل ہونے والی خیر کو فسق وفجور اور دنیا پرستی سے حاصل ہونے والی عیش پر ترجیح دیں گے۔ نماز پڑھنے سے ہمارا نہیں بلکہ تمہارا فائدہ ہے۔ کیونکہ تقوی دنیا اور آخرت میں مستقل کامیابی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالی نے انعام یافتہ پیغمبروں کے ناخلف جانشینوں کے کے بارے میں کہا کہ

انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی۔ (مریم۱۹:۵۹)

اس آیت میں نماز ترک کرنے کے اخلاقی نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پروائی برتنے لگے۔ یہ ہر امت کا زوال وانحطاط کی طرف پہلا قدم ہے۔ نماز وہ خاص طریقہ ہے جو دن رات مومن کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ اسے اپنے رب کی عبادت سے دور نہیں ہونے دیتا۔ یہ تعلق ٹوٹتے ہی انسان اپنے رب سے دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عملی تعلق کے بعد اس کا خیالی تعلق بھی اپنے

---

(۸) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص:۷۰۵-۷۰۷

رب کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔اس لیے اللہ تعالی نے یہاں یہ اصول بیان فرمایا کہ سابقہ امتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا۔نفسانی خواہشات کی پیروی سے تعلق باللہ میں کمی آتی ہے۔نماز ضائع کرنے سے غفلت میں اضافہ ہوگا اور غفلت کے اضافے سے خواہشات کی بندگی میں اضافہ ہو گا۔یہاں تک کہ اخلاق و معاملات کے ہر گوشے میں احکام الٰہی کی بجائے اپنے نفس کی پیروی کی جائے گی۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک

> ''ان لوگوں کے ناخلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے ساتھ نسبت اور ان کی وراثت کسی کو خاندان اور نسب کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان کی لائی ہوئی ہدایت کے حامل ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے نماز برباد کر دی اور شہوات کے غلام بن گئے۔ظاہر ہے کہ نماز ضائع کرنے کے بعد وہ دین کا اصل سر رشتہ ہی کھو بیٹھے۔نماز ہی وہ چیز ہے جو اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو بندے کو وہ عہد یاد دلاتی رہتی ہے جو اس نے اپنے رب سے باندھا ہے۔اگر یہ چیز ضائع کر دی جائے تو آدمی کا شیطان کے ہتھے چڑھ جانا یقینی ہے۔یہود و نصاری نے دین کے اس بنیادی حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کی تفصیل سورہ بقرہ،آل عمران اور انعام وغیرہ میں گزر چکی ہے۔''(۹)

سید ابوالاعلی مودودی **حٰفظوا علی الصلوات** کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ''قوانین تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالی اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خوف خدا،نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکام الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رو میں بہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہ نکلے۔''(۱۰)

قوم شعیب نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے۔(ھود۱۱:۸۷)

اس طعن آمیز فقرے کی روح اپنے رب سے غافل،لادین اور فاسق و فاجر معاشرے میں آج بھی موجود ہے۔نماز ایمان داری کا نمایاں مظہر ہے۔فاسق و فاجر معاشرہ ایمان داری کو ایک خطرناک مرض سمجھتا ہے۔نماز ایسے معاشروں میں مرض کی علامت سمجھی جاتی ہے۔کسی نمازی کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر دین داری کا حملہ ہو گیا ہے۔ان لوگوں کو دین داری کی یہ خاصیت معلوم ہوتی ہے کہ نمازی دوسروں کو بھی درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ بے ایمانی اور بداخلاقی پر تنقید کرتا ہے۔اصل خطرہ ان کو نمازی کے وعظ و اصلاح سے ہوتا ہے۔اس لیے وہ نماز کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔برائیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم زیادہ نیک بنو۔نیک بنانے کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔نماز سے برائی کے سیلاب کا مقابلہ ممکن ہے اور اس برائی کو دور کر کے عملی طور پر اچھائی کا نظام قائم کیا جا سکے گا۔

(۲) زکوۃ بطور محرک اخلاق:

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے اخلاقی پہلو کے متعلق ارشاد ہے:

---

(۹) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴،ص:۶۶۸

(۱۰) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۱۸۲

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيۡهِمۡ (التوبہ ۹:۱۰۳)

اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کرانہیں پاک کرواور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤاور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو۔

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محدثین کے نزدیک یہ آیت ابولبابہؓ اوران کے چھ ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ابولبابہؓ بیعت عقبہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور کئی غزوات کے اندر شریک ہوئے۔لیکن غزوہ تبوک میں انہوں نے بغیر کسی شرعی عذر اور نفس کی کمزوری کے شرکت نہ کی۔جب نبیؐ غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے اوران لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والے کے متعلق اللہ اور رسول کی کیارائے ہے توانہیں سخت ندامت ہوئی۔انہوں نے پوچھ گچھ سے پہلے اپنے آپ کوایک ستون کے ساتھ باندھ لیا کہ جب تک ہمیں معافی نہیں ملتی ہم پر کھانا اور سونا حرام ہے یا ہم مرجائیں۔چنانچہ کئی دن وہ اسی طرح بندھے رہے یہاں تک کہ بے ہوش ہوکر گر گئے۔آخر کار جب انہیں بتایا گیا کہ اللہ اوراس کے رسول نے انہیں معاف کر دیا ہے توانہوں نے کہا کہ ہماری توبہ میں یہ شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے ہمیں فرض سے غافل کر دیا ہے اسے اوراپنے تمام مال کواللہ کی راہ میں صدقہ کر دیں۔(رسول اکرمؐ نے مال لینے سے انکارکر دیااس پر یہ آیت نازل ہوئی) مگرآپؐ نے سارے مال لینے کی بجائے ایک تہائی کافی سمجھا۔چنانچہ انہوں نے وہ مال اسی وقت وقف کر دیا۔اس واقعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے؟اس سے ثابت ہوا کہ خدا کے ہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے۔نیز یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا سابقہ کارنامہ زندگی ان کے ایمانی اخلاص پر دلیل تھا۔انہوں نے کوئی عذر کرنے کی بجائے اپنے قصور کا اعتراف کر کے اپنے طرزعمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اپنے گناہ پر شرمندہ اوراس کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔''(۱۱)

مفتی محمد شفیعؒ آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ ایک خاص جماعت کے لیے نازل ہوئی مگراس کا حکم قیامت تک عام ہے،ان مسلمانوں کے لیے جن کے نیک اور برے اعمال ملے جلے ہوں وہ اگراپنے گناہوں سے تائب ہوجائیں توان کے لیے معافی اور مغفرت کی امید ہے۔اس پر اجماع امت ہے کہ یہ حکم نہ آپؐ کے ساتھ مخصوص اور نہ آپؐ کے زمانے تک محدود ہے بلکہ آپؐ کا ہر قائم مقام اس کا مخاطب ہو گا اوراس کے فرائض میں مسلمانوں سے زکوۃ وصول کرنا اوراسے خرچ کرنا شامل ہوگا۔جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کیا۔

زکوۃ نظام حکومت کو چلانے والا حکومتی ٹیکس نہیں بلکہ اس کا مقصد خود اصحاب مال کو گناہوں سے پاک کرنا ہے۔زکوۃ وصدقات کے دو فائدے ہیں۔ایک فائدہ خود صاحب مال کا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ گناہوں سے اور مال کی حرص ومحبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قوم کے اس ضعیف عنصر کی پرورش ہوتی ہے جوخود اپنی ضروریات مہیا کرنے سے مجبور یا قاصر ہے جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، اپاہج ومعذور مرد عورتیں اور

---

(۱۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج۲، ص ۲۳۰

عام فقراء ومساکین وغیرہ۔لیکن قرآن حکیم نے اس جگہ پہلے فائدے کے بیان کو کافی سمجھا اور اشارہ کر دیا کہ زکوۃ کا اصل مقصد پہلا فائدہ ہے۔دوسرا فائدہ اس سے ضمنی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔اس لیے اگر کسی جگہ یا کسی وقت کوئی فقیر مسکین وغیرہ موجود نہ ہوں تو بھی مال والوں کو زکوۃ دینی پڑے گی۔اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سابقہ امتوں میں یہ دستور تھا کہ راہ خدا میں دیے جانے والے مال کو ایک میدان میں رکھ دیا جاتا۔اس کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی کہ آسمانی بجلی اسے جلا کر راکھ کر دیتی اور غیر مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ آگ نہ جلاتی اور اسے منحوس مال سمجھ کے کوئی ہاتھ نہ لگاتا۔

اس سے واضح ہوا کہ زکوۃ وصدقات کی اصل مشروعیت کسی کی ضرورت پوری کرنا نہیں بلکہ وہ ایک مالی حق اور عبادت ہے اور فقراء کو دینا اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ قبول کر لی گئی تو گناہ کی معافی اور تطہیر توبہ کے ذریعے ہوگئی پھر مال لینے کو ذریعہ تطہیر قرار دینے کے کیا معنی ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ توبہ سے گناہ معاف ہو گیا مگر گناہ معاف ہو جانے کے بعد اس کی کچھ ظلمت وکدورت باقی رہ سکتی ہے جو آئندہ گناہ کے ارتکاب کا سبب بن سکتی ہے،صدقہ کرنے سے وہ کدورت دور ہو کر تطہیر کامل ہو جائے گی۔(۱۲)

سید ابوالاعلی مودودی ایک مفید نکتے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور دل کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے اور عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا،دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا،اپنے گرنے کو خود محسوس کر لے۔پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔پھر اس کا صدقہ وخیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔''(۱۳)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں

یہاں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔قرآن میں ان دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ تطہیر میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور تزکیہ میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشوونما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

اس ٹکڑے سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ نفاق کی بیماری کا سب سے زیادہ موثر علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے۔یہ بیماری اصلا محبت دنیا سے پیدا ہوتی ہے جو ان تمام رذائل کے پیدا ہونے کا سبب ہے جن کے مجموعے کا نام نفاق ہے۔انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹتی ہے اور جب اس کی جڑ کٹ جاتی ہے تو ایک طرف رذائل مضمحل ہو جاتے ہیں دوسری طرف مکارم وفضائل پروان چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

---

(۱۲) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۴، ص:۴۵۵-۴۵۸

(۱۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۲۳۱

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں وہ اللہ اور رسول پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اصل احسان اللہ اور اس کے رسول کا ہے کہ ان کے انفاق کو قبول فرماتے ہیں۔اس لیے کہ اس سے جو تطہیر وتزکیہ حاصل ہوتا ہے اس کے محتاج اللہ اور رسول نہیں ہیں بلکہ وہی لوگ ہیں جن کو انفاق کی دعوت دی جاتی ہے۔**صل علیھم** میں عام دعا واستغفار کے ساتھ ساتھ نماز جنازہ بھی شامل ہے۔''(۱۴)

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لیے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔''(۱۵)

اسلامی نظام میں اخلاق کی بنیادوں اور محسنین کی تعریف میں جن صفات کا ذکر ہے اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْ تُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (لقمٰن ۳۱:۴)

جو نماز قائم کرتے ہیں، زکٰوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

کتاب اللہ جن نیکیوں کا حکم دیتی ہے محسنین وہ تمام نیکیاں کرتے ہیں اور جن برائیوں سے منع کرتی ہے اس سے وہ باز رہتے ہیں۔اس سے یہ مراد نہیں کہ محسنین میں صرف یہ تین صفات موجود ہوتی ہیں۔بلکہ ان کے تذکرہ سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ تمام نیکیوں کی بنیاد یہ تین نیکیاں ہی ہیں۔نماز قائم کرنے سے خدا پرستی اور خدا ترسی ان کی مستقل عادت بن جاتی ہے۔وہ زکٰوۃ دینے سے ایثار وقربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے، دنیا کی محبت ختم ہوتی جبکہ رضائے الٰہی کی طلب ابھرتی ہے۔وہ آخرت پر یقین رکھنے سے ان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ابھرتا ہے۔وہ اپنے آپ کو شتر بے مہار نہیں بلکہ اپنے رب کا بندہ سمجھتا ہے، جس کے سامنے حاضر ہو کر اسے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ان تین نیکیوں کی وجہ سے وہ نیک بنتے ہیں نیکی ان سے اتفاقاً سرزد نہیں ہوتی۔ان سے بدی اتفاقاً سرزد ہوتی ہے۔نیکی ان کی ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے کامیاب مومنوں کی صفت بیان کی ہے:

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (المومنون ۲۳:۴)

اور جو (اعمال واخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں

مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''زکٰوۃ کے لغوی معنی پاک کرنے کے ہیں۔اصطلاح میں شرح مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکٰوۃ کہا جاتا ہے اور عموماً قرآن مجید میں یہ لفظ اسی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔اس آیت میں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

---

(۱۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳، ص:۶۳۸، ۶۳۹

(۱۵) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۵، ص:۱۳۲

اس پر یہ شبہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ ہجرت مدینہ کے بعد فرض ہوئی۔ ابن کثیرؒ وغیرہ مفسرین نے اس کو جواب یہ دیا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ سورہ مزمل جو بالاتفاق مکی ہے میں اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ اتو الزکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ مگر سرکاری طور پر اس کے وصول کرنے کا عام انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ طیبہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔

جن حضرات نے ہجرت مدینہ کے بعد زکوٰۃ کی فرضیت بتائی ہے انہوں نے اس جگہ زکوٰۃ کا مضمون عام لغوی معنی میں اپنے نفس کو پاک کرنا قرار دیا ہے۔ عام طور پر قرآن مجید میں جہاں فرض زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے اس کو **ایتاء الزکٰوۃ، یوتون الزکٰوۃ** اور **اتوا الزکٰوۃ** کے عنوان سے بیان کیا گیا۔ یہاں عنوان بدل کر **للزکٰوۃ فاعلون** فرمانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے وہ اصطلاحی معنی مراد نہیں۔ اس کے علاوہ فاعلون کا بے تکلف تعلق فعل سے ہوتا ہے اور زکوٰۃ اصطلاحی فعل نہیں بلکہ ایک حصہ مال ہے۔ اس حصہ مال کے لیے فاعلون کہنا بغیر تاویل کے نہیں ہو سکتا۔ اگر آیت میں زکوٰۃ کے معنی اصطلاحی زکوٰۃ کے لیے جائیں تو اس کا فرض ہونا اور مومن کے لیے لازم ہونا کھلا ہوا معاملہ ہے اور اگر مراد زکوٰۃ سے تزکیہ نفس ہے یعنی اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا تو وہ بھی فرض ہی ہے کیونکہ شرک، ریا، تکبر، حسد، بغض، حرص، بخل جن سے نفس کو پاک کرنا تزکیہ کہلاتا ہے۔ یہ سب چیزیں حرام اور گناہ کبیرہ ہیں۔ نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔ (۱۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کا ترجمہ کرتے ہیں ''زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں''۔ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اگر **للزکٰوۃ فٰعلون** کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیے کا فعل کرتے ہیں، اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی، بلکہ تزکیہ نفس، تزکیہ اخلاق، تزکیہ زندگی، تزکیہ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی۔ اور مزید برآں، اس کا مطلب صرف اپنی ہی زندگی کے تزکیے تک محدود نہ رہے گا بلکہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کے تزکیے تک بھی پھیل جائے گا۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ''وہ تزکیے کا کام کرنے والے لوگ ہیں''، یعنی اپنے آپ کو بھی پاک کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی پاک کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، اپنے اندر بھی جوہر انسانیت کو نشو و نما دیتے ہیں اور باہر کی زندگی میں بھی اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔'' (۱۷)

یہ مضمون قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورہ اعلیٰ میں فرمایا

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی (الاعلی ۸۷:۱۴) اس شخص نے فلاح پائی جس نے پاکیزگی اختیار کی۔

قَدۡاَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَا (الشمس ۹۱:۹) جس نے نفس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا۔

لیکن آیت مذکورہ بالا ان دونوں کی نسبت اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں تزکیہ کے فعل کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ تزکیہ کا یہ عمل انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر حاوی ہے۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

وَوَیۡلٌ لِّلۡمُشۡرِکِیۡنَo الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ هُمۡ کٰفِرُوۡنَ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱:۶، ۷)

تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ اور ان کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ اور مجاہد کہتے ہیں:

---

(۱۶) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۶، ص:۲۹۶، ۲۹۷

(۱۷) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۳، ص:۲۶۳

''اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگی نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔'' (۱۸)

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''اس مقام پر مشرکین کی صفت کو اس لحاظ سے بیان کیا گیا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی تو ایمان کے بعد ہوسکتی تھی تو جب ایمان ہی سے محروم رہے تو زکوٰۃ کی کیا نوبت آسکتی ہے یا زکوٰۃ لغوی معنی طہارت کے لحاظ سے استعمال کیا گیا کہ تقوی وطہارت کا کام انجام نہیں دیتے۔خواہ وہ طہارت و پاکیزگی کا شعبہ انفاق مال سے متعلق ہو یا اخلاق ومعاملات ومعاشرت سے ہو۔مراد یہ کہ ایسی کوئی بھی چیز انجام نہیں دیتے۔'' (۱۹)

سید ابوالاعلی مودودی خفیہ صدقات سے اخلاقی گندگیوں کو دور کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

''چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے،اس کے اوصاف حمیدہ خوب نشو ونما پاتے ہیں،اس کی بری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں اور یہی چیز اس کو اللہ کے ہاں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامہ اعمال میں ہوتے بھی ہیں انہیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالی معاف فرما دیتا ہے۔'' (۲۰)

غرض زکوٰۃ صرف مال کو ہی نہیں بلکہ انسانی اخلاق کو بھی پاک کرتی ہے۔زکوٰۃ کی وجہ سے معاشرتی جرائم کم ہو جاتے ہیں۔بھوک کی وجہ سے مجبور لوگ چوری کرنے کی بجائے باعزت کاروبار شروع کر لیتے ہیں۔طبقاتی کشمکش تمام معاشرتی برائیوں کی بنیاد ہے۔زکوۃ کی وجہ سے غریب کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے اور معاشی توازن پیدا ہوتا ہے۔طبقاتی کشمکش میں کمی ہونے کی وجہ سے معاشرتی برائیاں بھی کم ہوتی ہیں۔زکوٰۃ کی وجہ سے اعلی اخلاقی اقدار مثلاً ایثار،اخوت اور مساوات کو فروغ ملتا ہے۔

(۳) روزہ بطور محرک اخلاق:

اسلام کی تمام تر تعلیمات حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہیں۔اسلامی فرائض کی عمارت بھی روحانی،اخلاقی،اجتماعی اور مادی فوائد کے چار ستونوں پر قائم ہے۔ان مصالح اور فوائد کے اصول اور جواہر کو قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔چنانچہ روزہ کے اغراض ومقاصد کو قرآن حکیم نے تین جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ان تین جملوں سے یہ ثابت ہے کہ روزہ مسلمانوں میں اخلاقیات کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

(۱) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۳) ترجمہ: تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقوی پیدا ہو)

(۲) لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ (البقرہ ۲:۱۸۵) ترجمہ: تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کر۔

(۳) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۵) ترجمہ: تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

اب ہم ان تینوں جملوں کی تفسیر درج کرتے ہیں:

(۱) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۳) :

---

(۱۸) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۴،ص:۴۴۲

(۱۹) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۷،ص:۱۸۹

(۲۰) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱،ص:۲۰۹

روزے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کثرت اور عادت انسان کو متقی بنا دیتی ہے۔ روزہ بلکہ تمام عبادات کا اصل مقصد تقوی ہے۔ تقوی ضبط نفس سے پیدا ہوتا ہے۔ ضبط نفس سے مراد ہے اپنے نفس کی خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کی قوت وصلاحیت۔ ضبط نفس کی بہترین تربیت روزے سے ممکن ہے۔

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

''تقوی نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقوی یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہو اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلت عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیت الہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔''(۲۱)

سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب سیرۃ النبی ﷺ میں تقوی سے متعلق کئی نکات لکھ کر اس کی وضاحت کی ہے۔ میں نے وہاں سے کچھ نکات جو اخلاقیات سے متعلق ہیں مختصراً ذکر کیے ہیں۔

''روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقوی تقوی اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔ تقوی دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجھک محسوس ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔ انسان کے دل میں گناہوں کے اکثر جذبات حیوانی قوت کے زیادہ ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان میں ان جذبات کی شدت کو کم کرتا ہے۔ آپ ؐ نے ایسے نوجوانوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کی جو اپنی مالی مجبوریوں کی وجہ سے نکاح نہیں کر سکتے تھے اور اپنے نفس پر بھی قابو نہیں پا سکتے تھے۔ آپ ؐ نے شہوت توڑنے اور کم کرنے کے لیے روزہ کو ایک بہترین چیز قرار دیا۔

روزہ انسان کو بہت سے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ روزہ کئی گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ تورات میں اسے خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔

روزہ ہمارے غور وفکر، اعمال کے محاسبے، اپنے اعمال کے انجام پر نظر، اپنے گناہوں پر ندامت، اور احساس جوابدہی کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق وشوق کو ابھارتا ہے یہی سبب ہے کہ رمضان کا مہینہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں تراویح ہے، اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اس میں آخری عشرے کا اعتکاف ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے۔ اسلامی احکام سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ وخیرات، غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرانے کا قائم مقام ہے۔

روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالی نے روزہ کی متوقع غرض وغایت تقوی قرار دی ہے۔ اگر روزہ سے روزہ کی غرض وغایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن روح کا روزہ نہیں ہوا۔ جیسا کہ ارشادات نبوی ؐ میں تصریح ہے کہ روزہ کے ساتھ جھوٹ اور فریب کے کام کو ترک نہ کیا جائے تو خدا کو اس کی ضرورت

---

(۲۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۵) ص: ۱۷۳

نہیں ہے کہ انسان کھانا پینا چھوڑ دے۔اسی طرح آپؐ نے روزہ کو برائیوں سے روکنے کے لیے ایک ڈھال قرار دیا تو روزہ داروں کو چاہیے کہ بے ہودہ اور برائی کی باتیں نہ کرے اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی گالی دے یا لڑائی کرے تو اسے کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔ پھر یہ وضاحت فرمائی کہ روزاس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کردو صحابہ نے سوال کیا کہ سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے؟ فرمایا جھوٹ اور غیبت سے ۔بعض علماء کی رائے یہ بھی ہے کہ جس طرح کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

تمام عبادات میں روزہ کو تقوی کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی اور خاموش عبادت ہے جو ریا اور نمائش سے بری ہے ،جب تک انسان خود اس کا اظہار نہ کرے دوسروں کو معلوم نہیں ہوسکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

روزہ میں مشقت اٹھانا صبر کی ایک قسم ہے اس لیے روزہ دار بھی صابرین کی جماعت میں داخل ہوکر بے شمار اجر کے مستحق ہوں گے۔صبر تحمل اور برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان صورت روزہ ہے۔قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں اس لیے اس کی مشق اور مہارت کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے۔(۲۲)

(۲)لِتُكَبِّرُوااللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ (البقرہ ۲:۱۸۵):

تکبر صرف اللہ کو زیب دیتا ہے اسی لیے اس کا نام **المتکبر** ہے۔مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

> ''تم اللہ کی کبریائی اور بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ایسے طریقہ کی ہدایت کی کہ جس سے تم رمضان المبارک کی فوت شدہ خیرات وبرکات کی قضاء سے کچھ تلافی کرسکو۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں **لِتُكَبِّرُوااللّٰهَ** سے ختم رمضان کے بعد عید کا چاند دیکھ کر اور عید میں جاتے وقت اور عید کی نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے۔جس طرح نماز اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی مسنون ہے اسی طرح رمضان کے روزوں سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر (اللہ اکبر) وتحمید (الحمد للہ) مسنون ہے۔''(۲۳)

مولانا امین احسن اصلاحی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> **لتکبروا اللہ** ۔۔میں ''تکبیر سے مراد خدا کی عظمت وجلالت اور اس کی بزرگی وکبریائی کے احساس واعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزدار پر روزے کی حالت میں عملا طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے محض اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہوجاتا ہے۔اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے''ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اللہ تعالی کا ارشاد ہے روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دوں گا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور کھانے پینے کو چھوڑتا ہے۔''(۲۴)

کبریائی اللہ تعالی کی شان ہے اور انسان کو اپنے رب کے سامنے اپنے آپ کو حقیر اور کم تر ثابت کرنا ہے۔کسی کو اپنے سے کم تر سمجھنا ہے اور اللہ کو سب سے برتر سمجھنا ہے۔اس معاملے میں روزہ ہمیں اس کی کبریائی کا احساس دلاتا ہے۔اپنے رب کے حکم سے ہم حلال کھانے سے بھی رک جاتے ہیں ۔تقوی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ تنہائی میں بھی کچھ نہیں کھاتے۔

---

(۲۲) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء) ج:۵،ص:۱۷۱-۱۷۶

(۲۳) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۱،ص:۳۶۳

(۲۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۱،ص:۴۵۲

(۳) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۵)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اللہ نے صرف رمضان رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ رمضان میں کسی شرعی عذر کی بنا پر روزے نہ رکھ سکیں، ان کے لیے دوسرے دنوں میں اس کی قضا کر لینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے، تا کہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی نہیں قرار دی گیا ہے بلکہ انہیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمت ہدایت پر اللہ کا شکریہ بھی ٹھیرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس کیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے لہذا نزول قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت اور صرف اخلاقی تربیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اس نعمت قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکر گزاری ہے۔ (۲۵)

رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار ہے۔ جس میں ہر نیک کام کا اجر بڑھ جاتا ہے۔ اس مہینے نفلوں کا ثواب فرضوں کے برابر اور فرضوں کا ثواب ستر گنا تک بڑھ جاتا ہے۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ اس بات کا شکر ادا کرنا ہے کہ اس مہینے کے روزوں اور عبادات کی وجہ سے جنت کے اعلیٰ درجات ملیں گے۔ مریض اور مسافر کے لیے روزہ قضا کرنے کی رخصت بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے میں بھی انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ شرعی عذر کی بنیاد پر اس کی رخصت سے فائدہ اٹھانا بھی ایک نعمت ہے۔ ہم روزہ رکھ کر اس کی رحمت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اجر بڑھانے پر اس کے شکر گزار ہیں۔

نوٹ: حج بطور محرک اخلاق کی بحث ''فحش گوئی'' کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔

---

(۲۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۱۴۳

۳۔ مکافاتِ عملی کا تصور

مکافاتِ عمل سے مراد ہے انسانی اعمال کا بدلہ، یعنی انسان کا کوئی عمل ضائع نہیں جاتا بلکہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہے۔ بعض اوقات اس کے بعض اعمال کا بدلہ اسے دنیا میں عطا کر دیا جاتا ہے لیکن اس کے سارے اعمال کا اصل بدلہ اور عوض اسے قیامت کے دن عطا کیا جائے گا۔ مکافاتِ عمل کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَااكْتَسَبَتْ (البقرہ ۲:۲۸۶)

اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا

مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے (جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا اور نہ ان پر عذاب رکھا)۔ عمل فعل اختیاری کو کہتے ہیں اس میں افعالِ قلبیہ اختیاریہ بھی داخل ہو گئے۔ یہاں ثواب وعذاب کا مدار کسب واکتساب پر رکھا۔''(۱)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک:

''ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔ یہ اللہ کا قانونِ مجازات کا دوسرا قاعدہ کلیہ ہے۔ ہر آدمی انعام اسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دوسرا انعام پائے اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کے اثرات چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامے میں لکھے جائیں۔ اور ایک دوسرے شخص نے کسی برائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالم اول کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا برا، جو کچھ بھی پھل ہوگا، اس کی سعی اور اس کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہر حال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس برائی میں آدمی کی نیت اور سعی وعمل کا کوئی حصہ نہ ہو، اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔ مکافاتِ عمل کوئی قابل انتقال چیز نہیں ہے۔''(۲)

غرض انسان کی کامیابی اور ناکامی اس کے اپنے عمل کی وجہ سے ملے گی۔ انسان کو فائدہ یا نقصان پہنچانے والی چیز خود اس کا عمل ہے۔ وہ جو بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کرے گا وہی بھرے گا۔ کسی دوسرے کے نیک اعمال اس کے کھاتے میں نہیں پڑنے۔ اس دن ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی۔ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا۔ وہاں نہ رشوت چلتی ہے اور نہ سفارش کام آتی ہے۔ ہر کسی کا اعمال نامہ اس کے سامنے ہوگا۔ ایک ذرہ سے ذرہ نیکی بھی اس کے سامنے ہوگی۔ اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی برائی بھی اس کے سامنے ہوگی۔ اس دن اگر کوئی چیز اسے عذابِ الٰہی سے بچا سکتی ہے یا کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے تو وہ اس کا ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس دن ایمان اور عمل صالح کی قیمت کا پتہ چلے گا۔

---

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۴ھ) ج:۱، ص:۲۰۰

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۲۲۴

انسانی عقل اور فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے اچھے اعمال کا اچھا صلہ اور برے اعمال پر سزا ملنی چاہیے۔اسی لیے دنیا میں عدالتی نظام کو قائم کیا گیا ہے۔عدالتوں میں انسانی مقدمات کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور جرائم کی بنیاد پر ملکی قوانین کے مطابق سزائیں دی جاتی ہیں۔اس دنیا میں تمام نیک اعمال کا اجر ملنا اور تمام برے اعمال کی سزا ملنا ناممکن ہے۔اس لیے عقل انسانی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک ایسا دن ہو جب انسان کے تمام اعمال کا فیصلہ کیا جا سکے۔اللہ تعالی نے وہ دن قیامت کے نام سے رکھا ہے جب ہر انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملنے والی ہے۔

مکافات عمل کے متعلق ارشاد الہی ہے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر ۷۴:۳۸)

ہر ایک انسان اپنے کیے ہوئے کاموں میں گرفتار ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قانون الہی یہ ہے کہ جس طرح معلول اپنی علت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا۔جزا و سزا کے دن اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی اس کو ہلاک کرے گا۔اگر کوئی حسب نسب اور شرک و شفاعت کے بل پر اس دن کی آفتوں سے چھوٹنے کے زعم میں مبتلا ہے تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔''(۳)

دوسری جگہ ارشاد الہی ہے:

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور ۵۲:۲۱)

ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہاں رہن کا استعارہ بہت معنی خیز چیز ہے۔ایک شخص اگر کسی سے کچھ قرض لے اور قرض دینے والا اپنے حق کی ادائیگی کے لیے ضمانت کے طور پر اس کی کوئی چیز اپنے پاس رہن رکھ لے،تو جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے اس وقت تک فک رہن نہیں ہو سکتا،اور اگر مدت مقررہ گزر جانے پر بھی وہ فک رہن نہ کرائے تو شئے مرہونہ ضبط ہو جاتی ہے۔انسان اور خدا کے درمیان معاملے کی نوعیت کو یہاں اسی صورت معاملہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔خدا نے انسان کو جو سروسامان،جو طاقتیں اور صلاحیتیں اور جو اختیارات دنیا میں عطا کیے ہیں وہ گویا ایک قرض ہے جو مالک نے اپنے بندے کو دیا ہے اور اس قرض کی ضمانت کے طور پر بندے کا نفس خدا کے پاس رہن ہے۔بندہ اس سروسامان اور قوتوں اور اختیارات کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اگر وہ نیکیاں کمائے جن سے یہ قرض ادا ہو سکتا ہو تو وہ شئے مرہونہ یعنی اپنے نفس کو چھڑا لے گا،ورنہ اسے ضبط کر لیا جائے گا۔''(۴)

انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی رکھا ہوا ہے۔اگر وہ اچھے عمل کرے گا تو اپنے نفس کو جنت میں لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔
بعض مرتبہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔مثلاً تباہ شدہ اقوام ہمارے لیے عبرت اور نصیحت کا پہلو رکھتی ہیں کہ وہ اپنی بد

---

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۹،ص:۶۲

(۴) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۵،ص:۱۶۹

اعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہوئیں اوران کے اعمال کا بدلہ انہیں اسی دنیا میں ہی مل گیا۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ(الفجر ۸۹:۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودی سابقہ اقوام کی اس دنیا میں تباہی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اوران کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اس خدا کی خدائی میں صرف ایک ہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانون فطرت سمجھتے ہو بلکہ ایک قانون اخلاق بھی کارفرما ہے، جس کا تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاوسزا ہے۔اس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں، جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنت کائنات کا مزاج کیا ہے؟ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بےفکر اور خدا کی جزاوسزا سے بےخوف ہوکر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار فاسد ومفسد بن کر رہیں اور جو قوم بھی اس راستے پر چلی اس پر کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔

انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے: ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوا ہے، اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے، جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوا ہے جو ہر حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، ان سے پہلے بہت سے لوگ اس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور ان پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت ان سب کی باز پرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔''(۵)

اللہ تعالیٰ نیک اعمال کا بدلہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحسَانِ اِلَّاالۡاِحۡسَانُ (الرحمٰن۵۵:۶۰)

نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے

کیا انتہائی اطاعت کا بدلہ سوائے اعلیٰ عنایت کے کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ اس کو سوالیہ انداز میں فرمانا اس کی وجوب کی طرف اشارہ ہے۔احسان کا بدلہ احسان ہی ہونا چاہیے۔جو احسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بہترین بدلہ عطا کیا جاتا ہے۔احسان نیکی اور نیک صلہ دونوں کے لیے آتا ہے۔اس آیت کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں یہ دونوں معنوں میں بیک وقت استعمال ہوا ہے۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر دنیا میں عمر بھر اپنے نفس پر پابندیاں لگائے رہے ہوں، حرام سے بچتے اور حلال پر اکتفا کرتے رہے ہوں، فرض کو فرض جان کر اپنے فرائض بجالاتے رہے ہوں، حق کو حق مان کر تمام حق داروں کے حقوق ادا کرتے رہے ہوں اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کر کے خیر کی حمایت کرتے رہے ہوں، اللہ ان کی یہ ساری قربانیاں ضائع کر دے اور انہیں کبھی ان کا اجر نہ دے؟''(۶)

---

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۶،ص:۳۲۸

(۶) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۵،ص:۲۶۹

مولانا امین احسن اصلاحی ''جزا وسزا کے حق میں عقل وفطرت کی گواہی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''مقربین کی جنت کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ آخر میں مخاطبوں کو متوجہ کر کے نہایت بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اس بات پر تمہیں تعجب کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ ساری نعمتیں دینے والا ہے! آخر نیکی اور پاکبازی کا بدلہ کیا ہونا چاہیے، افضل واکرم ہونا چاہیے یا کچھ اور؟ اگر اس کائنات کا خالق ایک ایسا دن نہ لائے جس میں بروں کو ان کی برائیوں کی سزا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ وہ بدی کو زیادہ پسند کرتا ہے کہ اس نے شریروں کو سارے وسائل دے کر اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اس میں جو اودھم چاہیں مچائیں۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت اپنے رب کے متعلق اس قسم کی مکروہ بد گمانی کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس کی فطرت کی شہادت یہی ہے کہ کائنات کا خالق نہایت ہی عادل اور رحیم ہے۔ وہ ان لوگوں کو سزا دے گا جو برائیوں کے مرتکب ہوں گے اور نیکوں کو ان کی نیکی کا بھرپور صلہ دے گا۔ یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے۔ کوئی عاقل، سلامتی عقل وہوش کے ساتھ، اس کا انکار نہیں کر سکتا اس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جو ایک واضح حقیقت کے بیان کا ہے۔''(۷)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر میں بائبل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بائبل کی کتاب احبار (باب ۲۲) اور استثناء (باب ۲۸) میں حضرت موسٰی علیہ السلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اگر تم احکام الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے، اور اگر کتاب اللہ کو پس پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہجوم کریں گی۔''(۸)۔

مکافات عمل ہی کے سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۱۶:۹۷)

مرد یا عورت میں سے جو نیک عمل کرے گا اور وہ مومن ہو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کچھ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ نیکی کی روش اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت چاہے بن جاتی ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اس صحیح رویے سے محض آخرت ہی نہیں بنتی دنیا

---

(۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۸، ص:۱۴۷، ۱۴۸

(۸) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۴۸۷

بھی بنتی ہے۔ جولوگ حقیقت میں ایمان دار اور پاکباز اور معاملے میں کھرے ہوتے ہیں ان کی دنیوی زندگی بھی بے ایمان اور بدعمل لوگوں کے مقابلے میں صریحا بہتر رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچی عزت اپنی بے داغ سیرت کی وجہ سے انہیں نصیب ہوتی ہے وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں انہیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ان لوگوں کو میسر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بوریا نشین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں میں رہنے والے فساق و فجار نہیں پا سکتے۔ آخرت میں ان کا مرتبہ ان کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ بالفاظ دیگر جس شخص نے دنیا میں چھوٹی اور بڑی، ہر طرح کی نیکیاں کی ہوں گی ،اسے وہ اونچا مرتبہ دیا جائے جس کا وہ اپنی بڑی سے بڑی نیکی کے لحاظ سے مستحق ہوگا۔'' (۹)

اللہ تعالی نے بعض نیک اعمال کا اجر اور برے اعمال کی سزا بھی قرآن میں بیان کر دی ہے۔ مثلا شرک اور کفر کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ (ابراھیم ۱۴:۷)

اور جب تمہارے رب نے آگاہ کیا، البتہ اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا، البتہ اگر تم نے ناشکری کی تو بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"تَـاَذَّنَ کے معنی باخبر اور آگاہ کرنے کے ہیں۔ تمہارے رب نے تمہیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم میرے احکام وارشادات کی پیروی کر کے میرے شکر گزار (نعمتوں کا حق پہچان کے ان کا صحیح استعمال کرنا، احکام الٰہی کے مقابلے میں سرکشی واستکبار نہ برتنا ،اللہ کے احسانات مان کر اس کا مطیع فرمان بننا) رہے تو میں تمہاری تعداد اور اپنے افضال وعنایات میں برابر اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری اور نافرمانی کی راہ چل پڑے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔'' (۱۰)

سید ابوالاعلی مودودی بائبل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس مضمون کی تقریر بائبل کی کتاب استثنا میں بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں۔ پھر تورات کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالی نے ان کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں، جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے رب کی فرماں برداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی۔'' (۱۱)

اسی طرح اللہ تعالی کی نصیحت اور ہدایت سے منہ موڑنے والے کو دنیا اور آخرت میں ذلیل کر دیا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّ نَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴)

---

(۹) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۵۷۰

(۱۰) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۴، ص:۳۱۲

(۱۱) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۲، ص:۴۷۲

اور جو میرے ذکر (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا
میں زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

نصیحت سے منہ موڑنے والے کی زندگی راحت، سکون سے خالی ہوگی۔ وہ اپنی ناجائز تدابیر کی وجہ سے دنیاوی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے ضمیر اور اجتماعی ماحول کے ساتھ ایک کش مکش میں مبتلا ہوگا، جو اسے کبھی اطمینان اور سچی مسرت سے فائدہ مند نہیں ہونے دے گی۔

۴۔خوف خدا

خوف خدا کو اصطلاحاً تقوی کہا جاتا ہے۔ اللہ سے ڈرنا اور گناہوں سے بچنا تقوی کہلاتا ہے۔ انسانی دل کی پاکیزہ ترین اور اعلی ترین کیفیت کا نام تقوی ہے، جو تمام نیکیوں کا محرک اور بادشاہ ہے۔ تقوی ہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقوی قرآنی رہنمائی کی غرض و غایت، تمام عبادات ربانی کا مقصود اور تمام اخلاقی تعلیمات کا ماحصل قرار پایا۔ یہ تمام اسلامی تعلیمات اور احکامات کی غرض وغایت ہے۔ تعلیمات نبوی کا خلاصہ ایک لفظ میں ''تقوی'' ہے۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقوی کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآنی تعلیم سے تقوی والے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقوی کی بنیاد پر قائم ہے۔(۱)

مثال کے طور پر عفو اور عدل کو تقوی کے زیادہ قریب قرار دیا گیا۔

وَاِنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى (البقرہ ۲:۲۳۷)۔ — اور اگر تم معاف کرو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى (المائدہ ۵:۸) — عدل کرو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

تقوی بطور محرک اخلاق کے حوالے سے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۙ يُّصۡلِحۡ
لَـكُمۡ اَعۡمَالَـكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ (الاحزاب ۳۳:۷۰،۷۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سیدھی بات کہو، تمہارے
اعمال کو درست کردے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس سے متعلق ایک تفسیری نکتے میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالی نے اصلاح کے دو طریقے ذکر فرمائے ایک تقوی اور ایک قول سدید۔ تقوی کے معنی خوف خداوندی کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے اور قول سدید یعنی ٹھیک بات کہنا اس کا تعلق زبان سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان باتوں کو اختیار کرو گے تو اللہ تعالی تمہارے اعمال کی اصلاح فرما دیں گے۔ جب قلب درست ہو جائے اور زبان درست ہو جائے تو لامحالہ باقی اعمال درست ہو جائیں گے۔ اعمال کا دارومدار زیادہ تر انہی دو چیزوں پر ہے ایک دل اور ایک زبان جب یہ دونوں درست ہو جائیں گے تو باقی بھی درست ہو جائیں گے۔ تمام اعضاء میں سب سے زیادہ تیز اور رواں زبان ہے۔ ہر عضو تھک جاتا ہے مگر زبان بولنے سے نہیں تھکتی۔''(۲)

اس آیت میں مسلمانوں کو تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقوی کی حقیقت اللہ تعالی کے احکامات کی مکمل اطاعت ہے۔ اللہ تعالی نے جن

---

(۱) علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۱ء) ج:۵،ص:۲۲۷-۲۳۲

(۲) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن (لاہور: مکتبہ حسان بن ثابتؓ، ۱۴۳۴ھ) ج:۶،ص:۳۳۶

معروف کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ کر گزرے اور جن سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کرے۔تقوی کے حکم کے بعد ایک خاص عمل کی ہدایت کی ہے جس سے تقوی حاصل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔وہ عمل ہے اپنی زبان سے سیدھی اور سچی بات کہنا۔یہ اگرچہ تقوی کا ایک حصہ ہے لیکن سچ بولنے سے تقوی کے باقی اجزا خود بخود حاصل ہوجائیں گے۔اس سے ماقبل آیت سے یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ اگر اللہ کے نیک بندوں کو تکلیف دینا چھوڑ دو تو تقوی آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہے

اتَّقُوااللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ (التوبہ۹:۱۱۹)

اس میں تقوی کو آسانی سے حاصل کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی تلقین فرمائی جو قول وعمل کے بھی سچے ہوں،جس کا حاصل ولی اللہ ہونا ہے۔دوسری آیت میں **اتقوا الله** کے ساتھ

وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ(الحشر۵۹:۱۸)

کا اضافہ کردیا،جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کو اس کی فکر چاہیے کہ اس نے کل یعنی قیامت کے دن کے لیے کیا اعمال آگے بھیجے ہیں۔جس کا خلاصہ فکر آخرت ہے اور یہ فکر تقوی کے تمام ارکان کو آسانی سے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ اَجۡرٌ كَبِيۡرٌ(الملک۶۷:۱۲)

جو لوگ بغیر دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں یقیناً ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے

سید ابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''یہ دین میں اخلاق کی اصل بنیاد ہے۔۔۔دین حق نے اخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اس ان دیکھے خدا سے ڈر کر برائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے،جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں نہیں جا سکتا ،جس نے خیر وشر کا ایک ہمہ گیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔اسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابل قدر ہے۔اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے کوئی بدی نہیں کرتا،یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے نیکی میں شمار ہونے والے افعال کو اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے کیونکہ ان کی مثال ریت پر تعمیر ہونے والی عمارت کی سی ہے۔''(۳)

ہر معاشرے نے اپنے طور پر خیر اور شر کی تعریف کی ہے۔کسی کی ذاتی رائے میں کسی چیز کو برائی قرار دیا گیا۔جبکہ کسی چیز کو برائی اس لیے قرار دیا گیا کہ دنیا اسے برا سمجھتی ہے اور معاشرے کو اس سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔یہ اخلاق کی کمزور بنیاد ہے۔اس لیے کہ آدمی کی ذاتی رائے غلط ہوسکتی ہے ۔دنیا میں خیر وشر کا تصور ایک جیسا نہیں ہے یہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ایک بین الاقوامی اور ہمیشہ رہنے والا خیر وشر کا معیار دنیا کے اخلاقی فلسفوں میں کبھی موجود نہیں رہا۔دنیاوی نقصان کا خطرہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔اسی طرح کسی دنیاوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی انسان کو ایک شریف انسان نہیں بنا سکتا۔ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دنیاوی طاقت غیب اور حاضر کو نہیں جانتی۔اس طاقت کی گرفت سے بچنے کی کئی تدبیریں ہیں اور کئی جرائم اس سے بچ کر ہوسکتے ہیں۔پھر کسی ملک کے قوانین تمام برائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔کئی برائیوں پر ملکی قوانین لاگو نہیں ہوتے۔

---

(۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء) ج:۶ص:۴۶،۴۷

باب چہارم:

رذائل اخلاق کا سد باب

اللہ رب العزت ایک اسلامی معاشرے میں اچھے اخلاق کو فروغ دینا چاہتے ہیں جبکہ برے اخلاق سے معاشرے کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔اس میں خیر وہی ہوگی جسے اللہ تعالی خیر قرار دیتا ہے اور وہی چیز شر کہلائے گی جسے اللہ شر قرار دیتا ہے۔اس سلسلے میں دیکھنا یہ کہ کن چیزوں سے برے اخلاق پھیلتے ہیں اور کن اقدامات کے ذریعے انہیں روکا جا سکتا ہے۔شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اس کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ انسان اپنے رب کی نافرمانی کرے۔وہ انسان کے اندر گندے اخلاق پیدا کرنا چاہتا ہے۔جبکہ اسلام انسان کو گندے اخلاق سے بچانا چاہتا ہے۔اس باب میں برے اخلاق کے اسباب ومحرکات کا جائزہ لے کر ان کو روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔پہلی فصل رزائل اخلاق کے محرکات اور ان کے سد باب کا جائزہ لیا جائے گا۔رذائل اخلاق کے محرکات میں نفس امارہ سرفہرست ہے۔انسان کا ایسا نفس جو انسان کو برائی پر اکساتا ہے۔دوسرے نمبر پر شیطان کی طرف سے برے اخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیبات ہوتی ہیں۔شیطان برائی کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔کمزور ایمان والے لوگ اس کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔نفس کی ناجائز خواہشات بھی انسان کے اخلاق کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔بعض مرتبہ انسان اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جائز وناجائز اور حلال وحرام کی تمیز بھول جاتا ہے۔منافق کی علامات بھی انسانی اخلاق کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔اسی طرح جب خدا کی موجودگی اور اس کے سامنے پیش ہو کر اعمال کی جوابدہی کا عقیدہ موجود نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت پھر اسے برائی سے نہیں روک سکتی۔اس فصل میں ان تمام اسباب ومحرکات کو روکنے کا قرآنی منشور پیش کیا گیا ہے۔

دوسری فصل میں عصر حاضر کے اخلاقی فساد کا جائزہ اور اس کا عملی حل پیش کیا جائے گا۔صد افسوس کہ آج اسلامی معاشروں میں برے اخلاق فروغ پا رہے ہیں۔ان عبادات سے فرار کی راہ اختیار کی جا رہی ہے جو انسانی اخلاق کو درست کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔الیکٹرانک میڈیا مسلمانوں کی اخلاقی تباہی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔شادیوں پر رقص وسرود کی محفلیں بپا کی جاتی ہیں۔جن میں بے حیائی کو پھیلانے کے علاوہ فضول خرچی کی جاتی ہے۔الیکٹرانک میڈیا مسلمانوں کی اخلاقی تباہی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔عدل وانصاف کا خاتمہ،عدم برداشت، جاہلانہ رسومات کا فروغ،عملی نفاق وغیرہ کا تدارک بہت ضروری ہے۔اسلامی معاشروں کو ان اخلاقی تعلیمات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہیں۔

تیسری فصل میں مغربی تحریکات کا اخلاقی لحاظ سے جائزہ لیا جائے گا اور اخلاق سوزی پر مبنی ان تحریکات کا تدارک پیش کیا جائے گا۔عالمی تسلط ،معاشی غلامی اور عصر حاضر میں مغرب کے اندر ہونے والی سائنسی ترقی نے انسان کو مغرب کا گرویدہ بنا دیا ہے۔بعض مسلمان آج مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔وہ اپنی روایات اور تعلیمات کو بھول چکے ہیں۔لادینیت،فحاشی،عریانی،تباہ شدہ خاندانی نظام وہ بڑی تحریکات ہیں جو اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو خراب کرنے کا باعث ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دین کی تعلیم سے اخلاق کا تصور حاصل کریں۔مادیت کی بجائے روحانیت کی طرف رجحان رکھیں۔ہر قسم کی بے حیائی اور برائی سے بچنے کی کوشش کریں۔ہمیں اپنے اخلاقی معیار اسلام کی تعلیم کی روشنی میں وضع کرنے ہیں کسی قوم اور تہذیب سے لینے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہمیں اللہ تعالی سے مدد مانگنے کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ہمیں نیکی کے راستے پر چلائے اور برائی کے ہر راستے سے بچائے۔اپنے انعام یافتہ بندوں کے راستے پر چلائے اور قیامت کے دن ان کی صف میں کھڑا فرمائے۔(امین)

فصل اول:

رذائل اخلاق کے محرکات کا سد باب

ا۔نفس امارہ:

ایک انسان میں رذائل اخلاق کی تحریک خود اس کا نفس پیدا کرتا ہے، جسے نفس امارہ کہا جاتا ہے۔اس کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (یوسف۱۲:۵۳)

بیشک نفس برائی سکھانے والا ہے،مگر جس پر میرے رب نے رحم کیا بیشک میرا رب غفور اور رحیم ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ نفس امارہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نفس امارہ سے وہی نفس مراد ہوگا جو انسانوں کو برائی کے راستے پر لگاتا ہے۔حقیقت یہی ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو برے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا ہے سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرمائے یعنی جس میں برائی کا مادہ نہ رکھے اور اسے برے تقاضوں سے پاک کر دے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں۔ایسے نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے۔غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہر نفس انسانی کو امارۃ بالسوء یعنی برے کام کا حکم کرنے والا فرمایا ہے۔''(۱)

نفس بالذات برائی کا حکم دینے والا ہے۔نفس کی طبیعت اور جبلت میں برائی کا میلان رکھا ہے ایک لمحہ کے لیے بھی نفس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔نفس کا ذاتی اقتضاء تو بدی ہی کی طرف ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''یہ حضرت یوسفؑ کی طرف سے حقیقت کی وضاحت ہے کہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ اپنے نفس کو میں گناہوں سے بالاتر سمجھتا ہوں۔نفس میرے ساتھ بھی ہے اور وہ برائی کے لیے وسوسہ اندازیاں بھی کرتا رہتا ہے جب تک کہ خدا کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال رہے۔سو میں اگر فتنوں سے محفوظ رہا تو اس وجہ سے نہیں کہ میں اپنے اندر نفس نہیں رکھتا تھا بلکہ صرف اس وجہ سے محفوظ رہا کہ میرے رب کی رحمت وعنایت نے میری دست گیری فرمائی۔میرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔الا ما رحم ربی میں ما ہمارے نزدیک ظرفیہ ہے۔
>
> یہاں یہ سنت الٰہی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی الہام فرما کر اس کو اختیار دیا ہے کہ وہ بدی کی راہ اختیار کرے یا نیکی کی۔اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت وعنایت سے متوجہ ہوتا ہے اور اس کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور اگر کوئی شخص نیکی کی راہ چھوڑ کر بدی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی راہ میں پڑنے کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔حضرت یوسفؑ نے نفس کے اعلیٰ داعیات کو اختیار فرمایا اور اس راہ کی تمام مزاحمتوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔

---

(۱) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۵،ص:۳۷-۴۷

یہاں تک کہ نفس کے سفلی داعیات ان کے آگے سپر انداز ہو گئے اور اللہ تعالی نے ان کو اس مرتبہ بلند کی سرفرازی بخشی جوان کے لیے مقدر تھا۔''(۲)

سید ابوالاعلی مودودی کے نزدیک

''انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطین جن وانس نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔اس کے اپنے غلط نظریات اس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔اس کی اپنی ناجائز اغراض وخواہشات اس کی قوت تمیز،قوت ارادی،قوت فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔اور باہر کے شیاطین ہی نہیں،انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اس کو بہکاتا ہے۔یہی بات قرآن مجید میں ایک جگہ فرمائی گئی **وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ** (ق ۵۰:۱۶)اور ہم اس کے اپنے نفس سے ابھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں۔اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مشہور خطبہ مسنونہ میں فرمایا ہے:**نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا**،''ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔''(۳)

مفتی محمد شفیعؒ نفس امارہ کو نفس لوامہ اور پھر نفس مطمئنہ بنانے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن سورہ قیامہ میں نفس انسانی کو لوامہ کا لقب دے کر اسے یہ اعزاز بخشا ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے۔سورہ الفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دے کر اسے جنت کی بشارت دی ہے۔اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو امارۃ بالسو یعنی برے کاموں کا تقاضا کرنے والا ہے،لیکن جب انسان خدا اور آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوامہ بن جاتا ہے یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنے والا جیسے عام صلحاء امت کے نفوس ہیں،اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچادے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔صلحاء امت کو یہ حال مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیھم السلام کو خود بخود عطاء خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے اور ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے،اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔

اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کے لفظ غفور میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس امارۃ بالسوء جب اپنی خطاء پر نادم ہو کر توبہ کرے اور نفس لوامہ بن جائے تو اللہ تعالی کی مغفرت بڑی ہے وہ معاف فرمادیں گے اور لفظ رحیم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو نفس مطمئنہ نصیب ہو وہ بھی اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔''(۴)

غرض نفس امارہ سے مراد نفس کی وہ قسم ہے جو انسان کو برائی پر اکساتی ہے۔نفس امارہ کو تعلق باللہ،مجاہدہ نفس اور توبہ وغیرہ کے ذریعے رذائل اخلاق اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔اس سے یہ پہلے نفس لوامہ میں اور پھر نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

---

(۲)مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور:فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء)ج:۴،ص:۲۲۵،۲۲۶

(۳)مولانا سید ابوالاعلی مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء)ج:۶،ص:۵۷۳

(۴)مفتی محمد شفیع،معارف القرآن (کراچی،ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء)ج:۵،ص:۷۴،۷۵

۲۔شیطانی ترغیبات:

نفس امارہ کے بعد شیطان گناہ کی ترغیب دلا کر انسان کے اندر اخلاق رذیلہ کی تحریک پیدا کرتا ہے۔اس سے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَینکم العداوۃ و البغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلٰوۃ فھل انتم منتھون (المائدہ۵:۹۱)

اس کے سوانہیں کہ شیطان چاہتا ہے کہ وہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے سے دشمنی ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے۔پس کیا تم باز آ ؤ گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''شیطان نے یہ فتنے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ تمہیں ان میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکا تا رہے۔چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے اس میں یا تو عفت،عزت،ناموس اور حیا و وفا کا احساس مٹ جائے گا،جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر ان کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن ان کی بدولت تلواریں تلواریں کھنچی رہیں۔عرب غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے لیکن شراب اور جوئے کے رسیا تھے۔کسی نے اگر شراب کی بدمستی میں کسی کی عزت پر حملہ کیا یا کسی کی تحقیر کی تو افراد کی یہ لڑائی قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی جو ایک صدی تک جاری رہتی۔''(۵)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جوئے سے باہمی عداوت یوں پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات آدمی جوئے میں اپنا کل مال ہار کر مفلس ہو جاتا ہے۔پھر جب وہ اپنا مال دوسرے کے پاس دیکھتا ہے تو اس کو اس کے ساتھ دشمنی ہو جاتی ہے۔غرض شراب اور جوا نفرت کے قوی ترین اسباب میں سے ہیں۔یہ تو شراب اور جوئے کا دنیاوی نقصان ہے اور اخروی نقصان یہ ہے کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔یعنی شیطان کا مقصود شراب اور جوئے کی ترغیب سے یہ ہے کہ تم ان میں پڑ کر یاد الٰہی اور نماز سے غافل ہو جاؤ کیونکہ شراب اور جوئے میں پھنس کر یاد الٰہی اور نماز کا ہوش ہی نہیں رہتا اور اس کی دلیل تجربہ ومشاہدہ ہے کہ شطرنج کھیلنے والوں کو نماز تو کیا کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔''(۶)

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ(البقرہ ۲:۲۶۸)

شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

بندہ جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو شیطان اسے بھوک سے ڈراتا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے تم غریب اور بھوکے ہو جاؤ گے۔اس کے علاوہ وہ انسان کو بے حیائی اور برائی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اللہ رب العزت اس کے مقابلے میں انفاق پر کئی گنا اجر کا وعدہ کرتے ہیں۔وہ اس دولت کو اپنے ذمے ایک قرض قرار دیتے ہیں جسے وہ روز قیامت کئی گنا اضافے کے ساتھ واپس لوٹائیں گے۔

---

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن(لاہور:فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء) ج:۲،ص:۵۹۰،۵۹۱

(۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی،معارف القرآن(لاہور:مکتبہ حسان بن ثابتؓ،۱۴۳۴ھ) ج:۲،ص:۵۸۲

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ ان مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے ہاتھ روکے رکھے ، ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی ، مے نوشی، سینما بینی اور اسرار وتبذیر کی دوسری عادتوں میں پھنساتے ہیں تا کہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لیے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی ہی نہ رہ جائے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت وشدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں میں سے کسی کا حق ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہ جاتے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں شیطان کے اسی ہتھکنڈے سے بچنے کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

یہی مضمون سورہ آل عمران کی آیات ۱۳۴، ۱۳۵ میں بیان ہوا ہے۔ مغفرت یہاں ''فحشاء'' اور فضل کا لفظ فقر کے مقابل میں ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کی بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی اور عیاشی کی راہ سمجھاتا ہے تا کہ تمہیں سیدھے جہنم میں لے جائے، لیکن اللہ تمہیں اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی طرح شیطان تمہیں فقر کے ہوے سے ڈرا کر تمہارے دل بٹھاتا ہے، لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض میں دنیا و آخرت دونوں میں اپنے بے پایاں فضل وانعام کا وعدہ فرماتا ہے۔(۷)

اللہ رب العزت نے شیطان کے اس فتنے اور چال سے بچنے کا حکم دیا ہے جس کی وجہ سے اس نے ابوالبشر حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جنت سے نکلوا کر بے پردہ کر دیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (الاعراف ۷:۲۷)

اے بنی آدم! شیطان تمہیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا چھوڑا ان کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کیا۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''سَوْاٰتِهِمَا یہ بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انہی یاددہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولاد آدم کو کی گئی تھیں اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخر ان کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ وخشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت

---

(۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج: ۱، ص: ۲۶۰، ۲۶۱

جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضاء میں جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیطان اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب ویدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کر کے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں۔''(۸)

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف۷:۲۷)

کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی ''شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے حربے بے شمار ہیں'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں انسان بھی۔ وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمہارے لیے وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انہیں دوست ناصح، خیر سگال، مرشد لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمہارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمہارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں جا کر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمہارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا ہر وقت اس سے چوکنا رہنا۔''

قرآن عظیم نے شیاطین کو کافروں کا دوست قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف۷:۲۷)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ شیطان اور اس کے جتھے کے حملوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتائی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے جمے رہنا۔ ایمان سے مراد اللہ اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس دنیا میں اتارتے وقت شیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ بتائی تھی کہ جو میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

---

(۸) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳، ص:۲۴۶، ۲۴۷

ارشاد الٰہی ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۳۸)

ہم نے کہا کہ یہاں سے سب اتر واگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔

''اوپر زیر بحث ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ان کے دل خالی گھر کی مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرے جما لیتے ہیں۔خانہ خالی را دیومی گیرد۔اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں ان کے اندر شیاطین کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔''(۹)

یہی بات دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوئی:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (الزخرف ۴۳:۳۶)

اور جو خدائے رحمان کی یاد سے بے پرواہو جاتا ہے،ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے

لفظ ذکر رحمان کے وسیع معنی ہیں۔رحمان کے ذکر سے اللہ کی یاد،اللہ کی طرف سے آنے والی نصیحت اور قرآن مجید بھی مراد لیا گیا ہے۔**عشاء عن الشی** کے معنی کسی چیز سے منہ پھیرنے کے آتے ہیں۔جو شخص اللہ کی یاد،اس کی نصیحت یا قرآن کریم سے آنکھیں بند کر لے اور ان سے اعراض کر کے غافل بن جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس بندے کے ساتھ رہتا ہے۔اس کی مثال ہمیں اہل کتاب میں نظر آتی ہے کہ وہ حق کو جاننے کے باوجود اسے چھپاتے تھے اور لاعلم بننے کی کوشش کرتے تھے۔ایسے غافل جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و نصیحت سے منہ موڑتے ہیں شیاطین ان کو ہر وقت حق کے راستے سے روک لیتے ہیں یہاں تک کہ انہیں جہنمی بنا دیتے ہیں۔

انسانی دل کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جب تک اللہ کی یاد سے آباد رہتا ہے اس وقت تک شیطان کچھ نہیں کر سکتا۔لیکن جب انسان اپنے رب سے غافل ہو جائے تو آہستہ آہستہ شیطان اس کے دل پر قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔پھر شیطانی قبضے سے دل کو چھڑانا مشکل ہے۔شیطان بہترین پند و نصائح کے بارے میں شبہات اور اعتراضات بنا کر اسے گمراہ کر دیتا ہے۔

شیطان کے حملوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کی جائے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الاعراف ۷:۲۰۰)

اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیجیے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

اس آیت میں شیطانی وساوس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔یہ انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔انسان کے دشمن دو طرح کے

---

(۹) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳،ص:۲۴۹

ہیں۔ایک تو وہ دشمن ہیں جن سے وہ مقابلہ کرسکتا ہے۔دوسری قسم کے دشمن شیاطین وغیرہ ہیں جن سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔لہذا ان کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالی کی پناہ حاصل کی جائے۔اللہ تعالی کی پناہ حاصل کرنے کے علاوہ اس کے حملوں سے بچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔
اسماعیل بن عمر المعروف ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''اس آیت میں شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم ہوا۔اس لیے کہ وہ انسان کا سخت ترین دشمن ہے اور احسان فراموش بھی ہے۔انسانی دشمنوں سے بچاؤ تو عفو و درگزر اور سلوک واحسان سے ہوجاتا ہے لیکن اس ملعون سے سوائے اللہ کی پناہ کے اور کوئی بچاؤ نہیں۔قرآن مجید میں تین آیتیں اخلاق فاضلہ کی تعلیم وتلقین کے لیے جامع آئی ہیں اور ان تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔یہ تینوں حکم جو سورہ اعراف کی ان تین آیتوں میں ہیں،یہی سورہ مومنون (۲۳:۹۶،۹۷،۹۸)اور سورہ حم السجدہ (۴۱:۳۴،۳۵،۳۶) میں بھی ہیں۔''(۱۰)

ان تینوں آیات میں غصہ دلانے والوں کو معاف کرنے اور برائی کا بدلہ اچھائی سے دینے کی ہدایت ہے۔اس ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ حاصل کرنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ شیطان انسانی جھگڑوں میں خاص دلچسپی لیتا ہے۔انسانی جھگڑے کی جگہ شیطان کی آماجگاہ ہے۔وہ انتہائی حوصلے والے آدمی کو غصہ دلا کر تہذیب کی حدود سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔جب غصہ پر قابو نہ پاسکیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آرہا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ حالت تبدیل کرلیں کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں۔پانی پی لیں،اللہ کی طرف رجوع کریں اور شیطان سے پناہ مانگیں تا کہ اعلی اور شریفانہ اخلاق کی تکمیل ہوسکے۔

۳۔خواہشات نفس:

خواہش نفس اخلاق رذیلہ کا اصل محرک ہے،یہی عقل اور علم کو اکثر گمراہ کرتی ہے۔نفس اور اس کی خواہشات ہی انسان کو اللہ کی اطاعت سے روکتے ہیں۔عربی زبان میں اس کے لیے لفظ''**الھوی**''مستعمل ہے۔انسانوں نے''**ھوی**''یعنی خواہش نفس کو خدا بنالیا اس سے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان ۲۵:۴۳)
کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہو۔

اس آیت میں اس شخص کو جو اسلام وشریعت کے خلاف اپنی خواہشات کا پیرو ہو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی خواہشات کو معبود بنالیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ''خلاف شرع خواہشات نفسانی بھی ایک بت ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے۔''(۱۱)
خواہش نفس کو خدا بنالینے سے مراد اس کی بندگی کرنا ہے اور یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی شرک ہے جیسا بت کو پوجنا یا کسی مخلوق کو معبود بنانا۔حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا تَحۡتَ ظِلِّ السَّمَآءِ اِلٰهٌ یُعۡبَدُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ تَعَالٰی اَعۡظَمُ عِنۡدَا اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنۡ هَوًی مُتَّبِعٌ (۱۲)

---

(۱۰)اسماعیل بن عمر،مترجم مولانا محمد جونا گڑھی،تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ،۱۹۹۹ء) ج:۲،ص:۲۵۲
(۱۱)مفتی محمد شفیع،معارف القرآن (کراچی:ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء) ج:۲،ص:۴۷۶
(۱۲)الحجة فی بیان المحجة،باب ما ورد فی کتاب الله عزوجلمن بیان ان....،فصل فی ذکر اھواء المذمومة،رقم:۸۱

اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے معبود بھی پوجے جا رہے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین معبود وہ خواہش نفس ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی خواہشات نفس کی پیروی سے متعلق لکھتے ہیں:

''جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہو اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہو کہ اس کے لیے صحیح راہ کونسی ہے اور غلط کون سی ،وہ اگر کسی قسم کے شرک یا کفر میں مبتلا بھی ہو تو اس کو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے،اور یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ راہ راست اختیار کرنے کا فیصلہ تو اس پر ثابت قدم رہے گا۔لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شتر بے مہار ہے۔اسے تو اس کی خواہشات جدھر جدھر لے جائیں گی ،وہ ان کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔اس کو سرے سے یہ فکر ہی نہیں ہے کہ صحیح و غلط اور حق و باطل میں تمیز کرے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرے۔پھر بھلا کون اسے سمجھا کر راستی کا قائل کر سکتا ہے ۔اور بالفرض اگر وہ بات مان بھی لے تو اسے کسی ضابطہء اخلاق کا پابند بنا دینا تو کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔''(۱۳)

جو لوگ عقل کو چھوڑ کر خواہشوں کی پوجا کر رہے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ ان کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں۔یہ آپ کو تسلی دی گئی ہے۔انسان میں عقل رہنمائی کا چراغ ہے خواہشات نفس نہیں ہیں۔جو لوگ رہنمائی کے چراغ کو بجھا کر اندھی خواہشات کے پیچھے چل پڑیں ان کو راستہ کون دکھا سکتا ہے۔تمام خواہشات اندھی ہوتی ہیں جو صرف اپنے مطالبات منوانا جانتی ہیں۔ان کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ کیا حق ہے اور کیا باطل؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ جو شخص ان کو ایک معبود کی طرح پوجنے لگ جاتا ہے وہ شیطان کے پھندے میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔پھر اس پھندے سے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہے۔عقل کو چھوڑ کر خواہشات کی پوجا کرنے والوں کو قرآن نے جانوروں سے تعبیر کیا ہے۔قرآن مجید کا یہ اسلوب مبالغہ آرائی نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔جانور اپنی پیدائش کی جبلت پر قائم رہتے ہیں۔جانور خواہشات کی پیروی میں اپنی جبلت سے انحراف نہیں کرتے۔لیکن انسان اپنی خواہشات کی پیروی کے بعد اپنی جبلت سے انحراف کرتا ہے تو وہ جانوروں سے بھی بدترین ہو جاتا ہے۔

اسی لیے اللہ رب العزت نے خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ایک مقام پر خواہشات کو عدل کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے ارشاد ہے:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا(النسآء۴:۱۳۵)

سو تم انصاف کرنے میں خواہش (نفس) کی پیروی نہ کرو۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''**هوى**'' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''**هوى**''**هدى الله** کی ضد ہے یعنی اگر تم نے اللہ کی یہ ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں اور بدعتوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر اللہ تعالیٰ نے تم کو قائم کیا ہے اور جس کی دعوت وشہادت پر تم مامور کیے گئے ہو۔''(۱۴)

قیامت کے دن ایسے شخص کا ٹھکانہ جنت کو قرار دیا گیا ہے جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا۔

---

(۱۳)مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۲۰۱۶ء)ج:۳،ص:۴۵۳

(۱۴)مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور:فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء)ج:۲،ص:۴۰۷

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزِعٰت ۷۹: ۴۰، ۴۱)

جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف کیا تھا اورنفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہو گی

سیدابوالاعلی مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہاں چندمختصر الفاظ میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخرت میں اصل فیصلہ کس چیز پر ہونا ہے۔ دنیا میں زندگی کا ایک رویہ یہ ہے کہ آدمی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے اپنے خدا کے مقابلے میں سرکشی کرے اور یہ طے کر لے کہ اسی دنیا کے فائدے اور لذتیں اسے مطلوب ہیں، خواہ کسی طرح سے بھی وہ حاصل ہوں۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ یہاں زندگی بسر کرتے ہوئے آدمی اس بات کو پیش نظر رکھے کہ آخر کار ایک دن اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اورنفس کی بری خواہشات کو پورا کرنے سے اس لیے باز رہے کہ اگر یہاں اس نے اپنے نفس کا کہا مان کر کوئی ناجائز فائدہ کما لیا، یا کوئی ناروا لذت حاصل کر لی تو اپنے رب کو کیا جواب دے گا؟ آخرت میں فیصلہ اسی بات پر ہونا ہے کہ انسان نے ان دونوں میں سے کون سا رویہ دنیا میں اختیار کیا۔ پہلا رویہ اختیار کرنے پر مستقل ٹھکانہ دوزخ اور دوسرا رویہ اختیار کرنے پر مستقل جائے قیام جنت۔''(۱۵)

۴۔نفاق:

ایمان کا انکار انسان کے اعمال و اخلاق میں فساد پیدا کرتا ہے۔ ایمان انسان میں اخلاق حسنہ کی پرورش کرتا ہے جبکہ نفاق رذائل اخلاق کی پرورش کرتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے کے بارے میں مومنین اور منافقین کے طرزعمل کا موازنہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ (التوبه ۹: ۴۴، ۴۵)

جو اللہ اور آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی مال و جان سے جہاد نہ کرنے کی تم سے رخصت مانگنے نہیں آئیں گے۔ اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔ رخصت مانگنے تو وہی آتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک میں ڈانوا ڈول ہیں۔

سیدابوالاعلی مودودی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوا کہ کفر و اسلام کی کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدعی ایمان کے فرق کو صاف کھول کر رکھ دیتی ہے۔ جو شخص اس کشمکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور تمام ذرائع اس کو سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلوتہی کرے، اس کی روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں۔''(۱۶)

---

(۱۵) مولانا سیدابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج: ۶ ص: ۲۴۷

(۱۶) مولانا سیدابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج: ۲ ص: ۱۹۷، ۱۹۸

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ ایک نمایاں فرق واضح فرمادیا ہے مخلصین اور منافقین کے درمیان کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر سچا اور پکا ایمان رکھتے ہیں وہ تمہارے پاس جہاد سے رخصت کی درخواستیں لے کر نہیں آتے۔اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔یہ رخصت کی درخواستیں وہی لوگ لے کر آتے ہیں جن کا اللہ اور آخرت پر سچا ایمان نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں سے شک کا روگ چمٹا ہوا ہے جس کے سبب وہ زبان سے تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھی بنے ہوئے ہیں لیکن ان کے دل ڈانوا ڈول ہیں۔یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث وہی لوگ ہیں جو خود تو جھوٹے عذرات کی آڑ لے کر اپنے کو معذور ٹھہراتے ہیں لیکن کسی دوسرے کو ان عذرات پر مطمئن نہیں کر سکتے تھے،اس لیے کہ جہاد کے لیے جو چیزیں عذر بن سکتی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں دوسروں سے مخفی رہ سکیں۔جو لوگ واقعی معذور ہوتے ہیں ان کا عذر بدیہی ہوتا ہے اور ہر شخص ان کو معذور ٹھہراتا ہے چنانچہ اسی سورہ میں آگے (التوبہ ۹:۹۱،۹۲)ان حقیقی معذورین کی تفصیل بھی بیان فرمادی ہے۔''(۱۷)

منافق نفق سے ماخوذ ہے اور نفق سرنگ کو کہتے ہیں۔چونکہ سرنگ کے دو منہ ہوتے ہیں اسی طرح منافق کے بھی دو چہرے ہوتے ہیں۔ظاہر سے کچھ اور ہوتا ہے اور اندر سے کچھ اور۔منافق کی دو اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ایک اعتقادی منافق ہوتا ہے اور دوسرا عملی منافق۔مدینہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کو اعتقادی منافقین سے سامنا تھا جو مسلمانوں کے پاس آکر جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کرتے اور واپس جا کر کفر کرتے۔دکھاوے کے طور پر کچھ نیکیاں بھی کرتے۔روحانی اعتبار سے نفاق کو دل کا مرض کہا گیا ہے۔دل کی خرابی کی وجہ سے ان کا سارا جسم خراب رہتا۔وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیتے۔اخلاقی اعتبار سے ان کی حالت خراب تھی۔وہ جھوٹ بولتے،امانت میں خیانت کرتے،وعدے کی خلاف ورزی کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے تو گالیاں دیتے۔منافقوں کی علامات اختیار کرنے والوں کو عملی منافق کہا گیا ہے۔بعض برے اعمال بھی نفاق کو پروان چڑھاتے ہیں۔مثلاً گانا بجانا اور سننا دل میں منافقت کو پروان چڑھاتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ نفاق کو پروان چڑھانے والے اعمال سے اجتناب کیا جائے کیونکہ نفاق بھی انسانی اخلاق کی تباہی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۵۔عقیدہ آخرت کا انکار:

عقیدہ آخرت کا اقرار انسانی اخلاق واعمال کو صحیح سمت عطا کرتا ہے۔عقیدہ آخرت تمام نیک اعمال کی بنیاد ہے۔اس عقیدے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں جو کچھ بھی کریں گے روز قیامت ہمیں اس کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔اس جوابدہی کے احساس کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اسے نیکی کے راستے پر گامزن نہیں رکھ سکتی۔آخرت میں محاسبے کا خوف مومن کو نیکی کی طرف مائل اور برائی سے دور کرتا ہے۔انسان جنت اور دوزخ کے تصورات سے اپنے انجام کے بارے میں فکر مند رہتا ہے۔وہ نیکیوں سے محبت کرتا ہے اور زیادہ نیکیاں کمانے کی فکر میں رہتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ آخرت میں نیکیوں کا وزن زیادہ ہونے سے کامیابی ملے گی۔

اس کے برعکس اس عقیدے کا انکار انسانی اخلاق کے لیے سخت تباہ کن ہے۔منکرین آخرت یہی سمجھتے ہیں کہ بس یہی دنیا کی زندگی ہے اسی میں کھا پی کر مر جانا ہے۔ایسے لوگ اکثر خدا کے وجود کے ہی قائل نہیں ہوتے۔ان کا نظریہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔نیز مرنے کے بعد ان کو دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا۔اس تصور سے انسانی زندگی بالکل بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔تاریخ انسانی گواہ ہے کہ منکرین آخرت کی اخلاقی حالت بہت بری تھی۔آپ مشرکین مکہ کو دیکھ لیجیے۔ان کا زمانہ اخلاقیات کی تباہی کی وجہ سے زمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔جس میں قتل وغارت گری عام ہے۔شراب پی

---

(۱۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء) ج:۳،ص:۵۸۳،۵۸۴

جاتی ہے، جوا کھیلا جاتا ہے، بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا ہے، خدا کے سوا ہر چیز کی پوجا کی جاتی ہے، چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر طویل جنگیں چھڑ جاتی ہیں ۔ان تمام بداخلاقیوں کا ایک اہم سبب آخرت کا انکار بھی تھا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی انکار آخرت کے اخلاقی پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشات نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدہ آخرت کو اس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگی نفس اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔کوئی برائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔کسی کا حق مارنے میں انہیں تامل نہیں ہوتا۔کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رک جائیں گے کہ حق وانصاف کا کوئی احترام ان کے دلوں میں ہے۔جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے ،وہی واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں،مگر وہ ان سے الٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔کوئی کلمہ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔جو دلیل بھی کسی انسان کو برائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اسی بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں اور ان کے دل ودماغ کسی اچھی فکر کی بجائے شب وروز اپنی اغراض وخواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی ادھیڑ بن میں ہی لگے رہتے ہیں۔یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدہ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رویہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔''(۱۸)

غرض عقیدہ آخرت کا انکار خواہش نفس کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔انسان جب یہ سمجھتا ہے کہ بس اسی زندگی کو گزار کر ختم ہو جانا ہے تو وہ احساس ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس کھو بیٹھتا ہے۔اس کی دنیاوی زندگی بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔خدا اور آخرت کا انکار اسے مادر پدر آزادی عطا کرتا ہے ۔اسے نہ خدا کا خوف ہوتا ہے نہ مرنے کا خوف ہوتا ہے اور نہ مرنے کے بعد خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینے کا خوف ہوتا ہے۔اسے کسی جنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ اپنی زندگی سے کوئی اخروی کامیابی حاصل نہیں کرنا چاہتا۔اس کے نزدیک برائی وہی ہے جو اس کی ذاتی یا معاشرتی رائے سے برائی ہے۔اس لیے ایسے معاشرے اور لوگ آج دنیا کو اپنی بداخلاقی کے اعلیٰ مظاہرے پیش کرتے رہتے ہیں۔عریانیت وہاں کا فیشن بنتی ہے ۔نکاح اور خاندانی نظام انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔حیوانوں کی طرح جنسی آزادی ہوتی ہے۔ہم جنس شادی کر سکتے ہیں۔وہ دنیا کو جس قسم کی بے حیائی دکھانا چاہیں دکھا سکتے ہیں۔کیونکہ نہ انہیں خدا کا خوف ہے اور نہ ہی اس کے سامنے پیش ہونے کا ڈر۔ان نام نہاد مہذب معاشروں میں ذرا سی تاریکی بڑھنے پر سینکڑوں وارداتیں ہو جاتی ہیں۔

عقیدہ آخرت کی وجہ سے کئی لوگ شرمندہ ہوتے تھے کہ کل جب میں رب کے سامنے پیش ہوا تو میرا رب مجھ سے یہ سوال کرے گا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔رب کی بارگاہ میں شرمندگی اور ناکامی کا یہی احساس ہے جو انسان کو اللہ کا ولی اور دوست بنا دیتا ہے۔لیکن جہاں یہ احساس نہ ہو وہاں صرف اللہ کا عذاب ہی اس برائی کو ختم کر سکتا ہے جس کا شکار وہ قوم ہو چکی ہوتی ہے۔

---

(۱۸) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۴، ص:۵۹۰

فصل دوم:

موجودہ اخلاقی فساد کی اصلاح

اخلاق کے لحاظ سے اس وقت انسانی معاشرے دو اقسام میں تقسیم ہیں۔ معاشروں کی ایک قسم وہ ہے جو لادین تصورات یا سیکولرازم کے علمبردار معاشرے ہیں۔ لادین معاشرے دو قسم کے افراد پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ جو کسی مذہب کو مانتے ہیں خواہ وہ مسخ شدہ الہامی مذہب ہو یا غیر الہامی مذہب۔ دوسرے وہ جو کسی مذہب اور خدا کے وجود کے قائل ہی نہیں ہیں۔ معاشروں کی دوسری قسم وہ ہے جو توحید اور آخرت جیسے پاکیزہ تصورات اور عقائد کی بنیاد پر قائم ہیں یہ اسلامی معاشرہ کہلاتے ہیں۔

پہلی قسم کے معاشرے جو سیکولر اور لادین معاشرے کہلاتے ہیں ان میں کسی مذہب کی کارفرمائی نظر نہیں آتی، بلکہ مذہب کو ہر انسان کی زندگی کا ذاتی مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اسے ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ نفس پرستی اور عیاشی ان معاشروں کا خاصہ ہے۔ عورت کو ایک جنسی آلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ ایک لڑکی کو آزادی ہے کہ وہ جوان ہونے پر جہاں چاہے چلی جائے۔ ایسے معاشرے اخلاقی طور پر مادر پدر آزاد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ سرمایہ داری یا اشتراکی نظام معیشت کے زیر اثر ہیں یا کچھ یہودی اور عیسائی نظریات کے حامل ہیں۔ یہ معاشرے اول تو الہامی تعلیمات سے محروم ہیں اور کہیں الہامی تعلیمات ہیں تو وہ بھی مسخ شدہ شکل میں موجود ہیں۔ یہ معاشرے نہ صرف بے حیائی کے علمبردار ہیں بلکہ فحاشی اور عریانی کے مناظر کو دنیا میں پھیلانے کا ذریعہ بھی ہیں۔

ایسے معاشروں کی اخلاقی اصلاح اسلام کی قبولیت سے ممکن ہے، کیونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اخلاق کی صحیح بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس میں فلسفہ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کے تسلی بخش جوابات موجود ہیں۔ یہ مذہبی اخلاقیات کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ اس لیے یہ انسانوں کی مستحکم سیرت کو تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انہیں انسانی تمدن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل بناتا ہے۔ اگر اسلام کے اخلاقی اصولوں پر معاشرتی کردار کی بنیاد رکھی جائے تو انسان اس اخلاقی فساد سے نجات حاصل کر سکتا ہے جس کا وہ شکار ہے کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اخلاق کی بنیاد عقائد پر ہے اور عقائد جس قدر صحیح ہوں گے عمل اسی قدر درست ہوگا۔

دوسری قسم کے معاشرے اسلامی معاشرے ہیں۔ اسلامی معاشروں پر اس وقت مغربی تہذیب کا غلبہ ہے اور کئی مسلمان ممالک معاشی طور پر مغربی ممالک کے مقروض ہیں۔ اسلامی معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں اسلامی عقائد اپنی اصل روح کھو چکے ہیں۔ توحید کے علمبردار اکثر معاشرے شرک کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے ہر برے عمل کے لیے ان کے خیال میں چند ایسی ہستیاں ہیں جو خدائی اختیارات کی مالک ہیں۔ وہ ان کے تمام گناہ بخشوا سکتی ہیں اور کچھ نذر و نیاز کے عوض ان کی نجات کی ضامن ہیں۔ اگر قیامت کے دن یہ کسی پکڑ میں آ گئے تو یہ مقدس ہستیاں ان کو خدا سے چھڑا لیں گی یا گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی وجہ سے شاید گرفتاری کی نوبت ہی نہ آئے۔ ان مشرکانہ عقائد نے موت اور اس کے بعد کی زندگی کے عقیدے کو بے حقیقت کر دیا ہے اور مذہب کی اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ مذہبی اخلاقیات کتابوں میں تحریر اور زبانوں پر احتراماً ذکر کے ساتھ موجود ہیں لیکن شرک نے عملی پابندی سے فرار کے بے شمار راستے اس شان سے فراہم کر دیے ہیں کہ جس راستے سے بھاگیں ان کی منزل نجات ہے۔

جن اسلامی معاشروں میں خدا اور آخرت کا تصور کچھ بہتر صورت میں موجود ہے وہاں احکامات الٰہی سکڑ کر چند اعمال، چند رسوم اور چند پابندیوں تک محدود ہو گئے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان چند مطالبات کو پورا کرنے سے جنت مل جائے گی۔ اس تصور نے معاملات زندگی پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو محدود کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے شعبے مذہب سے حاصل ہونے والی اخلاقی رہنمائی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے خود تو اخلاقی پاکیزگی حاصل کر لی ہے لیکن انہیں مذہب و روحانیت کے محدود تصور نے خراب کر رکھا ہے۔(۱)

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۵ء) ص: ۱۲۴

اسلامی معاشروں میں عوام الناس اسلام کی دعویدار تو ہے لیکن اکثریت اپنی مذہبی تعلیمات سے آگاہ نہیں ہے۔اکثر لوگوں میں جہالت کی تینوں اقسام پائی جاتی ہیں یعنی ان کا نفس علم سے خالی ہے، وہ کسی بات پر خلاف حقیقت اعتقاد وایمان رکھ سکتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو حق کے خلاف ہوں ۔چنانچہ ہمیں اکثر اسلامی معاشروں میں عدل کی کارفرمائی نظر نہیں آتی ۔رشوت، جاگیرداری، وڈیرا ازم، پنچایتی فیصلے ہمارے اسلامی معاشرے میں عدل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ جب نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوتی ہے اور انہیں انصاف نہیں ملتا تو وہ تھانوں کے سامنے اپنے آپ کو زندہ جلانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔کسی عورت کی جائداد ہڑپ کرنے کے لیے اس کی قرآن سے شادی کر دی جاتی ہے تا کہ اس کو وراثت میں جو جائیداد ملی ہے اس کا مالک کوئی اور نہ بن جائے۔شادی بیاہ کی تقریبات میں ناچ گانے کی محفلیں بپا کی جاتی ہیں۔ان میں ایک تو فحاشی اور عریانی پھیلائی جاتی ہے اور دوسرا پیسے کو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔بسنت جیسے تہوار سے جہاں ایک طرف فضول خرچی کی انتہا کی جاتی ہے تو دوسری طرف یہ کئی جانوں کے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

عدم برداشت کی وجہ سے شدت پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے کئی شدت پسند تنظیموں نے اسلامی ممالک کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے ۔زمانہ جاہلیت کی طرح معمولی باتوں پر انسانوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ماپ تول میں کمی اور دھوکہ دہی معمول بنتی جا رہی ہے۔عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے کا رواج عام ہے۔دنیا اور مال کی محبت بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے حرص وہوس کے جذبات بڑھ رہے ہیں۔خودغرضی اور مفاد پرستی نے رشوت کا چلن عام کر دیا ہے۔مسلم معاشرے میں کرپشن کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔محنت کرنے والے کو کمین، بے ایمان کو ذہین اور بے حیا کو حسین سمجھا جاتا ہے۔

دنیا ایک گلوبل ویلیج یعنی عالمی گاؤں بن چکی ہے۔انٹرنیٹ، ملکی وغیر ملکی میڈیا بھی اس وقت اخلاق کی تباہی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔حالیہ ایک رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ فحش بینی ہمارے ملک میں کی جاتی ہے۔غیر ملکی ٹی وی چینلز دیکھنے سے نوجوان نسل انہی ماڈلز جیسی شکل وصورت اور لباس و وضع قطع اختیار کرتی ہے، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کیا ہمارا دین اور معاشرہ اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔کئی ڈرامہ سیریلز میں غیر محرموں سے تعلقات بڑھانے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔کئی ہندی ڈراموں کے اثر کی وجہ سے ہماری معاشرت ہنود جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ہم ایسی تہذیب کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں جس میں ہر شخص گناہوں کے اندر غرق ہو چکا ہے۔

اس اخلاقی تباہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر مذہبی پیشوا لوگوں کو اخلاق کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان کو چند فلسفیانہ اور کلامی مسائل میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ عقیدہ صحیح ہونا ہی کافی ہے باقی جو کچھ کرتے رہیں اللہ تعالی بخشش فرما دیں گے۔کئی مذہبی پیشوا اخلاقی اعتبار سے عملی نمونہ فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔غرض مسلمان معاشروں میں عملی طور پر اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا صحیح تصور مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اپنی تفسیر میں قرآن کی رو سے کفر کے رویے کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ان میں سے ایک صورت یہ ہے:

> ''نظریے کے طور پر ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملا احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔''(۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرز عمل ہے جو اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی اخلاق وآداب اور اسلامی ذہنیت

---

(۲) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۱، ص:۱۲۹

کے خلاف ہو۔مثلاً عورتوں کا بن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حسن کو زیب وزینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و ادا سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔''(۳)

مفتی محمد شفیعؒ اخلاقی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے لکھتے ہیں جس کا اختصار یہ ہے کہ:

''آج دنیا میں تعلیم یافتہ حضرات بھی یہی سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے، عوام اس کے ذمہ دار نہیں ہیں، یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک ہر سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔راعی و رعیت کے درمیان خلاف اور اختلاف کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے، ہر ملک کے عوام اپنی حکومت سے عدل وانصاف کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن خود کسی انصاف پر قائم رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ جو دنیا آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ قانون معطل ہے، جرائم کی روز افزوں ترقی ہے، آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے اسمبلیاں قائم ہیں، ان پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے، ان کے نمائندے منتخب کرنے کے لیے الیکشن میں خدا کی پوری زمین ہل جاتی ہے اور وہ قانون بناتے ہیں

اب سے سوسال پہلے کا موازنہ کریں، اعداد وشمار گواہی دیں گے کہ جوں جوں قانون سازی میں اضافہ ہوا، عوام کی مرضی کی نمائش بڑھی اور قانون کو نافذ کرنے کے لیے مشینری بڑھی ایک پولیس کی بجائے کئی قسم کی پولیس بروئے کار آئی۔لیکن روز بروز اتنے ہی جرائم بڑھے اور لوگ انصاف سے دور ہوتے چلے گئے اور اسی رفتار سے دنیا کی بدامنی بڑھتی چلی گئی۔
اگر کوئی مرد رشید رسول عربیؐ کے دیے ہوئے پیغام کو سوچے سمجھے اور اس حقیقت پر غور کرے کہ دنیا کا امن وسکون صرف تعزیرات سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔عالم کے امن وامان کی ضمانت صرف عقیدہ آخرت اور خوف خدا دے سکتا ہے، جس کے ذریعہ سارے فرائض رعایا اور رعیت اور عوام اور حکومت میں مشترک ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگتا ہے قانون کے احترام اور حفاظت کے لیے عوام یہ کہہ کر آزاد نہیں ہو جاتے کہ یہ کام حکام کا ہے۔
اللہ تعالی کی قوت وسلطنت اور اس کے سامنے حاضری اور حساب وکتاب اور جزا وسزا کا تصور نے آج سے سو سال پہلی کی ناخواندہ دنیا کو اس زمانے سے زیادہ امن اور سکون بخشا ہوا تھا اور اسی چیز کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے آج کی ترقی یافتہ دنیا امن وچین سے محروم ہے۔''(۴)

اس اخلاقی بگاڑ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ شرک کا خاتمہ کیا جائے اور اسلامی عقائد کو ان کی روح کے ساتھ بیدار کیا جائے۔صحیح عقیدہ اور ایمان ہی معاشرے کے اندر اعلی اخلاقی صفات پیدا کر سکتا ہے، جب عقیدہ اور ایمان ہی درست نہیں تو اخلاق کہاں سے درست ہوگا۔
دوسرا یہ کہ قیامت کے دن ہر انسان کو کامیابی کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی ضرورت ہوگی۔اخلاق عمل صالح کی اہم جزو ہے۔اس لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی صفت بھی پیدا کرنی ہوگی ورنہ جنت اتنی آسان نہیں کہ صرف ایمان پر مل جائے کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا کہ نافرمانی کا رویہ بعض مرتبہ کفر کے رویے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

---

(۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۲۰۱۶ء) ج:۴،ص:۹۱

(۴) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج:۲،ص:۵۷۴

بختیار حسین صدیقی لکھتے ہیں:

''اخلاقی زندگی کا انحصار انسان کے اپنے نصب العین سے لگاؤ، محبت اور بلکہ والہانہ عشق پر ہے۔ یہ نصب العین اس کے لیے زمین پر خدا کی نیابت کے فرائض ادا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ انسان میں اس نصب العین کے قریب سے قریب تر پہنچنے کی خواہش جتنی قوی ہوگی وہ اتنی تیزی سے اخلاقی ترقی کی منازل طے کرے گا۔ لیکن جب یہ خواہش کمزور ہو جائے تو وہ اخلاقی حیثیت سے تنزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ تنزل نفس کی اطاعت اور شیطان کی پیروی سے واقع ہوتا ہے۔'' (۵)

مفتی محمد شفیعؒ جدید تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کی ضرورت و اہمیت محسوس کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''آج جرائم کو روکنے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ لوگوں کو خیر کا داعی اور شر سے روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں اور ظاہر ہے کہ یہ ہنر تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آج کل بدقسمتی سے براور تقوی کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔ بر و تقوی اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آج کل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے اور اثم و عدوان کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ پھر یہ بے چاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے جب ساری قوم حلال و حرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت مثلاً ہر ملک میں چوری، ڈاکہ، فواحش، قتل و غارت گری میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن قانونی مشینری اس کو روکنے سے عاجز آ چکی ہے۔ اس کے یہ دو سبب ہیں:

ایک طرف تو حکومتیں اس قرآنی نظام دور ہیں، ان کے ارباب اقتدار اپنی زندگی کو بر و تقوی پر ڈالنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، کاش وہ ایک مرتبہ اسے اپنا کے خدا کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ لیتے کہ کس طرح ان کی عوام کو امن و سکون اور چین و راحت کی پاکیزہ زندگی عطا ہوتی ہے۔

دوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسداد جرائم صرف حکومت کا کام ہے وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محض احقاق حق اور انسداد جرائم کے لیے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو قرآن کریم کی رو سے حرام اور سخت گناہ ہے۔ گناہ اور سرکشی میں تعاون نہ کرنے والے حکم الٰہی سے بغاوت ہے۔'' (۶)

اخلاقی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ اخلاق کو درس و تدریس کا باقاعدہ حصہ بنایا جائے، تدریسی کتب میں ایک باب اخلاق سے متعلق ہونا چاہیے۔ ہمارے جمعہ و عیدین کے خطبات کا ایک حصہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اساتذہ، علماء اور مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں کو اخلاق کے سلسلے میں ایک مثال ہونا چاہیے کیونکہ لوگ ان سے اثر لیتے ہیں۔ ہمیں غیر ملکی میڈیا کی اندھی تقلید کی بجائے اپنی اخلاقی اقدار پر فخر ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے حضرت محمدؐ کی سیرت اور سنت بہترین عملی نمونہ ہیں۔

فرض عبادات میں غفلت سے بھی برے اخلاق پھیل رہے ہیں۔ اسلامی عبادات کو فروغ دے کر ہم معاشرے سے اخلاق رذیلہ کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر نماز کو قائم کیا جائے اور معاشرے کے اکثر افراد نماز قائم کریں تو بے حیائی اور برائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ روزہ سے تقوی اور ضبط نفس جیسی صفات پیدا کی جا سکتی ہیں۔ زکوۃ اور حج جیسی مالی عبادات انسان میں مال کی محبت کو کم کرنے اور مال کو پاک کرنے جیسی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

---

(۵) بختیار حسین صدیقی، اسلامی فلسفہ اخلاق (لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ۱۹۷۲ء) ص: ۵۱

(۶) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء) ج: ۳، ص: ۲۵، ۲۶

فصل سوم:

اخلاق سوزی کی مغربی تحریکات کا تدارک

اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب کا ایک مختصر تعارف حاصل کریں۔ یہ تعارف اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ممدومعاون ثابت ہوگا۔

مغربی تہذیب وثقافت کو اختیار کرنے والے ممالک میں تمام یورپی ممالک، امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور سیکنڈے نیویا کے دیگر ممالک بھی شامل ہیں۔عصر حاضر میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کو دنیا پر غالب ہیں۔روس کی شکست کے بعد امریکہ کو عالمی اقتدار پر غلبہ حاصل ہے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی کسی میں سکت نہیں۔اس طرح امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کی تہذیب کو بھی غلبہ حاصل ہے، اسے مغربی تہذیب کہا جاتا ہے۔آہستہ آہستہ دیگر ممالک کے لوگ اس تہذیب کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔

مغربی تہذیب کا آغاز فکری کشمکش اور طویل خانہ جنگی سے ہوا۔اس کشمکش کے نتیجے میں ایک مذہبی حکومت قائم ہوئی۔یہ حکومت لمبے عرصے تک قائم رہی۔اس مذہبی آمریت نے لوگوں کے حقوق غصب کیے اور عقل وشعور کی بات کرنے والوں کو قتل کردیا گیا۔یہ عقل کی بات کرنے والے کو ملحد سمجھتے تھے۔۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے بعد سائنسی انقلاب نے مذہبی حکومت کا خاتمہ کردیا۔غصب حقوق اور عقل وشعور کی دشمنی کی وجہ سے مذہب کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی اور سیاست کو مذہب سے الگ کردیا گیا یعنی سیکولرازم کو پروان چڑھنے کا موقع مل گیا۔

وہ خاص سوچ وفکر، نظریہ وعقیدہ جس کی بنیاد پر عمل وجود میں آتا ہے اس کو تہذیب کہتے ہیں، اور اس فکر کے نتیجے میں جو انداز زندگی اور رہن سہن کا طریقہ اپنایا جاتا ہے اس کو تمدن کہتے ہیں۔مغربی تہذیب سے مراد وہ نظریات، افکار اور خیالات ہیں جس کی وجہ سے اہل مغرب نے اپنا موجودہ تمدنی نقشہ (رہن سہن کا انداز) قائم کیا ہوا ہے۔سترھویں صدی عیسوی کے بعد یونانی فکر وفلسفہ کی جگہ مغربی فکر اور فلسفہ نے لی۔بعض لوگ مغربی تہذیب کو عیسائیت اور یورپی تہذیب سمجھتے ہیں۔حالانکہ مغربی فکر ان دونوں سے الگ ایک جداگانہ تصور اور نظریہ حیات ہے۔مغربی تہذیب یعنی فکر وفلسفہ کی کئی شاخیں ہیں۔ماڈرن ازم، پوسٹ ماڈرن ازم، سیکولرازم، لبرل ازم، روشن خیالی۔

مغربی تہذیب میں مذہب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں یہ ایک ایسا اژدہا ہے جس نے تمام الہامی وغیر الہامی مذاہب کو نگلنے کی کوشش کی ہے۔مذہب کو فرد کا نجی معاملہ سمجھ کر برداشت کیا جاتا ہے۔یہ لذت پرستی، نفس پرستی اور عیش طلبی کی تحریک ہے۔نفس امارہ اس طرز زندگی اور انداز فکر کو تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

مغربی تہذیب کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں اعلیٰ اتھارٹی خدا کی بجائے انسان کے پاس ہے۔خیر وشر کا تعین بندہ خود کرے گا۔اس تہذیب کا ماخذ قانون (کسی الہامی کتاب کی بجائے) انسانی حقوق کا عالمی منشور ہے۔اس کے بنیادی عقائد یعنی ایمانیات آزادی، مساوات اور ترقی کو قدر (اچھائی برائی جاننے کا پیمانہ) کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے۔جو ان بنیادی عقائد کو تسلیم نہیں کرتا یا انسانی حقوق کے عالمی منشور کو بطور قانون نہیں مانتا وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں۔یہ ایک فکری یلغار ہے جس نے تمام مذاہب کو روندنے کی کوشش کی ہے۔مذہب کا اثر لوگوں کے ناموں تک رہ گیا ہے، رسوم، عبادات، اخلاقیات ومعاشرت اس فکری یلغار کی نظر ہو چکے ہیں۔یہ دنیا میں لذت پرستی کی زندگی گزارنے کی تحریک ہے۔اس میں عقائد، عبادات اور اخلاقیات کو دین کا لازمی جز نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان میں سے صرف اخلاقیات کو اپنا کر باقیوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔اخلاقیات کو ہی مکمل دین سمجھا جاتا ہے اور مذہب کو صرف اخلاقی نظام کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) میں آزادی، روشن خیالی، انسانی حقوق جیسی پرکشش اور مبہم اصطلاحات مستعمل ہیں کہ ہر مذہب کا پیروکار اپنے زعم کے مطابق تشریح کرسکتا ہے۔ان نظریات واصطلاحات کا تعلق کسی مذہب سے نہیں بلکہ دہریت والحاد سے ہے۔محنت، اپنے مقصد سے لگن، تہذیب

وثقافت سے وفاداری اور ترقی وارتقا کے لیے مربوط جدوجہد مغربی تہذیب کا خاصا ہے۔ یہ تہذیب جمہوریت کی دعویدار اور اسلام دشمن ہے۔ اس کے نظریات میں علوم وفنون میں ترقی بھی شامل ہے۔ اس تہذیب کے علمبردار دنیا میں علوم وفنون کے بلند مقام پر فائز ہیں۔ یہاں اہل علم کی حوصلہ افزائی کے ساتھ دنیا کے بہترین دماغ اکٹھے کیا جاتے ہیں۔ علوم میں غلبہ نے اسے دنیا کی اجارہ دار تہذیب بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ دیگر اقوام کو علم سے محروم کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔

عصر حاضر میں اہل مغرب کی حیران کن ایجادات، سائنسی ترقی کی وجہ سے غیر مغربی اقوام اس قدر مرعوب ہیں کہ اہل مغرب کی طرف سے آیا ہوا ہر نعرہ غور وفکر کے بغیر قبول کر لیا جاتا ہے۔ ایسے نعروں کی اپنے زعم وگمان کے مطابق تشریح کر کے اس کی پرزور حمایت کی جاتی ہے۔ اس مرعوبیت کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلا

(۱) اپنی تاریخ سے ناواقفیت

(۲) سائنس وٹیکنالوجی میں حیران کن ترقی

(۳) انگریز کا تیار کردہ نظام تعلیم وذہن سازی

(۴) مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) سے ناواقفیت

غیر مغربی اقوام اس تہذیب کی رنگینیوں سے اس قدر متاثر ہیں کہ الفاظ کی ادائیگی سے لے کر لباس پہننے تک اس کی نقل اتارتی ہیں۔ یہ ایک فکر ہے اس لیے اس کا مقابلہ بھی فکر سے ہوگا، وگرنہ علاقہ تو مسلمانوں کا ہوگا، وطن بھی اسلامی ہوگا، پوری نسل کے نام بھی اسلامی ہوں گے لیکن ذہن میں کفر بھرا ہوگا۔ (۱)

اسلامی شریعت انسان کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کی اصلاح کی ضمانت دیتی ہے۔ اسلام کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ اس میں مذہب اور اخلاقیات کو ایک ہی معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں اخلاق، حیا اور مذہب کے الگ الگ معیارات ہیں، جس کی وجہ سے مغربی معاشرہ بدترین اخلاقی بحران کا شکار ہے۔ مغربی قانون دان اور جرائم کے علم کے ماہرین اس صورتحال سے سخت پریشان ہیں جو مذہب، قانون اور اخلاق کے الگ الگ تصور کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک قانون اور مذہب کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ ایک کام مذہب کی رو سے ناجائز ہے جبکہ قانون کی رو سے جائز ہے۔ عصر حاضر میں اس کی اہم ترین مثال اکثر مغربی ممالک میں مردوں کا آپس میں جنسی تعلقات استوار کرنے کو جائز قرار دیا جانا ہے۔ اسلامی شریعت میں اسے لواطت یعنی قوم لوط کا عمل مراد ہے، جس کی وجہ سے اس قوم پر عذاب الہی نازل ہوا۔ اسلامی شریعت میں اس جرم کی سزا بالاتفاق موت ہے تاہم سزا کی صورتوں میں اختلاف ہے۔

اسی طرح مغربی قانون کی رو سے مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا مرتکب ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ لیکن اسلامی قانون میں اگر غیر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کا ارتکاب کریں تو اس جرم کی سزا یہ ہے کہ انہیں سو کوڑے مارے جائیں اور اگر مرد اور عورت شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔ اسلام میں مذہبی قانونی اور اخلاقی اقدار کا مآخذ قرآن وسنت پر مبنی اسلامی شریعت ہے۔ اسلام میں امیر غریب اور چھوٹے بڑے کے فرق سے بالاتر ہو کر قانون کی حکمرانی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ دنیا کے کسی مذہب کے پاس نہیں۔ اسلامی قانون میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔ (۲)

امریکہ نہایت ترقی یافتہ ملک ہے جس کی پولیس فرض شناسی اور موثر کاروائی کے لیے مشہور اور وسیع اختیارات کی مالک ہے۔ لیکن وہ جنسی بے راہ روی، فحاشی اور عریانی کے مسئلہ پر قابو نہ پا سکی۔ مذہبی رہنماؤں کے وعظ بھی اس سیلاب کو نہ روک سکے۔ حتی کہ مذہبی رہنماؤں اور خدمت خلق کے

---

(۱) پروفیسر مفتی محمد احمد، تعارف تہذیب مغرب وفلسفہ جدید (فیصل آباد، مکتبہ عارفی، ۲۰۱۴ء) ص: ۷۸-۱، ۲۴۱

(۲) پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ایمان واسلام (لاہور: المطبعۃ العربیہ، ۱۹۸۷ء) ص: ۱۰۰، ۱۰۱

اداروں نے مل کر ''مارل ری آرمامنٹ'' (اخلاق سدھار) کے نام سے باقاعدہ ایک تحریک بھی شروع کی گئی۔اس کے چار بنیادی اصول تھے، اخلاقی طہارت، سچائی، ایثار اور محبت۔کئی سال تک اس تحریک کا زبردست چرچا رہا۔ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع سے اس تحریک کو مشتہر کیا گیا۔لیکن اعلی اخلاقی اصول، اشتہارات اور مذہبی رہنماؤں کی وعظ ونصیحت سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔فحاشی وعریانی میں مزید اضافہ ہوا۔جرائم اور بد عنوانیوں کے سائے مزید گہرے اور وسیع ہو گئے۔

امریکی معاشرہ کی اس اخلاقی بدحالی کا اندازہ امریکی صحافی فریڈ کوک کی تصنیف ''بدعنوان معاشرہ'' اور ممتاز امریکی مصنف ڈائی سن کارٹر کی کتاب ''گناہ اور سائنس'' سے لگایا جاسکتا ہے۔یہ دونوں مصنفین اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرف مذہبی رہنماؤں کی وعظ ونصیحت اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

''مغربی مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی معاشرہ بدترین اخلاقی بحران اور اعلی انسانی اقدار کی توڑ پھوڑ کا شکار ہے۔وہ اس عظیم تباہی سے بچنے کی فکر میں ہیں جو ان سب کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے۔لیکن انہیں کوئی راہ نجات دکھائی نہیں دے رہی۔صدیوں کے غور وفکر سے بنایا گیا قانون بے بس اور غیر موثر ہو گیا ہے۔'' (۳)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مغربی تہذیب کی پیروی کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اجتماع ومعاشرت اور سوشل زندگی میں مغربی طریقوں کی پیروی ان کے اصول زندگی، طرز معاشرت کو قبول کر لینے سے اسلامی معاشرے میں بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔اس وقت مغرب ایک اخلاقی جذام میں مبتلا ہے جس سے اس کا جسم برابر کٹتا اور گلتا چلا جا رہا ہے اور اب اس کی عفونت پورے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے۔اس تقریبا لاعلاج مرض جذام کا سبب اس کی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انارکی ہے جو بہیمیت اور حیوانیت کی حدود تک پہنچ گئی ہے۔لیکن اس کیفیت کا بھی حقیقی اور اولین سبب عورتوں کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی، مکمل بے پردگی، مرد وزن کا غیر محدود اختلاط اور شراب نوشی تھی۔

کسی اسلامی ملک میں اگر عورتوں کو ایسی ہی آزادی دی گئی، پردہ یکسر اٹھا دیا گیا، دونوں صنفوں کے اختلاط کے آزادانہ مواقع فراہم کئے گئے مخلوط تعلیم جاری کی گئی تو اس کا نتیجہ اخلاقی انتشار اور جنسی انارکی، سول میرج، تمام اخلاقی و دینی اصول سے بغاوت اور بالاختصار اس اخلاقی جذام کے سوا کچھ نہیں جو مغرب کے ٹھیک انہی اسباب کی بنا پر لاحق ہو چکا ہے۔ان اسلامی ملکوں میں جہاں مغربی تہذیب کی پر جوش نقالی کی جا رہی ہے اور جہاں پردہ بالکل اٹھ گیا ہے اور مرد وزن کے اختلاط کے آزادانہ مواقع حاصل ہیں، پھر صحافت، سینما، ٹیلی ویژن، لٹریچر اور حکمران طبقہ کی زندگی اس کی ہمت افزائی بلکہ رہنمائی کر رہی ہے، وہاں اس جذام کے آثار وعلامات پوری طرح ظاہر ہونے لگی ہیں، اور یہ قانون قدرت ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔'' (۴)

اس لیے آج ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب اس وقت عالم اسلام اور خصوصا ہمارے ملک کے اندر بسنے والے مسلمانوں میں زہر قاتل کی طرح

---

(۳) پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ایمان واسلام (لاہور: المطبعۃ العربیہ، ۱۹۸۷ء) ص: ۱۰۱، ۱۰۲

(۴) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۴ء) ص: ۲۱۵، ۲۱۶

آہستہ آہستہ سرایت کرتی جارہی ہے۔اسلام پابندی جبکہ مغرب آزادی کا نام ہے،اس لیے وہ جاذب کشش ہے۔مغرب میڈیا کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔میڈیا چینلز اور خاص کر انٹرنیٹ موبائل فون کے ذریعے قوم کی اخلاقیات کو تباہ کر رہا ہے۔فحش بینی اور جرائم کی شرح بڑھ رہی ہے۔کئی ویڈیو فلموں سے لوگ جرم کرنا سیکھ رہے ہیں۔معاشرتی رسوم ورواج اور زندگی گزارنے کے طور طریقے بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔خواتین کا بے پردگی اور عریانیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔خواتین کا لباس غیر ملکی یا مختصر ہوتا جا رہا ہے۔مسلمانوں کو خدا سے دور کیا جا رہا ہے وہ نماز کے وقت بھی بڑی بڑی سکرینوں پر کرکٹ میچ یا فلمیں دیکھتے رہتے ہیں۔ہمارے بعض تعلیمی اداروں میں بھی برے اخلاق کی پرورش ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت چند اچھے اقدامات بھی کرتی رہتی ہے۔مثلاً فحش بینی پر مبنی ویب سائٹس کو بند کیا گیا ہے۔انڈین چینلز اور فلموں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔اس مرتبہ ویلنٹائین ڈے کی تشہیر پر پابندی لگا دی گئی ہے۔مولانا طارق جمیل جیسے اصلاحی عالم دین کے بیانات سرکاری ٹی وی سے نشر کیے جاتے ہیں۔لیکن مزید اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔

لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ عوام مغربی فکر اور فلسفے کو سمجھ کرا سکے پر فریب نعروں اور اصطلاحات میں کھونے کی بجائے ان کا اسلام کے ساتھ موازنہ کریں اور پھر اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں۔ہم ایک دین کے پیروکار ہیں۔ہمارے مذہب نے ہمیں کچھ اقدار اور روایات کا امین بنایا ہے۔مغرب کے ہاں جو فیشن اور لائف سٹائل ہو وہ شاید ہمارے ہاں کفر،گناہ کبیرہ یا حرام ہو۔علماء کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اس تہذیب کا تعارف حاصل کریں کیونکہ اس کی برائیوں کا پتہ ہوگا تو ان کے روک تھام کا انتظام ممکن ہوگا۔لہذا یہاں ہم ان محرکات کا جائزہ لیں گے جو ہمارے معاشرے میں اخلاق حسنہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں اور ان کا سدباب بھی پیش کریں گے تاکہ ہماری اسلام کے مطابق اخلاقی اور روحانی نشوونما ہو سکے۔

مغربی تہذیب کا کوئی نظریہ نہیں ہے،یہ حالات اور مفادات کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔لیکن اسلامی تہذیب نظریہ اسلام کی علمبردار ہے جس میں انسانی زندگی کے جامع اصول بیان کیے گئے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی نظریات اور اسلام کی بیان کردہ اخلاقی اقدار کو معاشرے میں فروغ دیا جائے۔اسلامی نظریہ حیات کو فروغ دینے سے یہ بے بنیاد تہذیب اپنی موت آپ مر جائے گی۔دنیا میں تقریباً ہر مذہب نے سیکولرازم کے آگے ہتھیار ڈال دیے صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اس کا مقابلہ کر رہا ہے اور ان کو اصل خطرہ مسلمانوں سے نہیں بلکہ ان کے مضبوط عقائد اور نظریات سے محسوس ہو رہا ہے۔اس لیے ہمیں اپنے ایمان اور صحیح عقائد پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔اسلام کو اس کی اصل روح کے ساتھ بیدار کیا جائے۔جب آپ کو اپنے مذہب کے بارے میں صحیح علم نہیں ہوگا تو گمراہی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

مذہب سے آزادی اس تہذیب کا خاصہ ہے۔مذہب سے آزادی ہی انسان کی اخلاقی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے،کیونکہ سب سے پہلے مذہب نے اخلاق کا نام لیا۔اللہ تعالی خود اعلی اخلاقی صفات کے مالک ہیں۔اللہ تعالی کے بھیجے گئے تمام انبیاء اخلاقی لحاظ سے مثالی انسان تھے۔آج بھی دنیا میں اخلاق کی کہیں بھی کوئی رمق باقی ہے تو وہ انہی انبیاء کی وجہ سے باقی ہے۔امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ اخلاق کے بلند درجہ پر فائز ہیں اور آپ نے عملی طور پر معاشرے میں اعلی اخلاقی صفات پیدا کر کے دکھائیں۔چنانچہ آپ کے تربیت یافتہ خود بھوکے رہتے ہیں اور دوسروں کو کھانا کھلا کر ایثار کا عملی مظاہرہ پیش کرتے ہیں۔خود زخمی حالت میں پیاسے رہتے ہیں اور دوسروں کی پیاس کو محسوس کر کے اپنی پیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔اسلامی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ اخلاق کی تعلیم پر مشتمل ہے۔اس لیے مذہب سے فرار کی راہ اختیار کر کے اعلی اخلاقیات کو معاشرے میں فروغ نہیں دیا جا سکتا۔

پھر مذہب کو صرف اخلاقیات پر ہی محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مذہب اسلام چار چیزوں،عقائد،عبادات،معاملات اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔لہذا اسلام میں پورے کا پورا داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔انسان کے پاس اگر اللہ تعالی کی طرف سے ہدایت اور رہنمائی نہ ہو تو اس کی گمراہی واضح ہے۔اللہ تعالی اور اسلام ہی انسان کو صحیح رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔بہت سی گمراہیوں سے بچاتے ہیں۔اس لیے اپنے مذہب کی حدود وقیود میں رہ کر سوچنا چاہیے۔اللہ تعالی سے بڑھ کر ہمارا کوئی خیر خواہ نہیں اور شیطان تو ہمارا واضح دشمن ہے جس کی دشمنی میں کوئی شک نہیں اور وہ انسان کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتا۔دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اخلاق کی بھی وہ اپنے انداز فکر سے تشریح کرتے ہیں مثلاً مساوات کا وہ مفہوم مراد نہیں جو اسلام نے

ہمیں دیا ہے بلکہ وہ اپنی طرف سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

مغربی ممالک میں بسنے والوں کو مکمل شخصی آزادی بھی حاصل ہے۔ایک آدمی جو چاہے لکھ سکتا ہے، بول سکتا ہے۔کام جو چاہے کر سکتا ہے۔البتہ کسی دوسرے کی آزادی میں وہ مخل نہ ہو۔اس پابندی کے سوا اخلاقایا مذہبا اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔اس مکمل شخصی آزادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی طلبہ وطالبات جنسی عمل کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ بچے اگر بالغ ہو جائیں تو ان پر والدین کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔تحریر کی آزادی کے نتیجے میں کتابوں، رسالوں اور فلموں وغیرہ میں فحاشی اور عریانی اور اخلاق باختگی کا ایک طوفان آ گیا ہے۔آزادی اظہار رائے کے نام پر اللہ کے معصوم پیغمبروں کی توہین کی جارہی ہے اور ان کے گستاخانہ خاکے بنائے جانے کی مذموم حرکت کی جارہی ہے۔ہم جنس پرستی اور ہم جنسوں کی شادیاں ہو سکتی ہیں۔مغربی تہذیب نے عفت وعصمت کے تصور کو دھندلا کر کے رکھ دیا ہے۔زنا، بے حیائی اور عریانیت عام ہے جس نے نظام عفت وعصمت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

مغربی تہذیب میں جو چیز اسلام سے زیادہ متصادم ہے وہ یہی جنسی آزادی ہے۔اسلام نے جنسی آسودگی کا جو نظام دیا ہے اسے اپنی صحیح روح کے ساتھ اپنانے کی ضرورت ہے۔اسلام لڑکی یا لڑکے کے بالغ ہونے پر ان کی فوراً شادی کرنے کا حکم دیتا ہے اور ان سے صادر ہونے والے گناہ کو والد کے ذمہ ڈالتا ہے۔۔اللہ تعالی نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں بے حیائی بھی شامل ہے جس کی تفصیل فحشاء کے ضمن میں گزر چکی ہے۔مسلمان کو آزادی حدوداللہ کے اندر رہتے ہوئے دی گئی ہے۔زنا ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔لواطت کو سخت ناپسند اور قوم لوط کی ہلاکت کا سبب قرار دیا گیا ہے اور فاعل ومفعول کو قتل کرنے کی سزادی گئی ہے۔اس طرح ہم جنس پرستی کے ذریعے عذاب الٰہی کو دعوت دی جاتی ہے۔

اسلام نے عفت اور عصمت کا نظام فراہم کیا ہے۔مرد کو چار شادیوں تک کی اجازت دی گئی ہے لیکن جنسی تسکین صرف بیویوں تک محدود کی گئی ہے۔ پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔حیاء کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔فحش بینی کو آنکھ کا زنا قرار دیا گیا ہے۔مومنوں کو زنا کے قریب نہ جانے کا حکم دیا گیا ہے۔لہذا ان اسباب اور ذرائع سے بھی رکنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کو زنا کے قریب لے جاسکتے ہیں۔

مغربی تہذیب صرف مادہ پرستی پر مبنی ہے اور روحانیت سے خالی ہے۔لوگ صرف نام کے عیسائی ہیں۔ان کا اصل ایمان مادہ پر ہے۔مادہ ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے جس کی وجہ سے ان میں لذت پرستی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ان کا مقصد زندگی دولت دنیا کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنا ہے۔اس لیے ان کو روحانی سکون میسر نہیں ہے اور یہ بے سکونی انہیں مذہب خصوصاً اسلام کی طرف لا رہی ہے۔

کسی معاشرت یا تہذیب میں انسانی زندگی مادیت (دنیاوی ضروریات) اور روحانیت (انسانی روح کی ضروریات اور اس کے تقاضے) کے اجتماع کا نام ہے۔مادیت اور روحانیت کا متناسب امتزاج ہی معتدل اور متوازن تہذیب کو جنم دیتا ہے۔اسلامی تہذیب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ مادیت اور روحانیت کا حسین اور متناسب امتزاج پیش کرتی ہے۔اس میں دونوں حیرت انگیز طور پر متوازن ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم مادیت کے ساتھ ساتھ روحانیت بھی اپنے اندر پیدا کریں۔

مغربی تہذیب انسان کی خاندانی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔بالغ ہونے کے بعد لڑکے اور لڑکیاں آزاد ہوتے ہیں۔ان پر والدین کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔اکثر والدین کو چھوڑ کر علیحدہ زندگی گزارتے ہیں۔ بڑھاپے میں والدین تنہا رہ جاتے ہیں اور اولڈ ہاؤسز میں وقت گزارتے ہیں۔شادی کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔شادی کے بندھن کے بغیر لڑکے اور لڑکیاں زندگی بسر کرتے ہیں جسے ان کی اصطلاح میں دوستی کہا جاتا ہے جب چاہیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔مغرب میں خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے طلاقوں کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے بچوں کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔زنا عام ہو رہا ہے۔

اسلام نے خاندانی نظام کو مستحکم کیا ہے اور نکاح عائلی زندگی کی جائز بنیاد فراہم کرتا ہے۔طلاق کو ناپسند کیا گیا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں نکاح کو رواج دیا جائے۔نکاح کو آسان کرنے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے ہاں زنا آسان ہو رہا ہے اور نکاح کو مشکل کیا جا رہا

ہے۔مناسب مہر اور مناسب شرائط کے ساتھ نکاح کو عام کرنا چاہیے۔

اس تہذیب کو ہم پر علمی برتری حاصل ہے۔مغربی ممالک کو تمام علوم وفنون اور سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی حاصل ہے۔وہ علمی تحقیق کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ہم علم حاصل کرکے اس تہذیب کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ہم تعلیم کے شعبہ پر قومی آمدنی کا اڑھائی فیصد خرچ کررہے ہیں جو شرمناک حد تک کم ہے۔

ہمیں قرضوں کی لعنت سے چھٹکارا پانا چاہیے۔معاشی طور پر مقروض ہونے کی وجہ سے سود عام ہوگیا ہے جو کئی اخلاقی بیماریوں کا باعث ہے ۔اسلام نے سود کو حرام اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اعلان جنگ قرار دیا ہے۔لیکن اس صریح حکم کی خلاف ورزی کرکے ہم پچھلے پچاس سال سے سودی قرض لے رہے ہیں۔ایک بھکاری قوم اپنی تہذیب کی کیسے حفاظت کرے گی؟ وہ مغربی تہذیب کا کیسے مقابلہ کرے گی؟

بےعقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب وروح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔اس کا تعلق روح کی بجائے صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے جو قوم کی تباہی و بربادی کا سبب ہے۔بےعقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی حقیقی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔عملی زندگی کے بارے میں ان کے سطحی علم سے کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔قومی نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔سقوط ڈھاکہ کا ایک بنیادی سبب وہ غلط اور بےعقیدہ نظام تعلیم تھا جس نے ایک مسلمان قوم کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا کردیا ۔ماہنامہ بینات کراچی کی ایک رپورٹ کے مطابق مدارس میں ستر فیصد سے زائد ہندو اساتذہ تعلیم دینے پر مامور تھے۔بےعقیدہ استاد کیسے عقیدہ کی تعلیم دیں گے۔چوبیس سال کے اس عرصہ میں قائم ہونے والی حکومتوں نے بھی صحیح اسلامی نظام تعلیم رائج نہیں کیا۔اگر تعلیم کی طرف توجہ کی جاتی اور صحیح اسلامی نظام تعلیم رائج کیا جاتا تو یہ برادن ہمیں نہ دیکھنا پڑتا۔

اس غلط نظام تعلیم کی وجہ سے ترانوے ہزار فوج کو ہندوؤں جیسی ذلیل قوم کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے،جن کی پوری تاریخ ہتھیار ڈالنے کے تصور سے خالی ہے۔اس غلط نظام تعلیم کی وجہ سے انہیں صرف پاکستان سے نفرت ہی نہیں ہوئی بلکہ انہیں اسلام کی بجائے سیکولرازم پسند آنے لگا۔

بےعقیدہ تعلیم کی ہلاکت خیزیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔یہ ہم ہی نہیں کہتے بلکہ وہ لوگ بھی اس غلط نظام تعلیم سے اس قدر بےزار ہوچکے ہیں جنھوں نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ نظام تعلیم ہمارے ملک میں جاری کیا تھا۔

''سر والٹر موبرلے'' نے برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعے پر مشتمل اپنی کتاب ''یونیورسٹی میں بحران'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہوجاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا کہ وہ عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں۔تعلیمی جانب داری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں اور سوچ بچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہوجاتے ہیں۔اسی طرح وہ لادینیت کو بھی تسلیم کرلیتے ہیں اور یہ اس لیے کہ تعلیم کے مختلف اجزا میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا۔ساری تعلیم کے بعد وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔''

پروفیسر ایچ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں :

> ''تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کرلیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے ۔نتیجۃً پڑھے لکھے افراد بھی ایمان سے زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطہ

---

(۵) ڈاکٹر قاری فیوض الرحمن ،اسلام کا نظام حیات (لاہور:نعمانی کتب خانہ،۱۹۸۸ء) ص:۲۵۶-۲۵۸

نظر سے عاری ہیں۔''(۵)

غرض مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے۔ اخلاقیات کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ درسگاہوں میں عقائد کی پختگی کی تعلیم دی جائے۔ خاص کر عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت کی تعلیم جو اخلاقی نشوونما کر سکتی ہے وہ دنیا کی بڑی بڑی عصری دانشگاہیں بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے اسلامی نظام تعلیم کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامیات کی تعلیم کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس تعلیم پر عمل کرنے اور مسلمانوں کو اپنے عمل سے اخلاقیات کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ بے عقیدہ تعلیم وہ مثالی انسان معاشرے کو فراہم نہیں کر سکتی جو ایمان اور اسلام پر مبنی تعلیم معاشرے کو فراہم کر سکتی ہے۔ دار ارقم اور دار الصفہ سے تعلیم پانے والے افراد اس کی زندہ وجاوید مثال ہیں جن کے کردار کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

مغربی مفکرین کو اخلاقی بحران سے نکلنے کے لیے کوئی نجات کا راستہ نظر نہیں آتا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور بیداری کی لہر نے اہل مغرب کو چونکا دیا ہے اور ان کے بعض دانشور مجبوراً یا خوشی سے اسلام کی حقانیت کے معترف ہو گئے ہیں۔ لیکن اخلاقی بحران اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی سے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسلام کو قبول کر لیں۔ اللہ کی کتاب اور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسانوں کی اخلاقی نشوونما کر سکے اور معاشرے کو اخلاق کے لحاظ سے اعلی انسان فراہم کرے۔ مسلمانوں کو کسی جدید دنیا اور جدید تہذیب کے پرفریب نعروں میں کشش محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر سختی سے کاربند رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم ایک بے مثال تہذیب کے وارث ہیں جس سے دنیا کی بے شمار اقوام متاثر ہوئی ہیں۔ پختہ عقائد اور ہر لحاظ سے مکمل تعلیم آج بھی انسانوں کی فکری رہنمائی اور ان میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہمیں کسی غیر مسلم تہذیب کی اندھی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ غیر مسلموں کو ہماری پیروی کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالی کے احکامات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ماننے اور ان پر عمل کرنے سے پہلے بھی انسانوں نے کامیابی حاصل کی ہے اور اب بھی دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

خلاصہ بحث

اخلاق سے مراد انسان کی پختہ عادات اور باہم بندوں کے حقوق وفرائض ہیں۔اخلاق نفس کی اس ہیئت راسخہ کا نام ہے جس کی وجہ سے اعمال آسانی سے صادر ہوتے ہیں۔اگر اس ہیئت سے ایسے افعال صادر ہوں جو عقلی اور شرعی طور پر پسندیدہ ہوں تو اسے اخلاق حسنہ کہا جاتا ہے اور اگر اس سے صادر ہونے والے اعمال عقل اور شرع کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہوں تو اسے اخلاق رذیلہ کہا جاتا ہے۔فلسفہ میں علم الاخلاق یا اخلاقیات ایک باقاعدہ علم کی حیثیت رکھتا ہے جس پر فلاسفہ یونان اور کئی مسلمان فلاسفہ نے بحث کی ہے۔اخلاقیات کا موضوع انسان کے ارادی اعمال ہیں۔علم الاخلاق دیگر علوم سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب اور مفکرین نے انسانی زندگی میں اخلاق کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کیا ہے۔کون فیوشس ،گوتم بدھ ،بھگوت گیتا ،زرتشت،سقراط،افلاطون اور ارسطو نے انسانی زندگی میں اخلاق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اچھے اخلاق اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔لیکن ان کے پیش کردہ اخلاقی تصورات نامکمل ہیں۔اسلام نے ان کے مقابلے میں اخلاق کا جامع اور وسیع تصور دیا ہے۔اسلام اخلاق حسنہ کو اختیار کر کے اللہ کی محبت حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔انسانی ارادہ عمل کی بنیاد ہے۔قوت نافذہ انسانوں کو گناہ سے بچاتی ہے۔توسط واعتدال پر مبنی یہ دین انسان کو برائی اور اچھائی کا صحیح تصور دیتا ہے۔قرآن وسنت میں اخلاق حسنہ کی فضیلت واہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

اخلاقی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جو اخلاق سے متعلق ہیں۔قرآن مجید میں اچھے اخلاق اختیار کرنے اور برے اخلاق سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔اخلاقی احکام پر عمل کرنے کے لیے بہترین نمونہ حضرت محمد ﷺ ہیں کیونکہ آپؐ اخلاق کے بلند درجہ پر فائز ہیں۔

اردو تفسیری ادب بارہویں صدی ہجری سے لے کر عصر حاضر پر محیط ہے۔یہ تفسیری ادب تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کا حسین امتزاج ہے ۔مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن میں آسان اور بامحاورہ ترجمہ،مسائل سلوک اور اشکالات کا آسان حل پیش کیا گیا ہے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرز پر مولانا ادریس کاندھلویؒ نے تفسیر معارف القرآن لکھی،جس کا ماخذ بیان القرآن کی طرح کئی عربی تفاسیر ہیں۔مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں تفسیر کو عام فہم اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔یہ تفسیر قدیم اور جدید علوم کا حسین امتزاج ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی نے روایتی تفسیری انداز سے ہٹ کر تفسیر تدبر قرآن تصنیف کی۔یہ تفسیر انہوں نے اپنے استاد حمید الدین فراہی کی طرز پر تحریر کی ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر میں جدت پیدا کی ہے۔اردو تفسیری ادب میں اخلاقی احکام کی توضیح وتشریح بڑے جامع اور مدلل انداز میں کی گئی ہے۔

قرآن مجید کے اخلاقی احکام کی تشریح اردو تفاسیر سے کی گئی ہے۔مثلاً صدق کا اطلاق سچے قول اور اس کا کہنے والا سچے دل سے اس کی حقیقت کو مانتا ہو۔صبر نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنے کا نام ہے۔عہد سے مراد وہ کام ہے جو انسان اپنی ذات پر لازم کر لیتا ہے۔اسی طرح شکر کرنا واجب ہے۔معاف کرنے کی ایک حد ہے۔عدل کو قائم کرنا فرض ہے۔

اسی طرح رذائل اخلاق سے متعلق احکام کی تشریح بھی اردو تفاسیر سے کی گئی ہے۔مثلاً فحشاء کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے ۔حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ جھوٹ میں داخل ہے خواہ وہ عقائد فاسدہ،معاملات اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔کسی معصیت یا بے موقع خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں۔کسی پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا واجب ہو اور وہ خرچ نہ کرے تو یہ بخل ہے۔اسی طرح جھوٹے پر لعنت کی گئی ہے۔بخل،غیبت، برے القاب سے پکارنا، بدگمانی وغیرہ حرام ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالی کی رضا، جنت کا حصول، آخرت میں سوال کا احساس وغیرہ انسان کو اچھے اخلاق اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اسلامی عقائد خاص کر عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت انسان میں اعلی اخلاق کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔انسان اللہ جیسے اخلاق پیدا کرے اور اللہ کے رنگ میں رنگ جانے کی کوشش کرے۔فرشتوں پر ایمان انسان میں نیکی کی تحریک پیدا کرتا ہے کہ میرے اوپر دو نگران مقرر ہیں جو میرے اعمال لکھ رہے ہیں۔نماز بے

حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔زکٰوۃ کے ذریعے مال پاک کیا جاتا ہے۔روزہ بھی انسان میں تقویٰ اور ضبط نفس پیدا کرنے جیسے مقاصد رکھتا ہے۔اس طرح عبادات بھی انسان میں نیکی کی تحریک پیدا کرتی ہیں۔یہ ایک آفاقی اصول ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے اور قیامت کے دن ہمیں اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔اس دن کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔

انسان میں موجود نفس امارہ اسے برائیوں پر اکساتا ہے۔نفس لوامہ کی آواز کو سن کر اور تعلق باللہ، مجاہدہ نفس اور توبہ وغیرہ کے ذریعے اسے رذائل اخلاق اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔شیطان انسان کو برائی اختیار کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرکے اور تعلق باللہ کو مضبوط کرکے برائیوں سے بچنا ممکن ہے۔نفاق جیسے دل کا سب سے بڑا مرض کہا جاتا ہے انسان میں برے اخلاق کو جنم دے کر اس کی پرورش کرتا ہے۔اسی طرح عقیدہ آخرت کا انکار بھی انسان کو رذائل اخلاق اختیار کرنے کے علاوہ اس کی زندگی کو بے مقصد بنا دیتا ہے۔ایمان اور عمل صالح میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کے اندر برے اخلاق کی جڑ کاٹ سکیں۔

اس وقت افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں اخلاقی فساد بپا ہو چکا ہے۔اسلام اخلاق کے متعلق عمدہ تعلیمات دیتا ہے لیکن ہم ان تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔اسلام کا صحیح تصور مفقود ہو رہا ہے، میڈیا اخلاق کی تباہی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، بے حیائی اور برائی عام ہو رہی ہے۔مغربی تہذیب کی تقلید نے اخلاق پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔اس صورتحال میں ہمیں اچھے اخلاق پڑھانے اور سکھانے کی ضرورت ہے۔منبر و محراب سے اخلاق کا درس عام کرنے اور تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کی تعلیم کو عام کرنے سے اس فساد کی اصلاح ہو سکتی ہے۔یہ صرف حکومت کا فرض نہیں ہے بلکہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہم سب کا فرض ہے کہ اچھے اخلاق کو معاشرے میں فروغ دیا جائے۔

مغربی تہذیب لادینیت، مادیت، میڈیا اور رائے کی آزادی، آزاد خیالی، فحاشی و عریانی وغیرہ پر مشتمل ہے۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ تہذیب ایک زہر قاتل کی طرح مسلم معاشروں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جا رہی ہے۔کئی مسلمان متجددین اسلام کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔مسلمان اس تہذیب میں کشش محسوس کر رہے ہیں۔لیکن دوسری طرف خود مغربی مفکرین بھی اخلاقی بحران کا حل تلاش کر رہے ہیں اور اس کا مکمل اور پائیدار حل اسلام کی قبولیت سے وابستہ ہے۔انسانوں نے پہلے بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے کامیابی حاصل کی ہے اور آج بھی دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے وابستہ ہے۔

سفارشات

۱۔علم تفسیر ہی وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی کے مقدس کلام کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے ۔ ہر مسلمان کے لیے قرآن کو سمجھنا ضروری ہے۔اس لیے سکول، کالجز اور یونیورسٹی کی سطح پر تفسیر کی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔عصر حاضر میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا قرآنی آیات کی تفسیر کو پہچانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ریڈیو پاکستان پر مفتی محمد شفیعؒ کی یہی وہ کوشش تھی جو معارف القرآن جیسی نادر اور فقہی تفسیر کا سبب تالیف بنی۔لہذا الیکٹرانک میڈیا پر قرآن مجید کے دروس کا سلسلہ ہونا چاہیے جس میں علمائے کرام قرآن مجید کی تفسیر بیان کریں۔ مذاکرات میں ایک آیت پر مختلف تفسیری آرا کا جائزہ لیا جائے۔

۳۔الیکٹرانک میڈیا ایسی آیات کو ترجمے اور مختصر تفسیر کے ساتھ پیش کرے جو اخلاق سے متعلق ہوں۔

۴۔نجی ٹی وی چینلز اور غیر سرکاری میڈیا کو پابند کیا جائے کہ وہ مناسب وقت اخلاقیات سے متعلق پروگرامز کو دے۔

۵۔حکومت اخلاقیات سے متعلق لٹریچر کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرے۔اخلاقیات سے متعلق لٹریچر عام کرنے سے معاشرے کو اخلاق سے آگاہی حاصل ہوگی جس کے نتیجے میں قوم کا اخلاق درست ہوگا۔

۶۔اخلاقی کہانیوں پر مشتمل بچوں کے لیے پروگرامز پیش کیے جائیں۔

۷۔اخلاق کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

۸۔ ہر سطح پر اخلاق سوزی کی مذمت کی جائے اور اخلاق سوزی پر مبنی پروگرامز کو بند کیا جائے۔

۹۔غیر نصابی سرگرمیوں میں اخلاق باختگی کو ممنوع قرار دیا جائے۔

۱۰۔منبر ومحراب کے وارث علماء کرام اپنے خطبات جمعہ وعیدین اور عوامی اجتماعات میں اخلاقیات کا درس دیں۔

۱۱۔اصحاب اقتدار کے لیے صادق اور امین ہونا ضروری قرار دیا جائے اور انہیں اخلاقی لحاظ سے خلفائے راشدین کی طرح ایک مثالی انسان ہونا چاہیے۔

۱۲۔سیرۃ النبی ﷺ کے مطالعے کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔اخلاق نبویؐ کے لحاظ سے سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ ،قاضی سید محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی رحمت اللعالمین، خالد علوی کی انسان کامل وغیرہ کا مطالعہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۳۔مصنوعات کی تشہیر میں اخلاقی پہلو مدنظر رکھا جائے۔

۱۴۔مسلم معاشروں سے شرک کا خاتمہ کیا جائے۔

۱۵۔اسلامی عقائد کو ان کی روح کے ساتھ بیدار کیا جائے۔

۱۶۔اساتذہ، علماء، مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں کو مثالی اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیونکہ لوگ ان سے اخلاق سیکھتے ہیں۔

۱۷۔غیر ملکی میڈیا کی اندھی تقلید کی بجائے اپنی اسلامی اخلاقی اقدار پر عمل کیا جائے۔

۱۸۔فرض عبادات کی پابندی کریں تاکہ معاشرے میں اچھے اخلاق فروغ پائیں۔

۱۹۔نماز کو عام کرنے سے بے حیائی کا خاتمہ ممکن ہے۔

۲۰۔عالمی سطح پر زنا اور لواطت کو سنگین جرم قرار دینے کی ضرورت ہے۔

۲۱۔صرف وعظ و نصیحت سے اخلاق درست کرنا ممکن نہیں۔اعلی اخلاقی نمونہ اور جرم وسزا کے قانون کو موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

۲۲۔انٹرنیٹ کے ذریعے عام ہونے والی بے حیائی اور فحش بینی کو عالمی سطح پر روکنے کی ضرورت ہے۔

۲۳۔اخلاق کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

۲۴۔اردو یا اسلامیات کی کتاب کا ایک باب اخلاقیات سے متعلق ہونا چاہیے۔

۲۵۔ملکی تعلیمی اداروں میں براور تقوی کو سکھانے اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۶۔جرائم پر بنائی گئی فلموں کو بین کیا جائے۔

۲۷۔وہی غیر ملکی اخلاقی اقدار اختیار کی جائیں جن کو اختیار کرنے کی اجازت ہمارا دین دیتا ہے۔

۲۸۔اسلام کے بیان کردہ خیر وشر کے تصور کو عام کیا جائے۔

۲۹۔مادیت کی بجائے روحانیت کو عام کیا جائے۔

۳۰۔تعلیم اور علمی تحقیق کا ملکی بجٹ بڑھانے کی ضرورت ہے۔

۳۱۔ڈرامہ سیریلز میں خاص کر اخلاقیات اور اسلامی معاشرے کی اخلاقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم کا اخلاق تباہ نہ ہو۔

فہرست آیات

ان هذا الا خلق الاولين۔ 18

وانك لعلى خلق عظيم۔72,71,18

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔29

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔30

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْن۔30

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُم۔30

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًاوَّلَا تَفَرَّقُوْا۔30

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْن۔30

وَّبِا لْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى۔30

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُسُلِه۔ 31

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا۔31

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ۔9,31,123,130,154,169

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ ۔32

كُوْنُوا مَعَ الصّٰدِقِيْن۔34

يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاقُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔34

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔35

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔36

وهد ينٰه ا لنجد ين36

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا36

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاوَعَمِلُواالصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ43

۔مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰه44

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰه44

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْن44

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰه44

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُو ءِ تِه 45

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى 45

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَة۔45

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ48

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَة49

ولو القىٰ معاذيره49

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ51

ولاتكسب كل نفس الا عليها53

وَلَا تَزِرُوَازِرَةٌوِّزْرَ اُخْرٰى 53

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ53

وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِه53

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ O54

وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِO وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْه54

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِم56

رِجَا لٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰه56

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاقُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا57

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا 66

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَا اَخْطَاتُمْ بِهٖ67

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ67

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ67

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ67

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ67

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْن67

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ67

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْن67

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْن67

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُم68

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْن72

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ74

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ74

لَقَدْ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ76,81

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْر77

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْن 79

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ81

لَقَدْ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ 81

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ82

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ 96

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّا رٍ 96

يٰۤاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِ قِيْنَ110

الزى جاء بالصدق ،صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ111

يٰۤاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوااللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا 112

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوااسْتَعِيْنُوْا بِا لصَّبْرِ 114

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْس115

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا 118

وَتَوَاصَوْا بِا لْحَقِّ وَتَوَاصَوْابِالصَّبْر117

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْد120

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلا 121

انما يوفى الصبرون اجرهم بغير حساب119

وبعهد الله اوفوا122

يٰۤاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاكُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰه124

يٰۤاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاكُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ127

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ128

يٰۤاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاكُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰه

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًالِّتَكُوْنُوْاشُهَدَآءَ 125

يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰب126

وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ 130

وَاَنْفِقُوْا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ131

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰه يَرٰى131

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِه132

يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًامِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ132

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآء133

اِدْفَعْ بِالَّتِى هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَاالَّذِى بَيْنَك134

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ 134

وَلَا يَاْتَلِ اُولُواالْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَة133

وَقَالُواالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰنَا لِهٰذَا136

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ136

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِىْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰق136

وَمَنْ يَّشْكُرْفَاِنَّمَايَشْكُرُ 136

اَنِ اشْكُرْلِىْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَىَّ الْمَصِيْرُ137

وَكَانَ تَقِيًّاo وَّبَرًّابِوَالِدَيْهِ 139

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّونَ139

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ 139

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى143

سيذكر من يخشى 142

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْ مًا 140

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا140

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا140

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ140

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى141

وَلَو اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوا وَاتَّقُوْا141

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ اَتْقٰكُمْ142

يااَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوااللّٰهَ حقَّ تُقَاتِه142

فَاتَّقُوااللّٰه وَاَطِيْعُون142

اولٰئِك كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَل142

وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَالزَّادِالتَّقْوٰى142

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْامِنْ اَبْصَارِهِمْ 144

وَقُلْ لِّلْمُؤمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ146

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا 151

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُم152

وَاِذَاحَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى 152

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ152

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ 152

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَة152

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَاللّٰهُ بِه155

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّه155

واعلموا انما غنمتم من شىء155

وقضٰى ربك الا تعبدوا الا اياه 156

ربكم اعلم بما فى نفوسكم 156

لا تقتلوا اولادكم156

اما یبلغن عند ك الكبر احدهما او كلاهما156

فَاٰتِ ذَالْقُرْبیٰ حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ 235,156

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّارَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ 158

یٰٓاَ یُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُم159

یٰٓاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْل160

مَنْ ذَالَّذِی یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا160

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ162

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرضَاتِ اللّٰه162

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَار 163

اِنَّ اللّٰهَ یَامُرُكُمْ اَنْ تُوءَ دُّواالْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَهْلِهَا164

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ166

اِنَّمَا یَامُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ 169

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَن170

وَلَاتَقْرَبُوا الزِّنیٰٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً 170,171

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَا مُرُ بِالْفَحْشَآءِ171

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْر173

اِنَّ اُلْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْن 176

وَلَا تُسْرِفُوْااِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْن 178

وَلَایَحْسَبَنَّ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰه179

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْل180

اِنْ یَّسْئَلْكُمُوْهَا فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا181

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْافِیْ سَبِیْلِ اللّٰه181

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰیo وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی182

oفَسَنُیَسِّرُهٗلِلْعُسْرٰی oوَمَا یُغْنِی عَنْهُ مَالُهٗٓ 182

وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُون 183

وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ 183

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ186

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ 187

وَلَا تَقْتُلُو االنَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَق188

وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا192

لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ192

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنّ195

وَلَا تَجَسَّسُوْا197

وَاَوْفُواالْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ202

وَیْلٌ لِلْمُطَفِّفِیْنَ204

الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْ فُوْنَ204

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْا هُمْ یُخْسِرُوْن204

وَاَوْفُو الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْم204

لَاتَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا205

یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِا للَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ207

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا209

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَد تُّمْ210

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِی نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اِنْكَاثًا211

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَیْنَكُمْ213

وَلَا یَاتِلَ اُولُوا الْفَضْلَ مِنْكُمْ وَالسَّعَة207

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ 214

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا215

یشترون بعهدالله وایمانهم ثمنا قلیلا 207

اَتَاخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا215

وَاَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ 216

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَج224

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْل224

لوَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰه226

یٰٓاَ یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ228

وَالَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ230

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْرِی نَفْسَهٗ233

لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ234

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰه235

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِم236

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰی236

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی 236

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی236

اِلَّاابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی236

وَلَسَوْفَ یَرْ ضٰی236

قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ 237

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُه237

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ237

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ238

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ238

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ 239

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ239

کیا تم نے یہ خیال کرلیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ241

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا242

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ 243

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ 244

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا 244

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا244

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَo عَمّا كَانُوْا يَعْمَلُوْن245

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ 247

لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْم247

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِم247

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا 247

وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ248

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْم250

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِح250

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰه251

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْن252

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَo كِرَامًا كَاتِبِيْنَ oيَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْن253

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ254

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا254

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرُ257

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا262

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ264

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْن264

قد افلح من تزکی 265

قدافلح من زکّٰها265

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْن265

اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْن265

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ266

لِتُكَبِّرُوااللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُم266

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ266

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَااكْتَسَبَت270

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ271

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْن271

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَاد272

هَلْ جَزَآءُ الْاِحسَانِ اِلَّاالْاِحْسَانُ272

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِن273

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُم274

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا274

وَاِنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى275

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى275

اتقوااللہ و کونوا مع الصدقین 276

ولتنظر نفس ما قدمت لغد276

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِم278

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ 276

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُه279

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ280

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ281

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُم282

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْن282

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى 283

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ له شَيْطٰانًا283

وَاِمَّايَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰه283

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰه284

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا285

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى286

لَا يَسْتَاْ ذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِر286

فہرست احادیث

اَلمُؤمِنُ الْقَوِیُّ خَیْر وَاَحَبّ اِلَی اللّٰہِ مَنَ المُؤمِنُ الضَّعِیْف 34

مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃَ اللّٰہِ ھِیَ العُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ44

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ ،وَاِنَّمَا لِاِمْرِیءٍ مَّا نَوَی 45

اِنَّ اللّٰہ کَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَات46

اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہ47

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی صَدْرِکَ48

یَا وَابِصَۃُ اسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَاسْتَفْتِ نَفْسَکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ49

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَاَخَطِیْئَۃً نُکِتَتْ فِی قَلْبِہٖ50

اِذَا سِرَّتک حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَ نْتَ مُؤمِن51

مَنْ حَجَّ لِلّٰہِ فَلَمْ یَرْفَثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیُوْمٍ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ54

کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ 57

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاق 10,60

رَاَیْتَہٗ یَامُرُ بِمَکَارِمَ الْاَخْلَاق 60

واھدنی لا حسن الاخلاق لا یھدی لا حسنھا الا انت61

خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ61

مَا شَیءٌ اَثْقَلُ فِی مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ61

اَکْمَلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا61

فَاِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الْخُلُقِ لَیَبْلُغُ بِہٖ دَرَجَۃَ صَاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلٰوۃ62

اِنَّ الْمُؤمِنَ لَیُدْرِکُ بِحُسْنِ خُلُقِہٖ دَرَجَۃَ الصَّائِمِ الْقَائِم62

اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحَاسِنَکُم اَخْلَاقًا62

اِنَّ مِنْ اَخْیَرِ کُمْ اَحْسَنَکُمْ خُلُقًا62

مَا خَیْرَ مَا اُعْطِیَ الْاِنْسَانُ؟قَالَ خُلُقٌ حَسَن62

اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اِلَیَّ وَ اَقْرَبِکُمْ مِنِّی مَجْلِسًا یَوْ مَ الْقِیَامَۃِ اَحَاسِنَکُمْ اَخْلَاقًا63

ادبنی ربی تادیبا حسنا73

کَلَّا وَاللّٰہِ مَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ73

مَا کَانَ اَحَدُ اَحْسَنَ خُلُقًا مِنْ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ73

فَاِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ الْقُرْآن73

فَصَامَ حَتّٰی بَلَغَ الْکَدَیْدَ اَفْطَرَ ،فَاَفْطَرَ النَّاسُ78

فَاِنَّہٗ لَمْ یَخْفَ عَلَیَّ مَکَانُکُمْ لٰکِنِّی خَشِیْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَیْکُمْ79

لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِی لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ عِنْدَ کُلِّ صَلٰوۃٍ79

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَحِیْمًا رَقِیْقًا81

ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ وَضَعَھَا اللّٰہُ فِی قُلُوْبِ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادِہٖ81

اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتیں تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔126

من سرّہ ان یُشرفَ له البنیان و ترفع له الدرجٰت فلیعف عن من ظلمه ویعط من حرمه ٗویصل من قطعه 133

آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے 144.

یا علی لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولی ولیست لك الاٰخرة145

ان النظر سهم من سهام ابلیس145

۔ما من مسلم ینظر الی محاسن امراة اول مرة ثم یغض بصره الا احدث الله له عبادة یجد حلاوتها 145

فَعَرَفَنِی حِیْنَ رَاٰنِی وَکَانَ قَدْ رَاٰنِی قَبْلَ الْحِجَابِ فَاسْتَیْقَظْتُ146

نبیؐ نے اپنی بیویوں سے فرمایا ابن ام مکتوم سے پردہ کرو۔147

۷ھ میں حبشیوں کا وفد مدینہ آیا147

تم ابن ام مکتوم کے ہاں رہو وہ اندھے آدمی ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکو گی 147.

ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط 149

احفظ عورتك الا من زوجتك او ملکت یمینك149

یا اسماء ان المرأة اذا بلغت المحیض لم یصلح لها ان یرٰی منها الا هذا150

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه163

اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ ثَلَاثًا173

عُدِلت شهادة الزور بالاشراك باللّٰہِ174

اتدرون ماالغیبة214

سَدِّدُوْ ا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا فَاِنَّہٗ لَنْ یُّدْخِلَ الْجَنَّۃَ اَحَدًا عَمَلُہٗ240

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا279

مَا تَحْتَ ظِلِّ السَّمَآءِ مِنْ اِلٰہٍ یَعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ تَعَالٰی اَعْظَمُ عِنْدَا للّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْ ھَوًی یَتَّبِعُ284

مصادر ومراجع:

1۔القرآن الکریم

معاجم:

۲۔جمال الدین محمد بن مکرم،ابن منظورالافریقی،**اللسان العرب**(بیروت: دارصادر،س ن)

۳۔راغب اصفھانی،،مترجم مولانا محمد عبدہ،مفردات القرآن (لاہور:اہل حدیث اکادمی،۱۹۷۱ء)

۴۔عبدالحفیظ بلیاوی،مولانا،مصباح اللغات (ملتان: مکتبہ امدادیہ،۱۹۵۰ء)

۵۔فیروزالدین،مولوی، فیروز اللغات اردو(لاہور: فیروزسنز،س ن)

۶۔کتابستان سٹینڈرڈ ڈکشنری (لاہور: کتابستان پبلشنگ کمپنی،۱۹۹۸ء)

۷۔لوئس معلوف،**المنجد**(کراچی: دارالاشاعت،س ن)

۸۔مرتضی حسن زبیدی،السید،الحسینی،تاج العروس من جواہر القاموس (کویت:مطبعۃ حکومت الکویت،۱۹۸۹ء)

تفاسیر:

۹۔احمد،ابوالکلام آزاد،ترجمان القرآن (لاہور:اسلامی اکادمی،۱۹۷۶ء)

۱۰۔اشرف علی تھانوی،مولانا،بیان القرآن (لاہور: مکتبہ رحمانیہ،س ن)

۱۱۔اسماعیل بن عمر،ابن کثیر،مترجم مولانا محمد جوناگڑھی،تفسیر القرآن العظیم (لاہور: مکتبہ قدوسیہ،۱۹۹۹ء)

۱۲۔امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن (لاہور،فاران فاؤنڈیشن،۱۹۸۵ء)

۱۳۔ثناءاللہ امرتسری،مولانا،تفسیر ثنائی (لاہور،مکتبہ قدوسیہ، ۲۰۰۲ء)

۱۴۔شبیر احمد عثمانی،علامہ،تفسیر عثمانی (لاہور، پاک قرآن پبلشرز،س ن)

۱۵۔عبدالرحمٰن کیلانی،مولانا،تیسیر القرآن (لاہور،مکتبۃ السلام،۱۴۳۲ھ)

۱۶۔عبدالقادر،مولانا شاہ،محدث دہلوی،موضح القرآن (لاہور: قدرت اللہ کمپنی،س ن)

۱۷۔عبدالماجد دریا آبادی،مولانا،تفسیر ماجدی (لاہور: پاک کمپنی،س ن)

۱۸۔عبدالقیوم مہاجر مدنی،گلدستہ تفاسیر (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،۱۴۲۳ھ)

۱۹۔غلام اللہ خان،شیخ القرآن مولانا،جواہر القرآن (راولپنڈی: کتب خانہ رشیدیہ،س ن)

۲۰۔غلام رسول سعیدی،تبیان القرآن (لاہور: فرید بک سٹال،۲۰۰۹ء)

۲۱۔محمد ثناءاللہ عثمانی مجددی پانی پتی،مولانا قاضی،مترجم سید عبدالدائم جلالی (کراچی: دارالاشاعت،۱۹۹۹ء)

۲۲۔محمد شفیع،مفتی،معارف القرآن (کراچی،ادارۃ المعارف،۱۹۷۹ء)

۲۳۔محمد ادریس کاندھلوی،شیخ التفسیر والحدیث مولانا،معارف القرآن (لاہور،مکتبہ عثمانیہ،۱۹۸۲ء)

۲۴۔محمد کرم شاہ الازہری،پیر،ضیاءالقرآن (لاہور: ضیاءالقرآن پبلیکیشنز،۱۴۰۲ھ)

۲۵۔محمد علی الصدیقی کاندھلوی،معالم القرآن (سیالکوٹ: ادارہ تعلیمات قرآن،۱۹۷۷ء)

۲۶۔محمد اکرم اعوان،مولانا،اکرم التفاسیر (لاہور: اویسیہ کتب خانہ،۲۰۱۳ء)

۲۷۔محمود الآلوسی بغدادی،السید،ابی الفضل شہاب الدین،روح المعانی (بیروت، لبنان: داراحیاءالتراث العربی،س ن)

۲۸۔مودودی،سید ابوالاعلی،تفہیم القرآن (لاہور،ادارہ ترجمان القرآن،۱۹۸۶ء)

قرآنیات:

۲۹۔حسن بلگرامی،سید،ڈاکٹر،فیوض القرآن (کراچی:ایچ ایم سعید کمپنی،۱۹۸۷ء)

۳۰۔زاہد ملک،مضامین قرآن (اسلام آباد:بن قطب انٹرنیشنل،س ن)

۳۱۔ساجد الرحمٰن صدیقی،صاحبزادہ ڈاکٹر،برصغیر میں مطالعہ قرآن (اسلام آباد:ادارہ تحقیقات اسلامی،۱۹۹۹ء)

۳۲۔صالحہ عبدالحکیم شرف الدین،قرآن حکیم کے اردو تراجم (کراچی،قدیمی کتب خانہ،۱۹۸۱ء)

۳۳۔محمد حبیب اللہ قاضی چترالی،ڈاکٹر محمد،برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ (کراچی،زم زم پبلشرز،۲۰۱۵ء)

کتب احادیث :

۳۴۔سلیمان بن اشعث سجستانی،ابوداؤد،سنن ابی داؤد (لاہور:نعمانی کتب خانہ،۱۹۸۶ء)

۳۵۔مالک بن انس،امام،مترجم علامہ وحید الزمان،المؤطا (لاہور:اسلامی اکادمی،۱۴۰۲ھ)

۳۶۔مسلم بن حجاج القشیری،مترجم علامہ وحید الزمان،الجامع الصحیح مع شرح نووی (لاہور:نعمانی کتب خانہ،۱۹۸۱ء)

۳۷۔محمد بن اسماعیل بخاری،مترجم سید عبدالدائم جلالی،الجامع الصحیح (لاہور،المکتبۃ العربیہ،۱۹۹۵ء)

۳۸۔محمد بن عیسی،ابوعیسی،الترمذی،مترجم مولانا حامد الرحمٰن صدیقی،جامع ترمذی (کراچی:ایچ ایم سعید،۱۹۶۷ء)

۳۹۔محمد بن یزید،ابن ماجہ،قزوینی،مترجم علامہ وحید الزمان،سنن ابن ماجہ (لاہور:اسلامی اکادمی،۱۹۹۰ء)

کتب سیرت :

۴۰۔خالد علوی،ڈاکٹر،انسان کامل (لاہو:رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۱ء)

۴۱۔شبلی نعمانی،علامہ،سید سلیمان ندوی،سیرۃ النبیؐ (لاہو:رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء)

۴۲۔محمد سلیمان سلمان منصور پوری،قاضی،رحمت للعالمین (لاہو:رالفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۱ء)

کتب اخلاق :

۴۳۔آر۔اے۔پی۔روجرس،مترجم مولوی احسان احمد،تاریخ اخلاقیات (کراچی،سٹی بک پوائنٹ،۲۰۰۶ء)

۴۴۔احمد جاوید،مرتب ڈاکٹر محمد امین،ترک رذائل (لاہور،تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ،۲۰۱۲ء)

۴۵۔اسرار احمد،ڈاکٹر،اسلام کا اخلاقی وروحانی نظام (کراچی،انجمن خدام القرآن،۲۰۱۰ء)

۴۶۔الھدی شعبہ تحقیق،حسن اخلاق (اسلام آباد،الھدی پبلیکیشنز)

۴۷۔بشیر احمد ڈار،حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق (لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۵۸ء)

۴۸۔رحمت اللہ سبحانی،علامہ مولانا،مخزن اخلاق (لاہور:ادارہ مطبوعات سلیمانی،س ن)

۴۹۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،مترجم مولانا عبدالحق حقانی،حجۃ اللہ البالغہ (کراچی،دارالاشاعت،س ن)

۵۰۔محمد بن محمد،ابوحامد،امام غزالی،مترجم مولانا محمد صدیق ہزاروی،احیاء العلوم (لاہور،پروگریسو بکس،۲۰۰۳ء)

۵۱۔محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی،مولانا،اخلاق وفلسفہ اخلاق (دہلی،ندوۃ المصنفین،۱۹۵۰ء)

۵۲۔محمد طاہر القادری،ڈاکٹر،حسن اخلاق (لاہور،منہاج القرآن پبلیکیشنز،۲۰۰۵ء)

۵۳۔محمد طیب،مولانا قاری،مہتمم دارالعلوم دیوبند،اسلام کا اخلاقی نظام (لاہور:ادارہ اسلامیات،۱۹۷۸ء)

۵۴۔محمد عظیم،فلسفہ اخلاقیات (لاہور،علمی کتب خانہ،۲۰۱۶ء)

متفرق کتب:

۵۵۔ابوالاعلی مودودی،مولانا سید،اسلامی نظام زندگی اوراس کے بنیادی تصورات (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز،۲۰۱۵ء)

۵۶۔اختر حسین عزمی، ڈاکٹر،مولانا امین احسن اصلاحی،حیات وافکار (لاہور:نشریات،۲۰۰۸ء)

۵۷۔امتیاز احمد، ڈاکٹر،مولانا مودودی کی نثر نگاری (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۲۰۰۷ء)

۵۸۔امین احسن اصلاحی،مولانا،مبادی تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء)

۵۹۔بختیار حسین صدیقی، اسلامی فلسفہ اخلاق (لاہور، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ،۱۹۷۲ء)

۶۰۔حسن ایوب،مترجم عبیداللہ فہد فلاحی، اسلام کی بنیادیں (لاہور، اسلامک پبلیکیشنز،۱۹۸۹ء)

۶۱۔خالد علوی، ڈاکٹر،سید مودودی بحیثیت مفسر (لاہور،الفیصل ناشران وتاجران کتب،س ن)

۶۲۔خضری بک،مترجم مولانا حبیب احمد ہاشمی،تاریخ فقہ اسلامی (کراچی، دارالاشاعت،۱۹۷۸ء)

۶۳۔سلیمان ندوی،سید،خطبات مدراس (لاہور: ادارہ مطبوعات طلبہ،۱۹۹۵ء)

۶۴۔شاہ ولی اللہ،حضرت علامہ،محدث دہلوی،شارح مفتی محمد امین،الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر (کراچی، دارالاشاعت،۲۰۰۷ء)

۶۵۔عبدالحمید خان عباسی، ڈاکٹر،علم تفسیر اوراس کا ارتقاء۔2 (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۳ء)

۶۶۔عبیداللہ فہد فلاحی،تاریخ دعوت وجہاد (لاہور: ادارہ معارف اسلامی،۲۰۰۰ء)

۶۷۔علی ندوی،مولانا سید ابوالحسن،مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش (کراچی: مجلس نشریات اسلام،۱۹۷۴ء)

۶۸۔غلام حیدر، پروفیسر ڈاکٹر مولانا،مشعل اسلامیات (میانوالی: اسلامی کتب خانہ،۱۹۹۸ء)

۶۹۔فیوض الرحمٰن، ڈاکٹر قاری،اسلام کا نظام حیات (لاہور: نعمانی کتب خانہ،۱۹۸۸ء)

۷۰۔محبوب رضوی،سید،تاریخ دارالعلوم دیوبند (لاہور: المیزان ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۵ء)

۷۱۔محمد احمد، پروفیسر مفتی،تعارف تہذیب مغرب وفلسفہ جدید (فیصل آباد، مکتبہ عارفی،۲۰۱۴ء)

۷۲۔محمد اشرف خرم،مغربی سیاسی افکار (کراچی، رہبر پبلشرز،۲۰۰۴ء)

۷۳۔محمد اقبال، ڈاکٹر علامہ،کلیات اقبال (لاہور،الفیصل ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۰ء)

۷۴۔محمد جنید، ڈاکٹر،تفہیم القرآن کی تشبیہات وتمثیلات (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز،۲۰۰۶ء)

۷۵۔محمد طاہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر، ایمان واسلام (لاہور: المطبعۃ العربیہ،۱۹۸۷ء)

۷۶۔محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز،۱۹۸۱ء)

۷۷۔محمد نواز چودھری،مطالعہ مذاہب عالم (لاہور: پولیمر پبلیکیشنز،۲۰۰۱ء)

۷۸۔نعیم احمد، ڈاکٹر،تاریخ فلسفہ یونان (لاہور،علمی کتاب خانہ،۲۰۰۱ء)

۷۹۔نعیم صدیقی، المودودی (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۶ء)

انسائیکلو پیڈیا:

۸۰۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور، پنجاب یونیورسٹی،۲۰۰۳ء)

۸۱۔www.britannica.com

۸۲۔www.theopedia.com

جرائد:

۸۳۔الاضواء،شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور(،جنوری، جون ۲۰۰۱ء)
۸۴۔جہات الاسلام، پنجاب یونیورسٹی لاہور(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۵ء)
۸۵۔خواتین میگزین لاہور(ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ،اگست ۲۰۱۵ء)
۸۶۔روزنامہ''دنیا'' سرگودھا(۱۵دسمبر ۲۰۱۵ء)
۸۷۔ترجمان القرآن لاہور(مارچ ۲۰۱۶ء)

ویب سائٹ:

library.islamweb.net-۸۸

سافٹ ویئر:

wordweb-۸۹